ہر گھر کی زینت
ماہنامہ
کراچی
دوشیزہ
AUGUST
2012
ید نمبر
PDFBOOKSFREE.PK
اس شمارے میں
☆ فرزانہ آغا، زمر نعیم اور ارم زہرا کے سلسلے وار ناول
☆ عید نمبر کے لیے عقیلہ حق، گل، سیمار رضا ردا،
شیما عبدالقیوم اور اصفا فیصل کی دلچسپ تحریریں
☆ رنگِ کائنات میں، علی زبیر کی خصوصی تحریر
☆ زین العابدین کے ساتھ سوال و جواب کا شوخ سلسلہ
خصوصی انعام کے ساتھ

آغازِ سفر

آباد رہیے	منزہ سہام	7
زادِ راہ	منورہ نوری خلیق	8
اپنی ڈائری سے باتیں......	منزہ سہام	10
نکتہ ءنظر	سید شاہد حسن	12
محفل	رخسانہ سہام مرزا	17

باتیں ملاقاتیں

مارننگ شوز......	امبرین اسحاق	35
س سے سوال	ذیشان فراز	38
منی اسکرین	م ش خ	42
میرے بچپن کی ایک عید	گل	44

سلسلہ ءخاص

تم میرے ساتھ رہو	ذُمر نعیم	46
چاند میرا منتظر	ارم زہرا	202

منی ناول

یاد کے پچھلے پہر	فرزانہ آغا	144

مکمل ناول

میں، محبت اور چاندرات	عقیلہ حق	68

ناولٹ

دیارِ وفا میں	نسرین نکہت سبزواری	116

رنگِ فسانہ

نُوری کا چاند	سیما رضا ردا	165
میری نظر کا چاند ہو تُم	شیما عبدالقیوم	176
یقین کا موسم	اصفا فیصل	189
پھر وہی عید	شوکت تھانوی	197

انتخابِ خاص

وحشی	؟	224

رنگِ کائنات

رنگِ کائنات	علی زبیر	232

دوشیزہ میگزین

دریچے	اسماء اعوان	238
نئے لہجے، نئی آوازیں	قارئین	242
یہ ہوئی نا بات	زین العابدین	244
آپ کے ستارے	مختار بانو طاہرہ	248
کچن کارنر	شزاء گیلانی	253
بیوٹی گائیڈ	شائستہ انور	257

پرل پبلی کیشنز کی جانب سے تمام اہلِ وطن کو

اور

عید الفطر

کی مبارک باد

آباد رہیے!

میرے تمام پڑھنے والوں کو ماہِ صیام مبارک ہو۔ جب تک یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا' رمضانِ کریم تقریباً گزر چکا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب نے خوب عبادت کی ہوگی' ڈھیروں نیکیاں بھی کمائی ہوں گی۔ ہم لوگ یقیناً بہت خوش نصیب ہیں جنہیں اِس سال رمضان نصیب ہوا۔ اللہ تمام مسلمانوں کو نیک ہدایت دے اور ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم سچ کے راستے کا انتخاب کریں۔ یہ راستہ طویل اور کٹھن ضرور ہے مگر اختتام پر منزل ہماری منتظر ہے..... خوش رنگ اور پُر کیف راستے پر چل کر جب طے ہے کہ کہیں نہیں پہنچنا تو پھر وقت کیوں ضائع کریں؟ زندگی کیوں برباد کریں؟ کچے رنگوں سے اپنے گھروں کو کیوں سجائیں؟ کمزور ٹہنیوں پر تو پرندے بھی گھونسلہ نہیں بناتے' ہم تو پھر اشرف المخلوقات ہیں۔ زمین پر اللہ کے نائب ہیں۔ آپ سب بھی میرے ساتھ اس دُعا میں شریک ہو جایئے، اے اللہ! ہمارے وطن کی' ہمارے ایمان کی حفاظت فرما اور ہمیں سیدھے' اچھے اور سچے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما، آمین۔ خوش رہیے' آباد رہیے اپنے تمام پیاروں کے ساتھ!!

منزہ سہام

آغازِ سفر

منورہ نوری خلیق

زادِ راہ

قبولیتِ دعا کی خصوصی گھڑی تو ہر شب آتی ہے لیکن شب قدر میں اس گھڑی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کی شان اور تاثیر ہی جدا ہوتی ہے۔ وہ گھڑی نامعلوم کون سی ہو اسی لیے نبی کریمؐ نے حضرت عائشہ کو ایک مختصر مگر بہت جامع دعا سکھائی تھی جو.....

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

شبِ قدر اور اعتکاف

''یہ وہ مبارک رات ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ یہ رات اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے اُس کام کے لحاظ سے جو اِس رات میں انجام پایا، اُن خزانوں کے لحاظ سے جو اِس رات میں تقسیم کیے جاتے ہیں اور حاصل کیے جاسکتے ہیں، ہزاروں مہینوں اور ہزاروں سالوں سے بہتر ہے۔ جو اِس رات میں قیام کرے، اُس کو سارے گناہوں کی طرح اِس رات میں بھی وہ گھڑی ہے جس میں دعائیں قبول کرلی جاتی ہیں اور دین و دنیا کی جو بھلائی مانگی جائے، وہ عطا کی جاتی ہے۔'' (مسلم..... حضرت جابرؓ)

''اگر آپ اِس رات کے خیر سے محروم رہیں تو اِس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہوسکتی۔'' (ابن ماجہ..... حضرت انس بن مالکؓ)

یہ رات کون سی رات ہے؟ یہ ہم کو یقینی طور پر نہیں بتایا گیا ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری عشرے کی کوئی طاق رات ہے، یعنی اکیسویں، تیسویں، پچیسویں، ستائیسویں یا انتیسویں۔ بعض احادیث میں کہا گیا ہے کہ یہ آخری عشرے کی کوئی ایک رات یا رمضان المبارک کی کوئی بھی رات ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ستائیسویں رات ہے اور اگر اس رات قیام اور عبادت کا اہتمام کرلیا جائے تو کافی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ اور صلحاء کی روایات سے ستائیسویں رات کی تائید ہوتی ہے لیکن میرے خیال میں اِس رات کا واضح تعین نہ کیے جانے میں ایک گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ہمیں یہ رات معلوم ہے اور یہ ستائیسویں رات ہے تو یہ حکمت ضائع ہوجاتی ہے۔

اِس کو پوشیدہ رکھنے کا راز یہ ہے کہ آپ اس کی جستجو اور تلاش میں سرگرداں رہیں، محنت کریں، اپنی آتشِ شوق کو جلتا رکھیں۔ آخری عشرے کی ہر طاق رات میں اِسے تلاش کریں۔ اس سے زیادہ ہمت ہو تو اس عشرے کی ہر رات میں اور اس سے بھی زیادہ ہمت ہو تو رمضان المبارک کی ہر رات میں۔ جو چیز اللہ تعالیٰ کو

سب سے زیادہ محبوب اور پیاری ہے، وہ یہ کہ بندہ اس کو خوش کرنے کے لیے اور اس کی رحمت اور انعامات کی طلب اور شوق میں ہر وقت ہمہ تن جستجو بنا رہے، مسلسل کوشش میں لگا رہے۔ کام سے زیادہ ارادہ اور مسلسل کوشش ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ اگر معلوم ہو کہ یہ رات کون سی ہے تو سعی و جہد کی جو کیفیت مطلوب ہے، وہ ہاتھ نہ آئے گی۔

اِس رات کے قیام میں سے وہ تمام خیر و برکت تو حاصل ہوگی ہی جو کسی بھی رات کے قیام سے حاصل ہوتی ہے لیکن ایک طرف تو اِس عام خیر و برکت میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے، دوسری طرف مزید خیر و برکت کے دروازے بھی کھول دیے جاتے ہیں۔ پورا رمضان المبارک ہماری امت پر اللہ تعالیٰ کی اِس خصوصی رحمت کا مظہر ہے کہ اُس نے ہمارے لیے کم وقت اور مختصر عمل میں وہ ثواب اور اجر رکھا ہے جو دوسری امتوں کو طویل مدت اور بہت عمل سے حاصل ہوتا تھا۔ ارشادِ نبویؐ کے مطابق ''اس کی مثال ایسی ہے کہ امتِ مسلمہ کو نمازِ عصر سے نمازِ مغرب تک محنت کر کے اس سے کہیں زیادہ مزدوری ملتی ہے جتنی یہودیوں کو فجر سے ظہر تک اور عیسائیوں کو ظہر سے مغرب تک کام کر کے ملی۔'' (بخاری..... حضرت عمرؓ)

شبِ قدر ہمارے رب کی اس خصوصی رحمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ چنانچہ آپ کمر کس لیجیے! کوشش کیجیے کہ کم سے کم آخری عشرے کی ہر طاق رات اللہ تعالیٰ کے حضور قیام و صلوٰۃ، تلاوت و ذکر اور دعا و استغفار میں گزاریں۔ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ سجدے میں پیشانی زمین پر ٹیک دیں۔ روئیں اور گڑگڑائیں۔ اپنے گناہوں سے استغفار اور توبہ کریں۔

قبولیتِ دعا کی خصوصی گھڑی تو ہر شب آتی ہے لیکن شبِ قدر میں اس گھڑی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کی شان اور تاثیر ہی جدا ہوتی ہے۔ وہ گھڑی نامعلوم کون سی ہو اسی لیے نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ایک مختصر مگر بہت جامع دعا سکھائی تھی جو اس رات میں آپ بھی کثرت سے مانگیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّی
یا غفورُ یا غفورُ یا غفورُ (احمد۔ ترمذی)

ترجمہ: ''میرے اللہ تعالیٰ! تو بہت معاف کرنے والا ہے۔ معاف کرنے کو محبوب رکھتا ہے۔ پس مجھے معاف کردے!''

اگر ہمت و حوصلہ ہو تو پھر آپ آخری عشرے میں اعتکاف بھی ضرور کریں۔ دس دن کا ممکن نہ ہو تو کم مدت کا سہی۔ اعتکاف، قلب و روح، مزاج و انداز اور فکر و عمل کو الٰہیت کے رنگ میں رنگنے اور ربانیت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اس طرح شبِ قدر کی جستجو کا کام بھی آسان ہوجاتا ہے۔ اعتکاف ہر شخص کے لیے تو ممکن نہیں لیکن اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ اس کو فرضِ کفایہ قرار دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ اعتکاف کیا ہے اور اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو رسول اللہ ﷺ اپنی کمر کس لیتے۔ راتوں کو جاگتے۔ اپنے گھر والوں کو جگاتے اور اتنی محنت کرتے جتنی کسی اور عشرے میں نہ کرتے۔ (بخاری۔ مسلم)

اعتکاف کی اصل روح یہ ہے کہ آپ کچھ مدت کے لیے دنیا کے ہر کام، مشغلے اور دلچسپی سے کٹ کے اپنے آپ کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کریں۔ اہل و عیال اور گھر بار چھوڑ کے اُس کے گھر میں گوشہ گیر ہو جائیں اور سارا وقت اُس کی یاد میں بسر کریں۔ اعتکاف کا حاصل یہ ہے کہ پوری زندگی ایسے سانچے میں ڈھل جائے کہ اللہ تعالیٰ کو اور اس کی بندگی کو ہر چیز پر فوقیت اور ترجیح حاصل ہو۔

یہ تو ممکن نہیں کہ آپ میں سے ہر شخص دس دن کا اعتکاف کرے لیکن ایک کام آپ آسانی سے کرسکتے ہیں جس سے آپ اپنی استطاعت کی حد تک اعتکاف کرکے زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرلیں۔ وہ یہ ہے کہ آپ جب بھی مسجد جائیں تو اعتکاف کی نیت کرلیں کہ جو وقت بھی میں یہاں گزاروں گا، وہ میں نے اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کردیا ہے۔

.....☆☆.....

اپنی ڈائری سے باتیں

پیارے ابو!

آداب!

خوش رہیے۔ میں بھی بہت خوش ہوں۔ میں سمجھتی تھی کہ آپ کے نام کو زندہ رکھنے کا سارا بوجھ صرف میرے کاندھوں پر ہے۔ میں آپ کی بیٹی نہیں، بیٹا ہوں۔ بلاوجہ اتنے عرصے پریشان رہی۔ یہ سارے معاملات تو اللہ تعالیٰ کے طے کرنے کے ہوتے ہیں۔ کب کس کو وہ آپ کا سہارا بنا دے، یہ صرف وہی پاک ذات ہی جانتی ہے۔ اصل طاقت کا سرچشمہ تو ربُ العزت ہے۔

ابو.....! آپ کے بچے بہت مطمئن اور خوش ہیں۔ اللہ سب کو اطمینان، سکون اور خوشیوں سے مالامال کردے۔ (آمین!)

آپ کی بیٹی

منزہ سہام مرزا

عالمی معیشت پر خواتین کا قبضہ

تحریر: سید شاہد حسن
(ایگزیکٹو ایڈیٹر، قومی اخبار میڈیا گروپ)

قارئین.....! ادارے کی ہمیشہ سے یہ روایت رہی ہے کہ آپ سب کی آگہی کے لیے ایسے افراد کو بھی دعوتِ قلم دی جائے جن کا مشاہدہ اور تجربہ آپ سب کے لیے راہنمائی کا باعث ہو۔ اس ماہ، نکتہ نظر کے سلسلے کے تحت ''عالمی معیشت پر خواتین کا قبضہ'' آپ سب خواتین و حضرات کی نذر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین، اس تعلیمی جہاد میں اپنی شرکت کا اظہار، اپنی آراء سے کریں گے۔ ہم منتظر ہیں۔

دنیا کے تمام معاشروں میں عورت اور مرد میں تفریق تقریباً ہر معاملے میں پائی جاتی ہے لیکن صحت، ملازمت اور خاص طور پر تعلیم ایسے معاملات ہیں جو قوم کی ترقی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تفریق اور تعصب دنیا کے امیر ترین، متوسط اور غریب تمام ممالک میں مختلف حیثیت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ عام توقع کے مطابق تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کی ملازمتوں میں عورتوں کا تناسب بڑھے مگر امیر اور ترقی یافتہ ممالک میں جہاں تعلیم تقریباً سو فیصد ہوتی ہے، ملازمتوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا حصہ چالیس فیصد سے بھی کم ہے جبکہ مسلمان ممالک کی خواتین تو آج بھی ان ترقی یافتہ معاشروں سے دو سو سال پیچھے ہیں۔ اس کے باوجود خواتین کی بڑھتی ہوئی فورس اور تعلیمی میدان میں ان کی کارکردگی کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اگر خواتین کی تعلیم و تربیت کے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں تو معاشی اور معاشرتی سطح پر اس کے براہِ راست اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں عورتوں کے معاشی کردار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں معاشی ترقی کا انحصار خواتین پر روز بروز بڑھ رہا ہے۔ حال ہی میں خواتین کی بڑھتی ہوئی معاشی طاقت پر امریکہ میں شائع ہونے والی کتاب "infinence" میں اہم انکشافات کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطابق امریکہ کے بینکوں میں 89 فیصد اکاؤنٹ خواتین کے ہیں۔ نجی املاک کی 51 فیصد ملکیت خواتین کے پاس ہے اور امریکی خواتین کی مجموعی قوتِ خرید پانچ ٹریلین ڈالر ہے، جو جاپان کی مجموعی معیشت سے زیادہ ہے۔ بین الاقوامی سطح پر خواتین خریدار کی حیثیت سے انسانی تاریخ کی سب سے بڑی مارکیٹ کے طور پر سامنے آ رہی ہیں جس کا مجموعی حجم بھارت اور چین کی مارکیٹ سے بڑا ہے۔ صارف کی حیثیت سے خواتین کی اہمیت کو نظر انداز کرنا اب ممکن نہیں رہا۔

صنعت و حرفت کے میدان میں خواتین کی شمولیت کا آغاز امریکہ میں ہوا۔ امریکہ اور یورپی ممالک میں صنعتی دور نے معاشرتی انقلاب کی بنیاد فراہم کی اور بڑی سماجی تبدیلیوں کی راہ ہموار کی۔ مغرب کے صنعتی دور کے بارے میں کوئی یکساں پالیسی نہیں اختیار کی جا سکتی کیونکہ تبدیلیاں بتدریج ہوئیں اور مغرب کے مختلف ممالک نے صنعتی عمل میں مختلف پالیسیاں اختیار کی تھیں۔ صنعتی

دور سے قبل ان ممالک میں یکساں طرزِ معاشرت نافذ تھا جو آہستہ آہستہ تبدیل ہوتا چلا گیا اور آج صنعت، سائنس و ٹیکنالوجی بامِ عروج پر ہے تو ان ممالک کے یکساں رویے اور پالیسیاں فروغ پا رہی ہیں۔ برطانیہ وہ پہلا ملک ہے جہاں صنعتی انقلاب آیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے ستر کی دہائی تک برطانوی معاشرے میں عورت کی حیثیت کا مطالعہ معروف مصنفہ این اوکلے (Ann Oakley) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (Socialogy of Housewife) ''جدید گھریلو عورت کی نفسیات'' میں کیا ہے۔ بقول این اوکلے برطانیہ کے ماقبل صنعتی معاشرے میں خاندان پیداوار کی بنیادی اکائی تھا۔ خاندان کے تمام افراد پیداواری سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ زراعت اور پارچہ بافی بنیادی معاشی سرگرمیاں تھیں، جن میں عورتیں اور مرد دونوں حصہ لیتے تھے۔ پارچہ بافی میں مرد کپڑا بنتا اور عورت دھاگہ تیار کرتی اور رنگتی تھی۔ زراعت میں مرد کھیتوں میں اور عورتیں گھریلو کام کاج کرتی تھیں۔ صنعتی انقلاب نے طریقہ پیداوار میں بنیادی تبدیلی متعارف کرائی۔ کارخانے لگے تو خاندان کے پیداواری اکائی کا تصور معدوم ہو گیا۔ اب کارخانہ پیداواری اکائی تھا، جس نے خاندان کی جگہ لے لی۔ این اوکلے اسے 1750ء سے 1841ء کا دور کہتی ہیں۔ ''اس دور میں عورتوں نے کپڑے کی فیکٹریوں میں کام شروع کیا۔ آغاز میں بچے بھی عورتوں کے ساتھ مزدوری کرتے تھے، تاہم 1819ء میں بچوں کی مزدوری پر پابندی لگا دی گئی۔ 1841ء کے بعد پہلی جنگِ عظیم 1914ء تک مرد مزدوروں اور معاشرتی اور سماج کے ٹھیکے داروں کے دباؤ پر صنعتوں میں عورتوں کی ملازمتیں محدود ہونا شروع ہو گئیں۔ کارخانوں کے مرد مزدور عورتوں کی ملازمت کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے اس لیے مزدوروں کی انجمنوں نے عورتوں کی ملازمتوں پر مکمل طور پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا، جس کے نتیجے میں 1842ء میں Mines Act کے تحت معدنیات کی کانوں میں عورتوں کی ملازمتوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مردوں نے عورتوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھا اور تمام معاشی، قانونی اور نظریاتی ہتھیار استعمال کیے تاکہ عورتوں کے مقابلے کو کم کیا جا سکے۔ کارخانوں میں عورتیں، مردوں کی نسبت زیادہ جفاکشی سے کام کرتیں۔ زیادہ پیداوار کے نتیجے میں وہ مردوں کی نسبت زیادہ اجرت لیتی تھیں۔ مردوں نے عورتوں کو ٹریڈ یونینوں سے خارج کیا۔ کارخانوں کے مالکان پر دباؤ ڈال کر عورتوں کو ملازمتیں دینے سے روکا۔ ایسے قوانین بنوائے جو شادی شدہ عورتوں کی ملازمتوں کو محدود کریں۔ عورتوں کے خلاف مہم چلائی کہ عورت گھر لوٹ جائے اور وہیں محدود رہے۔'' 1914ء سے 1950ء تک کا عرصہ عورت کی ملازمت کے سلسلے میں نئے رجحانات کا نقیب ہے۔ اس دور میں عورتوں کی ملازمتوں کے نئے مواقع پیدا ہوئے۔ کارخانوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے فرد کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا۔ اس دور میں عورتوں کو کئی قانونی اور سیاسی حقوق ملے۔ 1928ء میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق مل گیا۔ سابقہ دور میں جب عورتوں کو ملازمتوں سے نکال کر گھروں تک محدود کیا گیا اور عورت کا شادی پر انحصار بڑھ گیا تو عورت اپنے بچوں اور گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی میں پھنس گئی مگر ووٹ کا حق ملنے اور سیاسی و قانونی حقوق ملنے کے باوجود اس کے ماں اور خاندان کے مرکزی کردار کی ادائیگی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ صنعتی دور نے عورت کے کردار پر تین طرح کے اثرات مرتب کیے۔ 1- روزمرہ زندگی سے مرد کی کنارہ کشی۔ 2- عورتوں اور بچوں کا مردوں پر معاشی انحصار۔ 3- گھریلو کام اور بچوں کی نگہداشت کی دوسرے کاموں سے علیحدگی۔

عورت مزدوری بھی کرتی رہی اور گھریلو ذمہ داریاں بھی نبھاتی رہی۔ معاشی آسودگی کے تصور نے پورے خاندان کو کام کرنے پر مجبور کیا۔ عورت ملازمت کے باوجود مرد کی برابری کا درجہ حاصل نہ کر سکی۔ 1970ء میں برطانیہ میں Equal Pay Act منظور ہوا جس کے تحت عورتوں کی اجرت مردوں کے برابر کر دی گئی، تاہم یورپی یونین نے اس قانون میں 1982ء میں ترمیم کی اور ہر ملازمت میں عورت کی تنخواہ مردوں کی

تنخواہوں کے برابر تسلیم کر لی گئی۔ یہ بل 1984ء میں منظور کرلیا گیا۔ 1975ء میں Sex Discrimination منظور کرلیا گیا جس کے تحت ملازمتوں میں جنس کی بنیاد پر امتیاز کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اس قانون کی منظوری کے بعد برطانیہ اور یورپ میں عورتوں کو ملازمتوں کے مواقع میسر آنے لگے۔ صرف برطانیہ میں (1961-81) خواتین محنت کشوں کی تعداد دو لاکھ ستر ہزار سے تجاوز کر گئی جبکہ اس دوران کام کرنے والے مردوں کی تعداد میں دو لاکھ کی کمی آئی۔ 1993ء میں برطانیہ میں کام کرنے والی کل آبادی 44.43 فیصد عورتوں پر مشتمل تھا۔ (بحوالہ۔عورت کی معاشرتی حیثیت ایک تاریخی جائزہ۔ مصنف۔ڈاکٹر خالد علوی)

خواتین کو ملازمتوں اور معاشی سرگرمیوں میں اپنا حق منوانے کے لیے تقریباً ڈیڑھ سو سال طویل جدوجہد کرنا پڑی ورنہ قبل ازیں عورت کو کم اجرت ملتی تھی۔ ان کی ملازمتیں جز وقتی ہوتی تھیں۔ عورتوں کا تقرر نچلی سطح کی ملازمتوں پر کیا جاتا تھا۔ عورتوں کو مخصوص ملازمتیں دی جاتیں جو کم درجہ کی ہوتی تھیں مگر اب عورت نے بہتر تعلیم اور اعلیٰ صلاحیت کی بنیاد پر مردوں کے مضبوط حصاروں میں بھی اپنی حیثیت منوالی ہے۔ تمام ترقی یافتہ ممالک کی معاشی اور صنعتی سرگرمیوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورت نے Job Market پر قبضہ کرلیا ہے بلکہ مردوں کو بعض شعبوں میں پیچھے دھکیل دیا ہے، تاہم بہت سے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں عورت اب بھی غلاموں جیسی زندگی گزار رہی ہے، بالخصوص مسلم معاشروں میں عورت پر کنٹرول اسلامی سماج کا سب سے اہم ستون ہے۔ امام غزالیؒ اپنی کتاب ''احیائے علم و دین'' میں لکھتے ہیں۔ ''مجموعی طور پر ایک عورت کا مناسب طرزِ عمل مختصر یہ ہونا چاہیے کہ وہ زنان خانے تک محدود رہے، سینے پر دنے کے عمل سے غافل نہ ہو، بالکونی پر بار بار نہ جائے اور نہ ہی اسے گلی کی طرف تاکنے میں اپنا وقت ضائع کرنا چاہیے۔ وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ مختصر سی بات کر سکتی ہے مگر ان کے ہاں اسے نہیں جانا چاہیے۔ عورت کی خراب ترین خطا یہ ہے کہ وہ باتیں زیادہ کرے یعنی آئیڈیل عورت وہ ہے جو خاموش طبع، غیر متحرک اور اطاعت گزار ہو۔ جس سماج میں صنفِ نسواں پر کنٹرول کا یہ فلسفہ اپنایا جائے، وہاں سائنس و ٹیکنالوجی پر گرفت کا محض خواب ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

مغرب میں روشن خیالی کی تحریک کا آغاز پندرہویں صدی میں ہوا۔ قبل ازیں مغربی ممالک میں کلیسا کا فکر و نظر پر بہت گہرا اثر تھا۔ روشن خیالی کی تحریک کے نتیجے میں لوگوں نے سماج اور قانون پر وہ سوالات اٹھانے شروع کر دیے، جن پر وہ پہلے چرچ کے دیے ہوئے جوابات سے مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ اب لوگ کائنات اور انسانی زندگی کے بارے میں کلیسا کی ہر بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ جستجو کی ایک نئی لہر چل رہی تھی۔ مظاہرِ قدرت کو سمجھنے کی بنیاد عقیدے کی بجائے انسانی محسوسات، مشاہدات اور تجربات پر رکھی جانے لگی، جس کے نتیجے میں جدید سائنسی علوم نے جنم لیا۔ پرانے تصورات ٹوٹنے لگے۔ کائنات کی تشریح کرنے والے پرانے نظریات کا دیوالیہ پن ثابت ہو گیا۔ ایسے میں مغربی تہذیب نے ایک جست لگا کر صنعتی انقلاب برپا کر دیا۔ صدیوں پرانے انداز بدلے اور جمہوری طرزِ فکر کا آغاز ہوا اور آج دنیا بھر میں خواتین کے معاشی کردار اور اثر پذیری میں اضافہ ہو رہا ہے۔

پاکستان کی عورت رسوم و رواج کے بھاری بوجھ تلے سسک رہی ہے، ہر گزرتے دن کے ساتھ پاکستانی عورت کی زندگی پر چھائی ظلمت اور گہری ہوتی نظر آ رہی ہے۔ جاگیردارانہ اور قبائلی نظام، تعلیم کے لیے جامع پالیسیوں کی عدم موجودگی، ریاست کی عمل داری کی بجائے سیاسی مصلحت پسندی اور طولِ اقتدار کے لیے حق و ناحق کے پیمانوں کو پسِ پشت ڈال دینے کی روش نے اس ملک کے دیگر طبقات کی طرح خواتین کے شب و روز میں بھی تلخیاں بھر دی ہیں۔ خواتین کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کے خلاف غیر مؤثر ریاستی طرزِ عمل نے معاشرتی سطح پر اس کے خلاف مزاحمت کے اسباب ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مختلف مسائل اور عوامل کی وجہ سے معاشرے سے برداشت کے خاتمے

نے اس مسئلے کو مزید شدید کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں خواتین پر تشدد کی شرمناک مظاہر وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ کہیں خواتین کے تعلیمی اداروں کو بموں سے اڑایا جا رہا ہے، تو کہیں بیوہ بھابھی سے نکاح کرنے پر اس کے شوہر کو گاؤں بدر کر دیا جاتا ہے۔ کہیں بیٹی کی شکل پسند نہ آنے پر باپ زمانہ جاہلیت کی ترویج کرتے ہوئے ننھی سی جان کو زندہ دفن کر دیتا ہے تو کہیں دوشیزہ کے چہرے پر تیزاب انڈیل کر اس کی شکل بگاڑ دی جاتی ہے۔ جب مغربی دنیا کی عورت ہر میدان میں اپنا لوہا منوا رہی ہے تو ہمارے ملک، اسلامی جمہوریہ پاکستان کی عورت کے ساتھ امتیازی سلوک میں شدت کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ مسلم معاشروں کی تہذیب باہمی جبر اور زیادتیوں سے عبارت ہے۔ یہاں عورتوں کے اندر نہ احساس زیاں رہنے دیا اور نہ اپنے حقوق کا شعور۔

گزشتہ برس ایک برطانوی ادارے نے اپنے بین الاقوامی سروے میں یہ چشم کشا انکشاف کیا ہے کہ دنیا میں عورتوں کے لیے خطرناک ترین ممالک کی فہرست میں پاکستان تیسرے نمبر پر ہے۔ عورتوں کے خلاف حالات و واقعات کے تسلسل نے بین الاقوامی سروے کے نتائج کو درست ثابت کر دیا۔ عورتوں پر تشدد، غیرت کے نام پر عورتوں کا قتل، زبردستی کی شادیاں، مرد کے جرم کے بدلے میں نوعمر بچیوں کو غلامی میں دینا، جائیداد بچانے کے لیے قرآن مجید سے شادی، بیوہ کا حقِ وراثت سے محروم، ناک و چوٹی کاٹ کر عورت کو سبق سکھانا اور جرگوں میں عورتوں کی تذلیل کے فیصلے دینا، عورتوں کو سرِعام برہنہ کر کے رسوا کرنا، ونی، کاروکاری، وٹہ سٹہ اور اس قسم کی قبیح اور شرمناک رسومات ریاستی چہرے پر بدنما داغ ہے۔ دوسری جانب ''ورلڈ اکانامک فورم'' کی ایک رپورٹ کے مطابق 2024ء تک امریکہ اور یورپ میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کی آمدن زیادہ ہو گی۔ نئے کاروبار کا آغاز کرنے والوں میں خواتین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بڑھتی جا رہی ہے۔ آنے والی چند دہائیوں میں خواتین سرمایہ کاری کے ذریعے روزگار فراہم کرنے میں مردوں سے کہیں زیادہ آگے ہوں گی۔ 2005ء میں امریکہ میں نئے کاروبار کا آغاز کرنے والی کمپنیوں میں ہر تیسری کمپنی کسی خاتون کی ملکیت تھی اور خواتین کی زیرِ ملکیت کاروباری اداروں نے مردوں کے اداروں کے مقابلے میں دگنی ترقی کی۔ اس سے دنیا بھر کے ممالک کی خواتین کو عملی میدان میں آنے کا حوصلہ ملا۔ کاروباری سرگرمیوں نے نہ صرف خواتین کی شرکت بڑھ گئی بلکہ انہیں حاصل ہونے والی کامیابیوں اور ترقی نے دنیا کو حیران کر دیا۔ ترقی کا یہ سلسلہ ابھی تھما نہیں، اس کے ثمرات اب دوسرے ممالک پہنچنا شروع ہو گئے ہیں۔ خواتین کی عملی زندگی میں شرکت، ان کی تعلیم اور اس کے معاشی حالات پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لینے والے ادارے ''وومن لرننگ پارٹنر شپ'' کے مطابق یورپ اور امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی تعداد میں اضافے سے اس ملک کی تنخواہوں کی مد میں خرچ ہونے والی رقم بیس فیصد تک بڑھ جاتی ہے یعنی تعلیم میں اضافے کے ساتھ ہی وہاں ورک فورس بڑھ جاتی ہے جبکہ اس ملک میں نومولود بچوں کی شرح اموات میں دس فیصد کمی آ جاتی ہے۔ ان اعداد و شمار سے یہ بات با آسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ خواتین کو تعلیم و تربیت فراہم کرنے کی صورت میں معیشت، صحت اور تعلیم کے شعبوں پر براہِ راست مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اقوامِ عالم نے خواتین کی ملازمتوں کے یکساں مواقع فراہم کر کے اپنے معاشی مسائل سے نکلنے کی صلاحیت پیدا کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ آبادی کے کسی بھی باصلاحیت طبقے کو نظر انداز کر کے معاشی اور معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں۔

میں یہاں ایک بار پھر ''ورلڈ اکنامک فورم'' کے سروے کا حوالہ دوں گا جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں ملازمت پیشہ افراد میں صنفی اعتبار سے پایا جانے والا فرق ختم ہونے سے امریکہ کا جی ڈی پی 9 فیصد تک بڑھ گیا ہے۔ اسی طرح برازیل، روس، بھارت اور چین کے علاوہ N-11 ممالک (بنگلہ دیش، مصر، انڈونیشیا، ایران، میکسیکو، نائیجیریا، پاکستان، فلپائن، جنوبی کوریا، ترکی اور ویت نام) میں ملازمین میں صنفی فرق مٹا دینے سے ان

ممالک کی فی کس آمدنی 2020ء تک 14 فیصد اور 2030ء تک بیس فیصد تک بڑھائی جاسکتی ہے۔ اس وقت ترقی پذیر ممالک میں خواتین اپنی آمدنی کا 90 فیصد اور مرد اپنی آمدنی کا 40 فیصد تک اپنے خاندان پر خرچ کرتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ معاشی میدان میں خواتین کا بڑھتا ہوا کردار مختلف بڑی کمپنیوں کے مالکان کے شروع کیے گئے منصوبوں کا مرہونِ منت نہیں بلکہ یہ کامیابی ان معاشی حقائق کا نتیجہ ہے جو دنیا کی اہم معیشتوں میں خواتین کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو سمجھنے کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں۔ جنگ عظیم دوم میں خواتین پر آنے والی ذمہ داریوں نے انہیں عملی زندگی میں متحرک کیا اور ملازمت پیشہ خواتین میں 30 فیصد اضافہ ہوا۔ اگلے پندرہ برسوں میں کاروبار میں نت نئے رجحانات کسی بڑی تبدیلی کی راہ کھول دیں گے۔ ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ تبدیلیوں کا یہ سونامی کسی ایک تنظیم، ادارے یا قوم کی حد تک نہیں رکے گا بلکہ پوری دنیا اس کی زد میں ہے۔ یہاں میں امریکی جریدے ''ٹائم'' کا حوالہ دوں گا جس میں ایک رپورٹ میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ امریکہ اور یورپ کو ''مردانہ معاشی بحران'' کا سامنا ہے۔ بعض شواہد اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ آنے والے وقت میں اقوام کی معیشت کا انحصار مردوں سے زیادہ عورتوں پر ہوگا۔ ہر شعبۂ زندگی میں خواتین کی کارکردگی دیکھنے سے یہ بات یقینی طور پر تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ''آدھی دنیا، پوری دنیا'' کو بدل رہی ہے، ماہرینِ معیشت تو دنیا میں عورت راج قائم ہونے کا خدشہ ظاہر کررہے ہیں۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں خواتین کے بارے میں فرسودہ خیالات تبدیل ہورہے ہیں، تعلیم عام ہونے اور میڈیا کے طاقت ور کردار کی وجہ سے لوگوں کے خیالات میں تبدیلی آئی ہے اور خواتین کو کم تر سمجھنے کے تصور دم توڑ رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پاکستانی خواتین زندگی کے ہر شعبے میں کام کررہی ہیں، تاہم اس حوالے سے ابھی منزل بہت دور ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم اقتصادی طور پر ترقی یافتہ ہوجائیں، جدیدیت اور روشن خیالی کو فروغ دیں تو ہماری ثقافتی پسماندگی خود بخود دور ہوجائے گی۔ تمام تر حقیقتوں کے باوجود معاشی پسماندگی، ہماری ثقافتی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ معاشی ترقی ہوگی تو ہمارا دنیا اور زندگی کے بارے میں وژن وسیع ہوگا۔ ہمارا زندگی سے پیار بڑھے گا، تب ہمیں خوشیاں اچھی لگیں گی پھر ہم خوبصورتیوں کو تلاش کریں گے۔ روٹی اور بقا کے چکر میں مصروف لوگ حسن و عشق کے موضوع کو نہیں سمجھ سکتے۔ غربت کے لیے بہاریں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ غربت جہالت کی ماں ہے اور جہالت اندھیرے کو کہتے ہیں۔ جمالیات کا تعلق روشنیوں سے ہوتا ہے، رنگوں سے ہوتا ہے اور یہ عورت ہی ہے جس نے کائنات میں رنگ بھر دیے مگر آہستہ آہستہ سماج پہ مردوں نے قبضہ کرلیا اور ایسا سماج مردانہ آمریت کو فروغ دیتا ہے اور عورت کی حیثیت کو کم کرکے اسے ذاتی ملکیت میں بدل دیتا ہے۔ خواتین پر بے جا پابندیوں کے سبب معاشرے کی روحانی اور ذہنی ترقی رک جاتی ہے۔ بدقسمتی تو یہ ہے، پاکستان میں آج بھی سماج پر مردوں کا آمرانہ قبضہ ہے۔ مردوں کی حاکمیت کا نظام جدیدیت اور جمہوری طرزِ عمل کا دشمن ہے۔ اس نظام میں مردوں کو سخت جان، آزاد، خودمختار اور صاحبِ عقل سمجھا جاتا ہے جبکہ عورتوں کو جذباتی، تسلیم و رضا کا پیکر اور اطاعت پر مائل کہہ کر خواتین کی نفی کی جاتی ہے۔ ہم جیسے معاشروں میں جب تک عورت کو مکمل انسان یا نامکمل انسان سمجھا جاتا رہے گا، تب تک خواتین کے مساوی حقوق کا خواب پورا نہیں ہوسکتا۔ خواتین کے شعور کو بیدار کرنے کے لیے ادب ایک مؤثر ہتھیار ہے۔

میری گزارش ہے کہ خواتین لکھاری عورت کی عظمت کی تاریخ سے آگہی حاصل کریں اور اپنی تحریروں میں صنفی امتیاز کو موضوع بنائیں۔ افسانے، شاعری اور کہانیوں میں فرسودہ روایات کے خلاف علمِ بغاوت کا پرچار کریں جن کی وجہ سے عورتوں کے شب و روز میں تلخیاں بھر دی ہیں۔

نوٹ۔ ماہنامہ دوشیزہ کے ماہِ جولائی کے شمارے میں میرے مضمون کا عنوان سہواً ماہِ جون کے مضمون ''یہ تفریق و تعصب کیوں؟'' چھپ گیا ہے۔ جولائی کے مضمون کا عنوان ''عورت ایجادات کی ماں'' ہے۔ شکریہ۔☆☆

محبتوں کا طلسم کدہ، خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

دوشیزہ کے آنگن میں آنے والے سب ساتھیوں کو خوش آمدید۔ رمضان کا مبارک مہینہ ہے۔ اللہ سب کے دکھ درد اس مہینے کے صدقے میں دور کرے اور یقیناً وہ ضرور کرے گا۔ بس ہم اس کی مانیں مہنگائی، بجلی، پانی کا رونا بہت ہوچکا۔ زمینی خداؤں کو چھوڑ دیں، اصل کے آگے ہاتھ اٹھائیں۔ بس یہ ہی کہنا تھا اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔

✉ گل راولپنڈی سے۔ ''ڈیئر رخسانہ بھابی، السلام علیکم! دوشیزہ میں آپ کی واپسی ایک بہت ہی اچھا شگون ہے۔ بہت خوشی ہوئی۔ اللہ آپ کو صحت کے ساتھ لمبی عمر عطا کرے۔ گزشتہ کئی ماہ سے میری طبیعت انتہائی خراب چلی آرہی ہے۔ لکھنا پڑھنا بالکل رہ ہی گیا ہے۔ کئی کتابیں اور رسالے سرہانے پڑے ہیں۔ جب طبیعت ذرا بہتر ہوتی ہے تو تھوڑا تھوڑا پڑھتی ہوں۔ نگہت اعظمی کے ناول کا اختتام بہت خوب صورت تھا۔ میں نگہت کی تحریروں کی بہت بڑی فین ہوں۔ ان کی تحریریں، ان کی شخصیت کی طرح ہی سادہ اور پُرکار ہوتی ہیں۔ فرزانہ آغا کے ناول کی پہلی قسط گزشتہ ماہ آنکھوں میں عرقِ گلاب ڈال ڈال کر پڑھی۔ آغاز خوب صورت، انجام بھی اچھا ہو گا۔ اس ماہ صرف محفل پڑھی اور کاشی چوہان کا افسانہ ''سہارا''۔ کاشی بھیا مبارک ہو آپ تو بحری پر دوڑ رہے ہیں۔ شاعری میں بھی گہرائی آگئی ہے۔ شاعری میں نکھار تب ہی آتا ہے جب انسان دوسروں کے دکھ کو محسوس کرنا شروع کردے۔ لواحقین، نظم جس کو افسانے میں بھی کوٹ کیا گیا ہے، ایسی ہی نظم ہے اور اس افسانے میں کئی جملے اور لائنیں اتنی خوب صورت ہیں، جن کو رک کر دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنا اچھا لگا۔ کاشی بھیا شکریہ! آپ کے اصرار نے میرے قلم کا زنگ کچھ اتارا ہے۔ آخر کار بہت عرصے بعد ذہن میں کلبلاتی ایک کہانی کاغذ پر منتقل کرنے میں کامیابی ہوئی اور وہ نذرِ دوشیزہ کرچکی ہوں۔ ابھی عید کے حوالے سے اپنے بچپن کی ایک عید کا احوال بھی لکھ لیا ہے کیونکہ کاشی سے وعدہ کرچکی تھی حالانکہ آج کل میرے گھر میں کافی مشکلات ہیں۔ ملک صاحب، جنہوں نے زندگی بھر کبھی درد سر تک محسوس نہ کیا تھا، آج کل اچانک بیمار پڑ گئے ہیں اور اسپتال میں داخل ہیں، مختلف ٹیسٹ ہورہے ہیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ان کو صحتِ کاملہ عطا کرے۔ میری طرف سے ادارے کے تمام اراکین اور قارئین کی خدمت میں سلام اور دعائیں۔ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں۔ کوئی غلطی ہو تو معاف کردینا۔''

☆ گل! تمہارا محبت نامہ ملا۔ کاشی سے کیا ہوا وعدہ تم نے پورا کردیا، بس کاشی خوش۔ ملک صاحب کو اللہ صحت عطا کرے، اُن سے کہنا آپ کی ایک بہن کراچی سے دعا لے کر بذریعہ خط حاضر ہے۔ تم بھی اپنی صحت کا

خیال رکھو۔ تحریر نہ سہی، خط ضرور لکھو۔ یہ آدھی ملاقات جاری رہنا چاہیے۔ یہ حکم نہیں خواہش ہے۔

☒ سنبل کراچی سے۔ ”بہت پیاری رخسانہ آنٹی السلام علیکم! خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند سے نیک مطلوب ہے۔ میرا یہ آپ کو لکھا جانے والا پہلا خط ہے۔ کیونکہ میں نے، فریدہ مسرور جب ایڈیٹر تھیں یعنی 2002ء سے لکھنا شروع کیا، میرا فی الحال آخری خط بھی مارچ میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد اپریل کا شمارہ مل نہ سکا اور میری سب سے بری عادت یہی ہے کہ جب تک درمیان میں رہ جانے والا شمارہ نہ ملے، میں آگے والے نہیں پڑھتی۔ سو پہلے اپریل کا شمارہ حاصل کیا پھر سب پڑھے اب خط لکھ رہی ہوں۔ ویسے آپ سے نگہت اعظمی کی کتاب کی تقریب رونمائی میں ملاقات ہوئی تھی، اچھا لگا تھا۔ خصوصاً آپ کا محبت بھرا انداز۔ اب آتے ہیں پچھلے شماروں کی طرف۔ ارم تمہاری پھوپی کا بہت افسوس ہوا۔ خدا انہیں بلند مقام عطا فرمائے، آمین۔ نگہت کوئی بات نہیں، یہ سب پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے کہ ہمیں کہاں جانا، کہاں آنا ہے اور یار زندہ صحبت باقی۔ ویسے آپس کی بات ہے، ڈشز تینوں اور میٹھا...... سب کچھ آپ نے میری پسند کا بنایا تھا۔ زمر کا ناول بہت اچھا ہوتا جا رہا ہے۔ اور لکھیں فرزانہ اور اچھا نہ ہو، ناممکن اور جن تحریروں میں یادوں کی مہک ہو وہ تو اور بھی چاشنی لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ شاہد حسن کی تحریر بہت بہترین انداز میں دماغی گرہوں کو کھولنے کا باعث ہے۔ سلمیٰ یونس کا ناول اچھا رہا۔ انجام اچھا تھا۔ ہر اشک...... کا اختتام بہترین تھا۔ عارفہ کا فیصلہ بہترین تھا۔ جولائی کے شمارے کے مکمل ناول میں پہلے پیرے سے ہی پتا چل گیا تھا کہ چاہے آندھی آئے چاہے طوفان۔ چاہے کتنی ہی لاشیں گریں۔ مرکزی کرداروں نے ملنا ہی ہے۔ یار اس دور میں کہاں ہوتی ہیں ایسی محبتیں کہ پندرہ پندرہ سال بعد بھی ہیرو اسی طرح مچلے اور ہیروئن پندرہ سالہ شادی شدہ زندگی انتہائی نامساعد حالات میں گزار کر بھی گلاب کے پھول کی طرح شاداب رہے۔ کاشی کا افسانہ شروع سے ہی بہترین تھا اور رہتا اگر اس میں آخر میں اتفاق نہ ہوتا۔ کاشی اس اتفاق نے مزہ کرکرا کر دیا۔ مدیحہ کا افسانہ اچھا تھا۔ صائمہ حیدر کا بھی افسانہ اچھا تھا۔ روبینہ نے ڈائری کا فائدہ بتایا، مینا تاج کا افسانہ بہت اچھا تھا۔ ماں کے ساتھ اولاد کے رویے نے دل دکھی کر دیا۔ رنگِ فسانہ اور عالمی ادب سے انتخاب بہترین تھے۔ زین کے جوابات کھٹے میٹھے ہوتے ہیں۔ میری طرف سے تمام قارئین اور اہلِ وطن کو رمضان کا بابرکت مہینہ، اس کے تمام فیوض و برکات کے ساتھ مبارک ہو۔ اب اجازت دیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔“

☆ سنبل! اچھی رہو اور سب کے اچھا رہنے کی دعا کرتی رہو۔ میں جب خطوط کے جواب لکھتی ہوں تو خود کو تلاش کرتی ہوں اور پھر تم لوگوں کا پیار محبت یاد دلا دیتا ہے کہ ہاں میں پہلے بھی تھی اور آج تو پھر آج ہے، تم نے جو تبصرہ کیا ہے پرچے پر وہ سب سامنے حاضر ہے اور سنبل کے کہنے پر عمل ہوگا۔

☒ فرحت صدیقی، فیصل آباد سے۔ ”پیاری پیاری رخسانہ باجی، السلام علیکم! سب سے پہلے آپ کو، سب پڑھنے والوں کو رمضان المبارک کی بہت بہت مبارک ہو۔ برکتوں اور رحمتوں والے اس مہینے میں اللہ تعالیٰ سب کے لیے بہت ساری آسانیاں پیدا کریں۔ رمضان کے بعد عید کی بھی مبارک باد۔ اس مبارک مہینے میں اپنے دسترخوان کو سادہ بنائیے تاکہ رمضان کی رحمتوں سے دل بھر کر لطف اندوز ہوسکیں اور ان لوگوں کا ضرور خیال کیجیے، جو ضرورت مند ہیں، سفید پوش ہیں۔ ارد گرد اور اپنوں میں سے جو لوگ نظر آئیں، ان کے گھروں میں خاموشی سے راشن بھجوا دیجیے۔ سب سے بہتر صدقہ یہی ہے کہ کسی کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا دیجیے اور پھر زکوٰۃ میں بھی ان کا

حصہ ہے۔ منزہ سہام کا پہلا ادار یہ، زندگی کو جینے کا نیا انداز، زندگی جی گئے، 'زندگی بس گزر گئی'، بہت کچھ سمجھا گیا۔ اللہ تعالیٰ منزہ کو بہت حوصلہ اور ہمت دے گا، انشاء اللہ۔ وہ اپنے ابو کے نقشِ قدم پر بہت مضبوطی سے قدم جما کر دوشیزہ کا ساتھ دے رہی ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر منزہ سہام کے افسانوں کا مجموعہ ''کانچ کی عورت'' چھپنے کے بعد رجسٹری کروا دیجیے۔ ''دوشیزہ کی محفل'' اپنوں سے ملاقات کا بہانہ بہت اچھا لگا۔ نگہت اعظمی کو بہت مبارک۔ کتاب کی رونمائی کی تصاویر دیکھ کر ہم بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ قسط وار ناولوں پر تبصرہ تو ابھی نہیں ہو سکتا جب تک مکمل ناول سامنے نہیں آجائے گا کیونکہ یادداشت کا معاملہ ہے۔ اگلی قسط تک پچھلی قسط کا دھندلا سا خاکہ ہی رہ جاتا ہے دماغ میں۔ ناراض نہ ہونا عمر کا بھی کچھ کچھ تقاضا ہے۔ ''دھیرے سے بہار آئی'' کا انجام بھی اچھا تھا۔ بھلا اتنی بھی کیا بے خبری؟ ''جھوٹن'' پڑھ کر محسوس ہوا، عورت کے کردار کی گہرائی اور اس کی عظمت نا پنے والا آلہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔ ورنہ سامی جیسی باہمت اور بہادر لڑکیوں کا انجام ایسا نہ ہوتا۔ ''یاد کے پچھلے پہر'' آج سے پچاس سال پہلے کے دور میں لکھا ہوا ناول، میرے دل کے آس پاس سے ہو کر گزر رہا ہے۔ یہ باتیں، یہ راتیں تو ہمارے وقتوں کی ہے۔ ہمارے زمانے میں گورنمنٹ اسکول کی کچھ ٹیچرز ایسی ہی ہوتی تھیں، جن کو دیکھ کر یاد کیا ہوا سبق بھی بھول جاتا تھا۔ مزا آیا قسط پڑھ کر۔ کاشی چوہان کا افسانہ ''سہارا'' بہت خوب صورت تھا۔ کبھی کبھار کسی کی قسمت زِگ زیگ کی طرح ہوتی ہے۔ منزل پر پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ راؤ افضل علی شاہ کا ساتھ اس کے مقدر کا ستارہ ہی تھا، جو اس کے نصیب میں ایسے ہی چمکنا تھا۔ ''ادراک'' میں اپنے آپ کے لیے جینا بھی زندگی میں شامل ہوتا ہے۔ حنا کی پھیکی زندگی میں، اپنے آپ کو توجہ دے کر ہی قوس وقزح کے رنگ آسکتے تھے اور یہ ایک گھر کی مالکن کے لیے بہت ضروری ہے۔ رشتوں کا احساس اور ان کو نبھانا آسان نہیں۔ کچھ رشتے جیے جاتے ہیں اور کچھ نبھائے جاتے ہیں لیکن ماں کا رشتہ ایسا ہے جو بے لوث ہوتا ہے۔ افسانے کا انجام پڑھ کر دل آباد آنے کی نیت تو کریں۔ ہمارا دسترخوان (سندس کا) آپ کا شدت سے منتظر ہے۔ اس کو کھانے پکانے اور سب کو بلا کر کھلانے میں بہت مزا آتا ہے۔ اب اجازت۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ سب کو بہت بہت سلام اور رمضان المبارک کی پھر سے ڈھیر ساری مبارک باد۔''

☆ فرحت صدیقی! دعا کے ساتھ، یہ سنتا دل کو سکون دیتا ہے کہ ایک ہماری پیاری سی بہو کا دسترخوان ہمارا منتظر ہے۔ آئیں گے انشاء ضرور آئیں گے۔ منزہ کی کتاب ابھی چھپنے سے کچھ قدم دور ہے۔ حوصلہ اور ہمت وہ اپنے ابو کا ورثہ ہی اس میں لائی ہیں۔ بس دعا کرو قائم رہے اور منزل نصیب ہو۔ یقیناً نیکی کرنے کے لیے کوئی بینک لُوٹنا ضروری نہیں ہے۔ ایک اچھی بات بھی صدقہ ہے۔ ہم کسی کی ضرورت پوری نہیں کر سکتے، ایک مسکراہٹ دے دیں اور رب قبول کر لے تو اُس کا احسان ہوگا۔ محفل کی ملاقات بہت خوشیاں دیتی ہے۔ ہم تو بھول گئے تھے لیکن یہ حال تھا

اتنا تو مجھے یاد ہے کچھ اُس نے کہا تھا
کیا اُس نے کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں ہے

✉ شمیم ناز صدیقی، کراچی سے۔ ''ڈیئر رخسانہ آنٹی، عقیدت بھرا السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے

ہوں گی۔ ایک طویل عرصے بعد جب یہ پڑھا کہ رخسانہ سہام دوشیزہ کی محفل سنبھال رہی ہیں تو سچ جانیے دل کو بہت خوشی ہوئی اور سوچ لیا کہ بہت اچھا سا تبصرہ مئی کے دوشیزہ پر لکھ کر ارسال کریں گے۔ ہمارا اپریل کے شمارے کا خط، مئی میں لگا تھا محفل میں، ساتھ ہی ہم نے ایک ناولٹ 'سوچا نہ تھا' غزالہ رشید کو ارسال کیا تھا۔ بہر حال آنٹی رخسانہ پچھلے دو مہینے بڑی اذیت اور آزمائش میں ایسے گزرے کہ مئی اور جون کے شماروں پر کوئی تبصرہ، کوئی خط ہی نہ لکھ سکی۔ میرے میاں عثمان احمد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا جو ایک مہینے تک بستر پر رہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مسئلے تھے، میری آنکھوں میں انفیکشن ہو گیا اور ابھی بھی ہے۔ 14 جولائی کو دوشیزہ کے درشن ہوئے تو سوچا کل اتوار ہے اور پڑھ کر تبصرہ پوسٹ کروں گی۔ اتوار کا سارا دن اسی کوشش میں گزر گیا کہ لکھوں..... مگر جب شوگر 400 کے درجے پر ہوگی تو کہاں اور کیسے لکھا اور پڑھا جائے اور یہی کوفت طاری ہوگئی کہ شاید اس بار بھی ہم محفل سے غیر حاضر ہوں گے۔ مگر آج صبح اٹھے تو اپنے آپ کو کافی بہتر محسوس کیا۔ سو صبح نو بجے کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ اب آتے ہیں شمارے کی طرف۔ جولائی کا سرورق کوئی خاص نہیں لگا۔ فہرست پر ایک نظر ڈال کر اداریے کی طرف آگئے جو سچا اور کھرا تھا۔ انکل سہام مرزا کو گزرے ایک اور سال دبے پاؤں گزر گیا۔ منزہ کی ان سے بے مثال محبت کا اندازہ منزہ کی اپنی ڈائری سے باتیں پڑھ کر ہوتا ہے۔ منزہ کے افسانوں کا مجموعہ ''کانچ کی عورت'' کا شدت سے انتظار ہے۔ عنوان بہت خوب صورت ہے۔ دوشیزہ کی محفل میں پہنچے تو سلام اور خیر کی دعاؤں کے ساتھ آپ اپنے منفرد سے انداز میں پرخلوص اور پیاری لگیں۔ سب سے پہلے نگہت کا خط پڑھا جو بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں ایسی ہزاروں خوشیاں اور کامیابیاں نصیب کرے، آمین۔ آپ کو کتاب کی اشاعت اور رونمائی پر دل سے مبارک باد۔ نسیم نیازی کیسی ہو، تمہارا تبصرہ بھی بڑا زبردست، سچا اور کھرا ہوتا ہے اور ہاں نسیم نیازی تم نے خوب یاد دلایا۔ رخسانہ آنٹی کا وہ انداز مجھے بھی یاد ہے۔ ہر خط کے جواب میں کوئی دلچسپ واقعہ یا لطیفہ ہوتا تھا اور مزا آجاتا تھا مگر انفرادیت تو رخسانہ آنٹی آج بھی برقرار ہے کیونکہ آپ کے انداز میں کہ بہت پُرخلوص، میٹھا سا پیارا لہجہ۔ محفل میں سب نے خوب زبردست سے تبصرے کیے لیکن مجھے عقیلہ حق کا تبصرہ ہمیشہ بڑا دلچسپ سا لگتا ہے۔ آگے بڑھے تو ایک سنہری شام نگہت اعظمی کی کتاب ''آبگینے'' پر نظر ٹھہر گئی۔ تصویروں میں سب بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ اب چلتے ہیں افسانوں کی طرف۔ کاشی چوہان کا افسانہ سہارا حقیقت سے بہت قریب تر بہترین تحریر تھی۔ آج کے موجودہ حالات کے محور کے گرد گھومتی تحریر ''جھوٹن''، سنبل کا زبردست ناولٹ ثابت ہوا۔ ونڈرفل سنبل۔ مقابلہ ایوارڈ کا، سہارا اور جھوٹن کے درمیان ہے۔ دونوں میں سے ایک ضرور ایوارڈ کے حق دار ہوگا۔ ادراک مدیحہ عدنان کی مختصر مگر پُراثر تحریر ثابت ہوئی گو کہ موضوع پرانا تھا پھر بھی۔ صائمہ حیدر کا افسانہ آج کی عورت آج کے حالات میں لکھا ہوا، حقیقت سے قریب تر افسانہ تھا۔ روبینہ شاہین کا افسانہ تھینک یو ڈائری، ہلکا پھلکا افسانہ ثابت ہوا۔ مینا تاج کا افسانہ ''کھٹیا'' ایک پُراثر افسانہ ثابت ہوا۔ افسانوں سے گزر کر فرزانہ آغا کے ناول تک پہنچے، بہت خوب صورت عنوان ''رات کے پچھلے پہر'' کی دوسری قسط بھی زبردست رہی۔ فرزانہ نے ہمیشہ بہت منفرد اور منفرد عنوان کے ساتھ لکھا ہے۔ فرزانہ زبردست، ونڈرفل۔ آپ کا یہ ناول شاہکار ناول ثابت ہوگا۔ رخسانہ آنٹی! ہماری گل آپا کہاں ہیں، کیسی ہیں، ان کی کمی محسوس ہو رہی ہے اور ہاں سیما مناف شائستہ عزیز آپ بھی منظر پر نہیں آرہی ہیں۔ لگتا ہے ٹی وی میں بہت مصروف ہو گئی ہیں۔ فریدہ مسرور آپ کے بہنوئی کے انتقال کی خبر سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی بہن کو صبر جمیل عطا

فرمائے اور بہنوئی کی مغفرت فرمائے۔ باقی تمام مستقل سلسلے اپنی جگہ ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں۔ مکمل ناول اور سلسلے وار ناول نہیں پڑھ سکی کیونکہ آنکھ کی تکلیف نے مجبور کیا ہوا ہے، ورنہ جی تو چاہ رہا ہے کہ شمارے کا ایک ایک لفظ پڑھ ڈالوں۔ ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ بہت دنوں بلکہ عرصے بعد آپ سے مخاطب ہو کر دل کو بہت اچھا لگا، بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور تندرستی عطا کرے اور آپ ہمارے ساتھ اسی طرح ساتھ ساتھ رہیں، آمین۔ منزہ کو ہر ہر قدم پر بڑی بڑی کامیابیاں ملیں اور اپنے بیٹوں کی بہت ساری خوشیاں، کامیابیاں دیکھنا نصیب ہوں، آمین۔ آخر میں آمدِ رمضان شریف کی مبارک باد۔ آپ کو اور تمام رائٹرز، قارئین اور دوشیزہ کے اسٹاف کو۔"

☆ شمیم ناز صدیقی! عثمان احمد کے لیے دل سے دعا، اللہ سب بہتر کرے گا۔ تم بھی اپنا خیال رکھو۔ تمہاری خوشی ہماری خوشی بھی ہے۔ سب نے ہی مجھے بہت پیار سے اپنے درمیان کھڑا ہونے کی ہمت دی ہے۔ تم سب کی دعائیں ہیں کہ ہم نے پھر قلم اٹھانے کی کوشش کی ہے اور کتنا سفر ہم ساتھ کریں گے یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔

✉ روبینہ شاہین لکھتی ہیں۔ "محترمہ رخسانہ سہام مرزا، السلام علیکم! آپ سب کے لیے دُعاؤں کی سوغات اور محبتوں کے پھولوں کے ساتھ نیک خواہشات کے جگنو لیے حاضر ہوں۔ اس ماہ کا شمارہ پڑھا دل باغ باغ ہوا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں میری تحریر تھی بلکہ اس لیے کہ اس شمارے میں بہت کچھ، بہت زیادہ تھا۔ سب سے پہلے تو اداریے کی بات کرلیں۔ منزہ جی کا کمال یہ ہے کہ وہ اداریے میں قارئین سے مکالمہ کرتی ہیں اور دل کی آواز بن جاتی ہیں۔ زادِ راہ ہدایت وفلاح کی جانب اجالا بنا ہوا ہے۔ "اپنی ڈائری" ایک باپ سے بیٹی کے پیار کا اظہار ہے، جو ہمارے جذبوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ دوشیزہ کی محفل میں پیار کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں چاہتوں اور دُکھ سکھ بانٹنے کی روایت قائم ہے۔ میں طویل ناولٹ نہیں پڑھتی عام طور پر لیکن اس مرتبہ سنبل جی کا ناولٹ پڑھا جو کہ کچھ روایتی سا تھا لیکن انداز بیان اور اسلوب کی انفرادیت نے اسے منفرد بنا دیا۔ رنگِ فسانہ میں "ادراک" اچھی تحریر تھی جس میں ورکنگ وومن اور ہاؤس وائف کی دشواریوں اور خود فراموشی کا شکار عورتوں کو موضوع بنا کر انہیں متوجہ کیا گیا۔ آج کی عورت بھی عورت کو باہمت بنانے کی کاوش تھی۔ ایسی تحریروں کی ہمارے معاشرے کو ضرورت ہے۔ بینا تاج صاحبہ کی تحریر "کھٹیا" ایک پیاری سی حساسیت اور دل کو چھوتی ہوئی کہانی تھی، جس میں اپنوں کی تنگ دلی اور بے حسی کا قصہ تھا۔ اب بات ہو جائے "سہارا" کی۔ ہمارے ماحول میں بڑھتے ہوئے تشدد کے پس منظر میں تخلیق کی گئی یہ تحریر حقیقت کا بے رحم آئینہ تھی خاص طور پر اس تحریر میں شامل نظم مصنف کی حساسیت کا شاہکار ہے۔ خدا کرے مصنف کے قلم کی روانی، تخیل کی پرواز اور طبیعت کی جولانی یوں ہی مہمیز رہے، آمین۔ دوشیزہ میگزین کے تمام سلسلے خوب صورت اور دلچسپ ہیں۔ ہاں ایک بات اور..... انتخاب خاص میں "سہرا" اچھوتی سی تحریر تھی۔ ماں اور بیٹے کی وابستگی کو شادی کے رشتے کے بعد کیسے پیار بھرے انداز میں بیٹے نے نبھایا ہے۔ جوڑا واقعی یہ مصنفہ کی خوب صورت تحریر ہے۔ اب اجازت، سب کے لیے دعائیں۔"

☆ روبینہ شاہین! تمہارا تفصیلی خط پڑھ کر اطمینان ہوا، شکریہ۔ یہ سچ ہے سب اچھا نہیں ہوتا۔ اچھا لکھنے کے لیے ناول نگار اور افسانہ لکھنے والے اپنی پوری کوشش کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کی مدد کے طلب گار رہتے ہیں۔ یہ رشتہ جتنا مضبوط ہوگا، راستہ اتنا ہی آسان ہوگا۔ میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ مضبوط عورت، گھر اور ملک کی ضرورت ہے۔

✉ غزالہ عزیز کراچی سے۔ ''محترمہ رخسانہ آنٹی، السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیر و عافیت سے ہوں گے۔ صحت و سلامتی اور بہت سی خوشیوں کی دعاؤں کے ساتھ پہلی بار آپ سے بات ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے غزالہ آپی سے فون اور خط کے توسط سے بات ہوتی رہی ہے۔ سب سے پہلے منزہ آپی اور اُن کی فیملی کو عمرے کی سعادت کی دلی مبارک باد پیشِ خدمت ہے۔ دیر سے اس لیے کہ میں فون پر مبارک باد دینا چاہتی تھی مگر بارہا کوشش کے باوجود فون پر منزہ آپی سے بات نہیں ہو سکی، جس کا مجھے افسوس ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''فلک ٹائمز'' کے اجراء پر آپ کو اور منزہ آپی کے ساتھ ساری ٹیم کو دلی مبارک باد۔ خدا سے دعا ہے کہ پرل پبلی کیشنز اور اس کے توسط سے علم و ادب کی ترویج و اشاعت کے تمام سلسلے دن دگنی، رات چوگنی ترقی و کامیابی پائیں۔ آپ کی اور منزہ آپی کے ساتھ غزالہ رشید، ناصر بھائی، کاشی کی طرف سے اپنے افسانے ''سمجھوتے زندگی کے'' کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ آپ سب کی حوصلہ افزائی، مزید بہتر سیکھنے و لکھنے کی تحریک دے گی۔ ان تمام ساتھی و سینئرز رائٹرز نسیم نیازی، عقیلہ حق، شگفتہ شفیق، روبینہ شاہین، فرحت جمال اور یاسر دلاور کا بہت شکریہ جنہوں نے تحریر کے بارے میں اپنی رائے دی۔ آئندہ بھی آپ سب کی حوصلہ افزائی درکار رہے گی۔ ایک بار پھر آپ سب کا بہت شکریہ۔ امید ہے آپ سب کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی آئندہ بھی حاصل رہے گی۔ جلد ہی کوئی اچھی تحریر بھیجنے کی کوشش کروں گی۔ آج کل ایکسپریس انٹرٹینمنٹ سے میرا ڈرامہ سیریل ''بات ہے رسوائی کی'' آن ایئر ہے۔ جلد ہی دوسرا ڈرامہ سیریل ''باندی'' بھی آن ایئر ہونے والا ہے۔ آپ سب کے فیڈ بیک اور حوصلہ افزائی درکار رہے گی۔ چونکہ دوشیزہ لیٹ ملا ہے۔ اس لیے جولائی کے شمارے پر تبصرہ مختصر ہے۔ کاشی چوہان، مدیحہ عدنان، صائمہ حیدر اور روبینہ شاہین کی تحریریں اچھی تھیں۔ سنبل کا ناولٹ ''جھوٹن'' اچھی کاوش تھا۔ دوشیزہ میں اب جو کچھ نئے سلسلے شروع کیے گئے ہیں، وہ بہت اچھے ہیں۔ منزہ آپی کے ''اداریے'' اور ''اپنی ڈائری سے باتیں'' خوب رہے۔ دوشیزہ کی محفل، آپ کے محبت بھرے جوابات اور خلوص کی چاشنی سے لبریز اپنائیت بھرا انداز دل کو بھاتا ہے۔ خدا کرے یہ محبت و خلوص سدا قائم و دائم رہے۔ دوشیزہ کی محفل یوں ہی آباد رہے، آمین۔ مختصر تبصرے کے لیے معذرت قبول فرمائیں۔ پورا شمارہ نہیں پڑھ سکی۔ ایک بار پھر آپ سب کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی کا بہت شکریہ، سب کو سلام اور پُرخلوص دعائیں۔''

☆ غزالہ عزیز! خوش رہو اور دوشیزہ کے آنگن میں سب کے درمیان رہو۔ غزالہ ہمارے پاس محبت کے سوا بچا کیا ہے۔ اس سرمائے سے اگر ہمیں دعائیں مل جاتی ہیں تو اللہ کرے یہ سرمایہ کبھی ختم نہ ہو۔ غزالہ دعا چاہیے ہمیں بھی، تمہیں بھی اور اُن کو بھی جو دور ہو گئے ہیں۔

✉ رضوانہ کوثر، لاہور سے۔ ''عزیز ترین رخسانہ باجی! اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت اور خوش رکھے، آمین۔ جولائی کا دوشیزہ ملا۔ سرورق دل آنکھوں دونوں کو بھایا اور دیکھ کر ''اماں اور گلنار'' کی یاد آئی اور ساتھ ہی شائستہ عزیز کو شدت سے یاد کیا۔ اشتہارات کی پگڈنڈی سے ہوتے سہام بھائی کے لیے دعا گو ہوئے۔ منزہ کا پہلا اداریہ اچھا لگا۔ سہام بھائی کے ساتھ ساتھ اُس وقت دفتر آنے پر رعنا فاروقی سے میری ایک طویل ملاقات ہوئی تھی۔ ''زاویہ'' سے مستفید ہوئے۔ منزہ کی ابو سے باتیں، محبت کا اپنا انداز ہے۔ ''کانچ کی عورت'' کا انتظار ہے۔ محبت بھری مبارک باد کے ساتھ۔ مشاہدے اور تجربے سے کشید کی گئی سید شاہد حسن کی تحریر بے مثال ہے۔ دوشیزہ کے آنگن میں سجی محفل عروج پر ہے۔ نگہت اعظمی اس پُروقار تقریب اور آنگنے چمکنے پر بہت مبارک ہو۔

کراچی ہوتے تو ہم بھی مزے لوٹتے سب کے ساتھ بہر حال چمک تو ہم تک پہنچ گئی اور تقریب کی تصاویر نے مزہ دوبالا کر دیا۔ خوشگوار موڈ میں سب بہت اچھے لگے۔ نیلم الماس، محفل میں خوش آمدید۔ اگلے قدم پر ''عینی کی آئے گی بارات'' ردا ناصر بہت خوب۔ علی خٹک، اے آر وائی کے نئے ڈراموں کا تعارف۔ ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ سے ملاقات اور اس کی خوب صورت تصاویر۔ سب بہت اچھا لگا۔ عزیہ عزیز کو ایوارڈ مبارک۔ پیاری شگفتہ شفیق اور سنبل کو سالگرہ مبارک۔ سلامت رہو شگفتہ، زندگی، صحت اور سکون کے ساتھ۔ سلسلے وار ناول مکمل دلچسپی لیے ہوئے رواں ہیں جانب منزل۔ فرزانہ آغا خوب آئیں اور چھا گئیں۔ دونوں اقساط شاندار۔ مجھے فرزانہ آغا کا انداز تحریر بہت پسند ہے۔ نازنین رضا کی تحریر بھی انجام بخیر لیے اچھی رہی۔ سنبل کی ''جھوٹن'' نے بھی دل پر اثر کیا، مرد کی فطرت کے پرت کھولتے ہوئے۔ کاشی چوہان نے بڑے حساس موضوع کو مضبوط سہارا دیا۔ مدیحہ عدنان کا ادراک، بیویوں کو ادراک دے گیا۔ صائمہ حیدر کی ''آج کی عورت'' نے اپنی شناخت پالی۔ روبینہ شاہین نے بھی اچھا لکھا۔ مینا تاج تمہاری تحریروں میں بڑا وزن ہے تم بہت اچھا لکھتی ہو ''کھٹیا'' اسی کی مثال ہے۔ ''سہرا'' واقعی لاجواب انتخاب تھا۔ رنگِ کائنات کے رنگ گہرے چڑھے۔ دریچے سے آتی خوشگوار ہواؤں نے من معطر کیا۔ شاعری نے خوب رنگ جمایا۔ سائرہ غلام نبی، شگفتہ شفیق، عائشہ بیگ، نسیم نیازی، نقاش کاظمی یعنی سب نے خوب شاعری کی مگر گل کی غزل کا ہر شعر سیدھا میرے دل میں اترا، ویل ڈن۔ ''ستارے کیا کہتے ہیں'' بہت دلچسپ اور معلوماتی سلسلہ ہے۔ اگلے ماہ اپنے بارے میں پڑھیں گے، انشاء اللہ۔ ''کچن کارنر'' بہو بیٹیوں کے لیے ہے، ہم تو اب اس شعبے کے صرف ہدایت کار ہیں۔ ویسے اس دفعہ کی ڈشز خوب رہیں۔ ''بیوٹی گائیڈ'' بھی مفید سلسلہ ہے۔ گویا کہ ہماری دوشیزہ بامِ عروج پر ہے اس ماہ پیغام خصوصی! سب کو رمضان اور عید کی بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ پیارے پاکستان اور ہر پاکستانی کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ اب اجازت۔ یار زندہ صحبت باقی۔ عید کے بعد ملاقات ہوگی، انشاء اللہ بشرطِ زندگی۔

☆ رضوانہ کوثر! تم اتنا اچھا لکھتی ہو، تمہارا خط بار بار پڑھا۔ عزیز پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ترین؟ خیر چھوڑو، ہاں سہام کو دعائیں چاہئیں اور وہ ان کو مل رہی ہیں، اپنے پیاروں سے۔ جب کوئی یہ کہتا ہے یا لکھتا ہے لفظ ''دعا'' تو میرا دل بڑا پُرسکون ہو جاتا ہے۔ سہام، ہم اور آپ کو یاد کرنے والے یہ یہی کر سکتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

✉ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ''السلام علیکم! جولائی کا دوشیزہ ملا۔ ٹائیٹل ہمیں پسند نہیں آیا۔ پچھلے ماہ میں تبصرہ نہیں کر سکی مگر میگزین سارا پڑھ لیا تھا۔ افسانے اور ناول ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ بہت ہی مزا آیا۔ پڑھ کر ایسا لگا جیسے دوشیزہ کی تحریروں کا پہلے جیسا معیار ہو گیا ہے۔ اس مرتبہ بھی تمام ناول اور افسانے بے حد اچھے لگے۔ ان میں تھینک یو ڈائری، آج کی عورت، کھٹیا تو بے حد بہترین تحریریں لگیں۔ سہرا، جھوٹن بھی بے حد اچھا ناول تھے۔ ہم کاشی چوہان سے ناراض ہیں۔ ہم نے ان کی شاعری کی بک منگوائی تھی جو انہوں نے ہمیں نہیں بھجوائی۔ ہم نے انہیں اپنا ایڈریس بھی بھیجا تھا۔ اس کے باوجود ان کا افسانہ سہارا بہترین تحریر تھی۔ ہمارا شاعری کا مجموعہ ''پانچواں موسم'' بھی شائع ہو گیا ہے جسے ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اپنی ایک نظم بھیج رہی ہوں تمام قارئین رائٹرز کو دعا اور سلام۔''

☆ فریدہ جاوید! تم کو تحریریں پسند آئیں، اچھا ہوا۔ آئندہ بھی پڑھتی رہنا اور ہماری مدد کرنا کہ کیا اچھا لگا اور

کیا برا۔

✉ شمیا عبدالقیوم کراچی سے۔ ''ڈیئر رخسانہ آنٹی! امید ہے ٹھیک ہوں گی۔ مجھ سے ملاقات نہ جانے آپ کو یاد بھی ہوگی کہ نہیں۔ قصہ مختصر کہ کافی کام چور لڑکی ہوں وہ تو بھلا ہو غزالہ بجوا اور اب کاشی کا کہ مجھے دور جانے نہیں دیتے۔ سب سے پہلے تو سب کو میری طرف سے رمضان اور پیشگی عید مبارک۔ کافی عرصہ بعد دوشیزہ کی محفل میں شامل ہوئی ہوں۔ وجہ وہی زندگانی کی مصروفیات ہیں جو خود میں الجھائے رکھتی ہیں۔ ہمیشہ لکھنے کا سوچتی ہوں اور کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آجاتی ہے۔ جولائی کا دوشیزہ ہاتھ آیا اور خط لکھنے کا آغاز کر دیا۔ اس ماہ کے رسالے کی سب سے اہم بات جس نے مجھے شاملِ محفل ہونے پر مجبور کیا، وہ ہے بہت پیاری سی فرزانہ آنٹی کا ناول ''یاد کے پچھلے پہر'' اسے پڑھا تو لگا کہ کچھ نہ لکھنا زیادتی ہوگی۔ فرزانہ آنٹی، آپ کے الفاظ کا چناؤ اور منظر نگاری..... اُف کیا کہوں، یوں لگا کہ سارے کردار آگے پیچھے گھوم رہے ہوں۔ سچ کہوں تو آپ کے اس ناول نے مجھے پھر سے دوشیزہ سے جوڑ دیا ہے اور آپ نے میرا نام اس ناول میں شامل کیا۔ اچھا لگا یہ دوسری تحریر ہے، جس میں میرا نام شامل ہوا۔ کافی الگ نام ہونے کا اعزاز حاصل ہے مجھے۔ منزہ آپی نے اداریے میں کوئی لمبی چوڑی فلسفیانہ بات نہیں کی مگر اُن کی سادہ سی بات بھی بہت گہرائی لیے ہوا کرتی ہے۔ منورہ آنٹی کا ''زادِ راہ'' پرچے کی جان ہے۔ عادت سی ہے اس کو پڑھنے کی، ورنہ ادھورا پن محسوس ہوتا ہے۔ منزہ آپی کو ردا کی شادی مبارک۔ نازنین رضا کی تحریر ناول کی صورت میں ''دھیرے سے بہار آئی'' قسمت اور محبت سے جڑی کتھا تھی، جس میں قسمت کو محبت نے ہرا دیا یا محبت کو قسمت نے جتا دیا۔ اچھی تحریر لگی، محبتوں پر لکھی گئی تحریریں ہمیشہ ہی مجھے متاثر کرتی ہیں۔ سنبل ایک بہت اچھی اور سینئر رائٹر ہیں، ان کی تحریر ''جھوٹن'' مرد کی فطرت کو ظاہر کرتی نظر آئی مگر عورت کی اَنا پر ضرب پڑے تو وہ پتھر سے زیادہ سخت ہو جایا کرتی ہے اور ایسا ہی کچھ سامی کے ساتھ ہوا۔ عورت تو واقعی ایک پہیلی ہے، خود میں الجھی ہوئی۔ جسے جاننا اور بوجھنا اتنا آسان کام نہیں۔ کاشی چوہان کا افسانہ ''سہارا'' پڑھا۔ عورت تو ہمیشہ سہاروں پر چلا کرتی ہے۔ کاشی کی تحریر کا خاصہ اس کے جملے ہوا کرتے ہیں اور نظم نے تو مجھے رُلا ہی دیا۔ کاشی ایک بات کہ ہم لوگ پہلے ہی یہ سب دیکھتے اور سنتے ہیں تم نے اِسے تحریر کر کے ظلم کیا۔ کبھی کبھی آنکھیں بند کر کے سب اچھا ہے کہنا، بہت اچھا لگتا ہے۔ علینہ کی قسمت راؤ افضل سے جڑی تھی سو تکلیفیں سہہ کر وہ اس تک پہنچ ہی گئی۔ مدیحہ عدنان غالباً نیا اضافہ ہیں۔ ''ادراک'' کی صورت ایک حقیقت پڑھنے کو ملی۔ مدیحہ کی اچھی تحریر تھی، عورت کو اپنا آپ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ خود کو مٹا کر کچھ حاصل نہیں ہوا کرتا۔ صائمہ حیدر کی ''آج کی عورت'' بھی خوب رہی۔ وہی بات کہ انسان اگر کرنا چاہے تو پہاڑوں کو زیر کر لے۔ عورت کی زندگی صرف مرد اور گھر داری ہی کے گرد نہیں گھومنا چاہیے۔ روبینہ شاہین کی تحریر ''تھینک یو ڈائری'' ہلکی پھلکی سی تحریر تھی مگر یہ پتا نہیں چلا کہ نازش نے ارمغان کی ڈائری میں کیا پڑھا؟ یہ تشنگی رہ گئی۔ مینا تاج تو جو بھی لکھتی ہیں بہت خوب لکھتی ہیں ''کھٹیا'' عورت کی مجبوری بیان کرتی تحریر تھی جو خوب رہی۔ انتخاب خاص میں ''سہرا'' ماں اور بیٹے کے حساس رشتے پر لکھی گئی تحریر تھی اور بہت بہترین تھی۔ باقی سلسلہ وار ناول ابھی پڑھے نہیں تو کوئی تبصرہ نہیں کر پاؤں گی۔ البتہ شگفتہ شفیق کی شاعری، سائرہ غلام نبی کی نظم، ایڈیسن ادریس کی گزارش بہت خوب رہیں۔ بس اب خط کا اختتام کرنا چاہوں گی، اس امید کے ساتھ کہ یہ ماہِ رمضان ہمارے پاکستان پر سلامتی لائے اور عید ہم سب کے لیے واقعی ایک ایسا تہوار ہو، جس میں ہر پاکستانی کا دل ایک دوسرے سے جڑا ہو۔

☆ شیما! تم نے ہم کو یاد کیا، اچھا لگا۔ تم نے کسی گئے وقتوں کی ملاقات کا ذکر کیا ہے، ضرور ملے ہوں گے۔ ہم تو اب یادوں کے جنگل میں بس رہے ہیں۔ تم نے سچ کہا عورت کا کام صرف چند شعبوں تک محدود نہیں رہنا چاہیے اور نہ وہ رہتی ہے بلکہ وہ سب کچھ کرتی ہے، اب نظر نہ آئے تو ہم کیا کریں۔ تمہارا تبصرہ بڑا مکمل ہے، اسی طرح ہمیں یاد کرتی رہنا۔

✉ نزہت جبیں ضیاء کراچی سے۔ ''بہت پیاری رخسانہ باجی، السلام علیکم! امید ہے فیملی اور اسٹاف کے ساتھ بخیریت ہوں گی انشاء اللہ۔ جولائی کا دوشیزہ لیا، پڑھا اور اب تبصرہ کر رہی ہوں۔ سب سے پہلے آپ سے دلی معذرت کہ بہت دیر سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ افسانوں کی اشاعت پر تہہ دل سے شکریہ..... کچھ ذاتی مصروفیت کی بنا پر گزشتہ چند ماہ سے دوشیزہ میں خط وغیرہ نہیں لکھ سکی لیکن انشاء اللہ اب یہ کوتاہی نہیں ہوگی۔ منزہ سہام! افسانوں کے مجموعے کی متوقع آمد پر بہت محبتوں کے ساتھ مبارک باد قبول کرو۔ اداریہ اچھا لگا۔ ''زادِ راہ'' منورہ نوری خلیق صاحبہ کی خوب صورت تحریر دل میں اتر گئی۔ ''نکتہ نظر'' ایک لمحہ فکریہ کی صورت سامنے آیا۔ بہت اچھا رہا۔ ''دوشیزہ کی محفل'' میں پہنچے۔ آپ کی بات دل کو لگی، واقعی جو حالات ہیں، ان پر بحث کرنا فضول ہے۔ جو ہے، جیسا ہے کی بنیاد پر جیو بس..... صبر ہر حال میں ضروری ہے۔ سب سے پہلے عقیلہ حق، شگفتہ شفیق، روبینہ شاہین، صائمہ حیدر، یاسر دلاور خان آپ تمام کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ میرے افسانے کو تعریفی سند سے نوازا۔ آئندہ بھی آپ تمام کی آراء کی منتظر رہوں گی۔ رنگِ فسانہ میں شامل تمام افسانے اچھے لگے۔ روبینہ شاہین کا افسانہ ''تھینک یو ڈائری'' الگ سا لگا۔ واقعی بعض اوقات ہم انجانے میں جس بات کو اچھا سمجھتے ہیں کبھی وہی بات ہمارے لیے مشکل پیدا کر دیتی ہے۔ صائمہ حیدر نے اپنی کہانی میں حساس دل رکھنے والی خاتون کا جائزہ بہت اچھی طرح سے لیا، پھر اسے سب کے سامنے پیش کیا۔ مدیحہ عدنان نے سادہ سی بات کو اچھے انداز سے اجاگر کیا۔ ہر مرد یہی چاہتا ہے کہ اس کی بیوی ہمیشہ صاف ستھری اور بنی سنوری نظر آئے۔ خواہ کتنی ہی مصروف کیوں نہ ہو۔ کاشی نے ''سہارا'' میں بہت خوب صورتی سے موضوع سے انصاف کیا۔ ایک سادہ سی بات کو خوب صورت طریقے سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے، بہت اچھا افسانہ ہے۔ مرزا اختیار بیگ سے ملاقات اچھی رہی۔ ''کھٹیا'' بلا مبالغہ بہترین اور دل میں اُتر جانے والی تحریر تھی۔ شروع سے لے کر آخر تک لفظ لفظ میں سچائی اور حقیقت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ہمارے دور کا سب سے بڑا المیہ اور دکھ کی بات ہے اور عورت کی حیثیت دراصل کیا ہے؟ ایک سوال ہے؟ جو اس تحریر کی صورت دل میں اُتر گیا۔ دیگر تحاریر بھی اچھی تھیں اور سلسلے بھی۔ رنگِ کائنات میں ''کچھ علاج اس کا بھی'' آخر میں لکھے شعر نے سارے مضمون کو چند لفظوں میں پرو دیا۔ رخسانہ باجی ''یادوں کے اوراق'' کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ''نئے لہجے نئی آوازیں'' میں خاص طور پر ''شاہ روم خان'' اور ''وقار خان'' کی شاعری نے متاثر کیا۔ پیاری عقیلہ! چند ایک تم ہی بے چاری نہیں ہو، تمہارا ساتھ دینے کے لیے میں بھی ہوں۔ نزہت بے چاری کیونکہ کاشی بھیا! نے مجھے بھی ابھی تک کتاب سے محروم رکھا ہے جب کہ یہ بے چاری تو تقریباً پڑوس میں رہتی ہے۔ کیوں کاشی؟ اچھا اجازت دیجیے، انشاء اللہ اگلے ماہ پھر حاضری دوں گی۔ تمام بہن بھائیوں، اسٹاف ممبران اور مسلمانانِ عالم کو رمضان المبارک کی آمد بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک میں امن قائم کرے اور ہم تمام مسلمانوں کو اس ماہِ مبارک کی فضیلتوں اور برکتوں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا کرے، آمین۔''

☆ نزہت! دعاؤں کے ساتھ جواب حاضر ہے۔ ''یادوں کے اوراق'' پچھلے ماہ سے سچی کہانیاں میں شروع ہو چکا ہے۔ بہت مشکل سے اپنے ذہن کو زندگی کی اِس شاہراہ پر لا سکی ہوں اور قلم اٹھایا ہے۔ زندگی تو نام ہی مسائل کا ہے اور جینے کا حوصلہ یہی دیتے ہیں، منزہ کی کتاب انشاء اللہ جلد آئے گی۔ ہماری بھی خواہش ہے، تم بھی انتظار کرو۔

✉ ثمینہ عرفان کراچی سے لکھتی ہیں۔ ''محترمہ رخسانہ سہام، السلام علیکم! آپ کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ آپ سب کو میری طرف سے رمضان المبارک کی پرخلوص مبارک باد قبول ہو۔ اللہ ہم سب کو ہمت و زندگی سے رمضان کے پورے روزے رکھنے اور طاق راتوں میں عبادت کی توفیق عطا فرمائے۔ ویسے تو عموماً میرے خطوط اور شاعری دوشیزہ میں جگہ پاتے ہیں لیکن پچھلا خط جو میں نے کافی طویل لکھا تھا خاص طور پر دلشاد نسیم سے ان کے شوہر کے انتقال پر تعزیت کے لیے، وہ شائع نہیں ہوا۔ جس کا افسوس ہے۔ شاعری کے بعد کچھ ''نثر'' پہلی دفعہ دوشیزہ میگزین کے لیے بھیجنے کی جسارت کر رہی ہوں، دوشیزہ کے لیے۔ امید پہ دنیا قائم ہے۔

☆ ثمینہ عرفان! تمہاری ساری دعائیں قبول ہوں۔ آج کل دعا بھی خریدنی پڑتی ہے۔ تم پہلی دفعہ لکھ رہی ہو کہیں ایسا نہ ہو یہ سلسلہ ٹوٹ جائے۔ آتی رہنا تمہارا خط شائع ہونے سے رہ گیا، کیوں رہ گیا؟ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہاں کوتاہی ہوئی ہے۔ تمہاری تعزیت دلشاد تک ضرور پہنچ جائے گی۔ وہ لوگ جو واپس نہ آنے والے سفر پر چلے جاتے ہیں۔ اُن کو تو ہر دن یاد کیا جاتا ہے۔ تمہاری تحریر کا جواب ناصر رضا دیں گے۔ اُن کو بھجوا دی ہے۔

✉ شگفتہ شفیق کراچی سے۔ ''آداب رخسانہ جی! امید ہے کہ ماشاء اللہ بخیریت ہوں گی۔ پچھلا مہینہ سخت مصروف گزرا ہے۔ بے حد مہمانوں سے بھرا ہوا اور مہمان بھی دور کے..... ایک تو میرے عزیز از جان بھائی کینیڈا سے پاکستان آئے ہوئے تھے، جب وہ آتے ہیں، تب میں سارے وقت اُن کے لیے بک ہو جاتی ہوں کہ بھائی اور بھتیجی کی شاپنگ کے سلسلے میں وہ میرے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ تو اسی طرح ہوا کہ ہم نے بہت کم عرصے میں بہت سارا کام کیا اور تمام کام پایہ تکمیل کو پہنچائے اور دوسری مہمان Ambition کی مدیرہ اسماء وارثی صاحبہ تھیں، جن سے پچھلے سال ہماری کینیڈا میں ہی ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے بھی ہمارے لیے مشاعرے کا اہتمام کیا تھا اور ہم کو Award of Appreciation سے بھی نوازا تھا۔ ان کے ساتھ بے حد مصروفیت رہی۔ تین چار بار ملاقات رہی۔ بہت اچھا وقت گزرا۔ دور دیس سے بلاوا آیا ہوا ہے کہ کتاب کی رونمائی کے سلسلے میں ''یاد آتی ہے'' کے لیے، یہ کتاب بھی لوگوں نے بے حد پسند فرمائی ہے۔ میں اپنے تمام احباب کی ممنون و مشکور ہوں اور اللہ سے آپ سب کے لیے آسانیوں کی دعا گو بھی کہ محبت کا جواب صرف محبت ہی ہے۔ سچی حقیقتوں سے سجا اداریہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ مجھے منزہ سہام نے تحریر کیا ہے۔ اپنی ڈائری سے باتیں میں بلیوں کا تذکرہ دل کو بہت بھایا کہ میرے پاس بھی 5 ننھے Kilten، 6 ان سے کچھ بڑی بلیاں اور 3 بڑی میچور بلیاں ہیں اور ایک مزید سب سے سینئر ہے جس کو ہم لوگ ''نانی'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ منزہ! تمہاری ''کانچ کی عورت'' کا شدت سے انتظار ہے۔ یاسر دلاور صاحب سے کہنا ہے کہ آپ میرے مجموعہ کلام کو فرید پبلشرز اردو بازار کراچی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ''عینی کی آئے گی بارات'' زبردست سیریل ہے۔ تمام کردار اس میں نگینوں کی طرح فٹ ہیں۔ رداناصر نے بہت اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ ''میری زندگی کا خوب صورت دن'' بہت حسین انداز میں نگہت اعظمی نے لکھا ہے۔ جس قدر نگہت اچھا لکھا کرتی ہیں اُس سے زیادہ

اچھی وہ تقریر کرتی ہیں۔ میں تو اُن کے بولنے سے بہت امپریس ہوئی ہوں اور وہ بہترین کک بھی ہیں۔ گویا کہ ہر فن مولا ہیں وہ۔ اللہ پاک اُن کو اور بہت ترقی دے، آمین۔ ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ کا تصویری سفر بہت اچھا اور اعلیٰ رہا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہمیں منزہ ایک دم گڑیا جیسی لگتی ہے۔ جہاں وہ کھڑی ہو جائے، وہ جگہ سج جاتی ہے ماشاء اللہ..... اللہ پاک اُس کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے، آمین۔ اِس بار مصروفیت کے باعث ''دوشیزہ'' ابھی تک پڑھ نہیں پائی ہوں لیکن ظاہر ہے کہ وہ ہمیشہ کی طرح اے ون ہی ہوگا۔ اگلے خط میں دونوں شماروں پر تبصرہ ہوگا، انشاء اللہ۔ پچھلے ماہ میٹرو چینل پر بزم شاعری میں شریک ہوئی تھی۔ تمام احباب جنہوں نے یہ پروگرام پسند فرمایا ان کا بہت شکریہ۔ اس کے علاوہ ایف ایم 105 پر 13 جولائی کو ''اکثر شب تنہائی میں'' شاہ رخ مرزا صاحب نے ہماری دونوں کتابوں ''میرا دل کہتا ہے'' اور ''یاد آتی ہے'' کی شاعری پر مشتمل دو گھنٹے کا پروگرام کیا۔ جس میں بہت سارے لوگوں نے ہماری شاعری کی بہت تعریف کی اور کچھ نے پروین شاکر سے بھی مشابہت ملائی۔ اس کے علاوہ 18 جولائی کو پھر دوبارہ ایف ایم 105 میں ہماری کتاب پر پروگرام ہوا جس میں زندگی میں پہلی بار میں نے بھی کال کی اور لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ پروین شاکر ایک بہت بڑا نام ہے، ہمارا رول ماڈل..... اور ابھی تو ہم طفلِ مکتب ہیں بہرحال سب لوگوں کا شکریہ جناب۔ میری طرف سے ادارے کے تمام اراکین کو پہلے رمضان اور پھر عید کی دلی مبارک باد۔ خدا کرے کہ تمام روزے بہت اچھے گزریں اور عید پر ہم سب سچے دل سے ایک دوسرے کے گلے لگ کے اپنی اپنی کدورتیں مٹا ڈالیں۔ اب اجازت، اللہ حافظ۔

☆ شگفتہ! بہت خوب صورت عید کارڈ ملا۔ تم بہت مصروف ہو۔ امریکہ اور برطانیہ اسی قسم کے شہروں سے آنے والے پیارے بازاروں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ تم نے بلیوں کا ذکر کیا۔ ہمارے منہ میں پانی آ گیا۔ بلیاں ہماری جان ہیں۔ منزہ کو بھی بہت پسند ہیں۔ منزہ کی موجودگی جگہ کو سجا دیتی ہے، یہ تمہاری محبت ہے۔ ''کانچ کی عورت'' انشاء اللہ جلد لانے کی کوشش ہے۔ پروین شاکر ایک خوب صورت شاعرہ تھی۔ آئی بھی، چھائی بھی اور چلی بھی گئی۔

✉ توصیف انور واحدی لاہور سے۔ ''السلام علیکم! سرورق پر نظر پڑتے ہی کراچی کا لفظ نظر آیا تو دل میں ٹیس اٹھتی محسوس ہوئی۔ روشنیوں کے شہر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ دعا ہے کہ خدا اس شہر کے حالات بہتر بنائے۔ شر پسندوں کو ہدایت دے اور آپ سب کی حفاظت فرمائے۔ پہلی بار کسی میگزین کے لیے تبصرہ لکھا جو دوشیزہ کے حصے میں آیا ہے۔ پہلے تو آپ سب کو مبارک باد اور دعا کہ دوشیزہ کو اللہ تعالیٰ مزید ترقیاں عطا فرمائے۔ اس ماہ شمارے کے حصول کے لیے تھوڑا انتظار کرنا پڑا مگر شمارے میں اپنا مختصر سا حصہ دیکھ کر ہی انتظار کا غم دور ہو گیا۔ اگر نام پڑھے بغیر ہی افسانہ پڑھتا تو کاشی چوہان کی تحریر مجھے ضرور کسی خاتون کی تحریر لگتی کہ جیسے وہ خواتین کے جذبات کو قلمبند کرتے ہیں۔ دیگر افسانوں میں صائمہ حیدر کی ''آج کی عورت'' اور مدیحہ عدنان کا ''ادراک'' خوب صورت تحریریں تھیں۔ گاؤں ہو یا شہر، کوئی بھی جگہ ہو، ہمارے یہاں خواتین کو نہ صرف ان کے جائز حقوق نہیں دیے جاتے بلکہ کسی نہ کسی طرح وہ استحصال کا شکار ہی نظر آتی ہیں۔ اس موضوع پر صائمہ حیدر کی تحریر شاندار تھی۔ مدیحہ عدنان کا ادراک مختصر لیکن زندگی کے ایک زاویے کو خوب صورتی سے پیش کرتا نظر آیا۔ نازنین رضا کا ناول بھی عمدہ تھا۔ دیگر سلسلے بھی شاندار تھے۔ ایک تحریر ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے اسے بھی دوشیزہ اپنے آنگن میں جگہ دے گا۔ خدا آپ سب کو خوش رکھے۔

☆ توصیف انور واحدی! آپ نے سچ لکھا ہے شہر کراچی بدامنی کا شکار ہے۔ صرف کراچی ہی نہیں بلکہ پورا پاکستان اس کرب سے گزر رہا ہے۔ اس کو کسی کی نظر نہیں لگی یہ تو ہمارے اعمال ہیں۔ قتل مذاق، ڈاکے ہنسی کھیل، اغواء برائے تاوان بیکاری کا مشغلہ، قانون تماشہ، مجرم آزاد، رشوت کھلے عام، شرم و حیا کا فقدان، مظلوم پریشان اور بہت کچھ ہر خوف آزاد اور انتہا تو یہ ہے رب العزت بھی یاد نہیں۔ اپنی پسند اور ناپسند سے آگاہ کرتے رہیے گا۔

✉ ارم زہرا کراچی سے۔ ''بہت ہی پیاری سی رخسانہ آنٹی، آداب! امید کرتی ہوں آپ بالکل خیریت سے ہوں گی۔ دوشیزہ کی محفل میں بہت دنوں بعد میری حاضری ہو رہی ہے۔ وجہ ڈھیر ساری مصروفیات ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اور تمام کارکنان، وابستگان دوشیزہ رمضان المبارک کی رونقوں، رحمتوں اور برکتوں میں سے اپنا حصہ وصول کر رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھ سمیت آپ سب پر اپنی نوازشات کی برسات تا حیات کرتا رہے اور ہمیں صدقِ دل سے شکر ادا کرنے کی توفیق عطا کرے، آمین۔ سب سے پہلے تو میں ناصر رضا بھائی اور غزالہ جی کی طبیعت کے حوالے سے فکرمند ہوں اور دعا گو ہوں کہ خدا انہیں جلد از جلد صحت کی دولت سے مالا مال کر دے۔ منزہ جی کا اداریہ تشنگی کا تاثر دے رہا ہے، تو ہم بھی تشنہ سے ''زادِ راہ'' کی جانب بڑھ گئے۔ ''نکتہ نظر'' میں میرے محترم استاد سید شاہد حسن صاحب کی تحریر یقیناً خاصے کا درجہ رکھتی ہے۔ نگہت عظمی کی ''ایک سنہری شام'' کا تصویری جائزہ دل کو خوش کر گیا۔ ساتھ ہی انہوں نے اتنے خوب صورت الفاظ میں میری تعریف کی ہے کہ میں آپ ہی اترانے لگی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت خود اتنی سادہ اور ملنسار ہے کہ مجھے اُن سے مل کر دلی خوشی ہوئی۔ جتنا خوب صورت وہ لکھتی ہیں، اتنا ہی خوب صورت وہ بولتی بھی ہیں۔ یقیناً ان سے ملاقات کا دن میری زندگی کا بھی یادگار دن ہے۔ منزہ جی کی ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ سے ملاقات تصویری جھلکیوں کی صورت پسند آئی۔ قطرے میں سمندر سمیٹنے کا ہنر کوئی سنبل جی سے سیکھے۔ ''جھوٹن'' ایک دلکش ناولٹ ثابت ہوا۔ میری موسٹ فیورٹ رائٹر فرزانہ آغا جی کے منی ناول کی دوسری قسط بھی جاندار رہی۔ منظر کشی، لفظوں کا چناؤ وہ جس خوب صورتی سے کرتی ہیں، سچ پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے قاری، لکھاری کے ساتھ ہی محوِ سفر ہو۔ رنگِ فسانہ میں کاشی چوہان کی تحریر ''سہارا'' ادبی رنگ میں ڈوبی ایک خوب صورت تحریر ثابت ہوئی۔ موجودہ حال کی عکاسی کاشی نے بہت خوب صورتی سے کی۔ کچھ جملے ایسے تھے جنہیں میں نے بار بار پڑھا۔ آج کی عورت کو افسانے کی صورت مدیحہ عدنان لائیں۔ ''ادراک'' طاہر جیسے مردوں کے لیے آئینے کا درجہ رکھتی ہے۔ صائمہ حیدر، روبینہ شاہین کے افسانے بھی اپنی اپنی جگ حقیقت سے قریب تر لگے۔ ''انتخاب خاص'' یہ سلسلہ پسند آیا۔ ''چاند میرا منتظر'' پر جو میرے دوست احباب تبصروں سے نواز

رہے ہیں، میں اُن کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ سب کی محبتیں اور ساتھ ہی مجھے فل چارج کیے ہوئے ہیں۔

شاعری میں اس بار عمران شمشاد نرمی کو بار بار پڑھا اور ان کی غزل کو خوب انجوائے کیا۔ نقاش کاظمی، شکیل احمد اور شگفتہ شفیق جی کی شاعری بھی جاندار رہی۔ رخسانہ آنٹی آپ کو محفل میں پا کر مجھے وہ رنگِ محفل یاد آگیا، جب آپ ہر تبصرے کے جواب میں ایک چلبلا تا لطیفہ بطور جواب دیا کرتی تھیں۔ آپ کی ملنسار طبیعت اور حسِ مزاح کے ہم ویسے بھی معترف ہیں۔ آپ کو محفل میں پا کر دلی مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ دعا گو ہوں کہ آپ کی سربراہی میں دوشیزہ کی محفل جو یہ اپنائیت، پیار، خلوص کی چاشنی لیے ہوئے ہے، وہ ہمیشہ یونہی سجتی رہے۔ عید سعید کی پیشگی مبارک باد کے ساتھ اجازت دیجیے۔ مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔"

جانے پر بہنوئیوں، دیوروں، حتیٰ کہ غیر مردوں کی بھی بھوک چمک اٹھتی ہے۔ ایسے میں فوراً مناسب فیصلہ کر لینا بہتر ہے۔ سب سے زیادہ سائرہ لنگڑیال کے "شام دہلیز پر" نے متاثر کیا۔ واقعی جو مرد عورت کو ایک بے جان کھلونا اور اپنی جائیداد و جاگیر سمجھے، اُس کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ ایک غریب اور مجبور و بے بس لڑکی اور اُس کے خاندان کی عزت کا جنازہ نکال دینے والے کے لیے یہ سزا کافی ہے کہ وہ تمام عمر خود کو ہی نہ پہچان سکے۔ سائرہ، آپ واقعی داد کی مستحق ہیں۔ "گئے دنوں کی بات" عالیہ حرا نے خاصے پرانے موضوع پر لکھا۔ اللہ اس وطن کو نظرِ بد سے بچائے۔ تاریکی کے دور میں روشنیوں کی بات کرنی چاہیے۔ "راستے گرد ہوئے" نزہت جبیں نے بھی خاصا بحث شدہ موضوع چنا۔ نزہت کی تحاریر میں دیگر ڈائجسٹ میں بھی پڑھ چکی ہوں۔ آپ کو راشدہ جیسی لڑکیوں کا انجام دکھانا چاہیے تھا، جو اپنی سہیلیوں کو جھوٹے خواب دکھا کر ان کی زندگیاں برباد کرتی ہیں۔ بشریٰ رحمٰن صاحبہ کا "تاج محل" میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ کسی خاتون کی تحریر تھی، میں تو اسے کسی مرد کے قلم کا شاہکار سمجھ رہی تھی اور اب جولائی کا دوشیزہ۔ یہ مجھے دس تاریخ کے بعد ریگل چوک سے ملا۔ سید شاہد صاحب نے بہت خوب صورتی سے عورت کی عزت و وقار کو بیان کیا۔ آپ ہی جیسے مردوں کی بدولت آج عورت کا وجود قائم ہے رمضان المبارک کی آمد مبارک۔ میں ایک طالبہ ہوں۔ آج کل چھٹیاں ہیں۔ بک اسٹال پر دوشیزہ کا ٹائیٹل بہت اچھا لگا۔ ناولٹ بھی اچھے ہیں اور رنگِ افسانہ کی الگ ہی بات ہے۔ ان سب میں مجھے "کھٹیا" بہت پسند آیا۔ آج کی عورت بہت اچھی تحریر تھی اور "سہارا" کراچی شہر اور ملک کی دہشت بھری فضا میں لکھا گیا ہے اور کی شوقین ہیں۔ ورنہ چاہیں تو مرد سے عزت کروانا کچھ ناممکن نہیں۔ "دھیرے سے بہار آئی" تا حال نہیں پڑھ "تھینک یو ڈائری" جو روبینہ کی تحریر تھی، اچھی لگی۔ کچن کارنر اور بیوٹی گائیڈ بھی بہتر تھے۔ اب آئندہ بھی دوشیزہ سکی۔ سنبل کا "جھوٹن" غضب کی تحریر تھی۔ ایک بے گناہ اور حالات کے ستم کا شکار لڑکی کو بدلتی ہوئی عورت سمجھنے پڑھ کر تبصرہ کروں گی۔"

والے مرد کی جب غلط فہمی دور ہوئی تو اس بے چارے کے پاس کیا بچا، اپنی ہی نظروں میں گر گیا۔ صائمہ حیدر کی تحریر کسی قدر ثرمین عبید کی ڈاکومنٹری سے متاثرہ لگی۔ بہر حال پسند آئی۔ مدیحہ عدنان نے "پرانی گاڑی" اور

☆ نورین! تم کو تحریریں اچھی لگیں۔ دوشیزہ ضرور پڑھتی رہنا اور تبصرہ بھی ضرور کرنا۔

☒ نورین کراچی سے۔ "السلام علیکم! دعا ہے اللہ آپ سب کو اپنی رحمتوں کے سائبان میں رکھے اور

☒ نبیلہ پروین کراچی سے۔ "محترمہ رخسانہ صاحبہ السلام علیکم! دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، دوشیزہ پڑھا روبینہ شاہین نے "تھینک یو ڈائری" میں مختلف موضوعات پر لکھا۔ ان باتوں پر عموماً نہیں لکھا جاتا۔ مینا تاج کا بہت اچھا لگا۔ مجھے اس میں ناول "جھوٹن" بہت پسند آیا۔ "زادِ راہ" بھی بہت اچھا ہے۔ "آج کی عورت" اور "کھٹیا" بھی بہت پسند آیا۔ بعض اوقات ہم تمام عمر ایک خواہش کے آسودہ ہونے کے انتظار میں گزار دیتے "ادراک" دونوں بہت اچھی تحریریں تھیں اور "تھینک یو ڈائری" بھی مجھے پسند آیا اور "کھٹیا" میں بہت ہی ہیں۔ کاشی نے بھی کراچی کی دہشت گردی پر اچھا لکھا۔ واقعی کوئی طبقہ ہے جو غیر انسانی سوچ کی وجہ سے پیارے انداز میں ایک عورت کی بے بسی اور بے قدری بیان کی گئی۔ "سہارا" بھی حالات پر لکھی سچی تحریر لگی۔ معاشرے کو دیمک کی طرح آہستہ آہستہ چاٹ رہا ہے۔ اللہ ماہِ رمضان میں بالخصوص اپنی رحمت نازل کرے۔ دوشیزہ کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں آئندہ تفصیل سے تبصرہ لکھوں گی۔"

☆ نبیلہ پرچہ پڑھتی رہو۔ پسند اور ناپسندیدگی بتاتی رہو۔

☒ رضوانہ عزیز شیخ لاہور سے لکھتی ہیں۔ "مدیرہ محترمہ اور دوشیزہ کی تمام ٹیم کو سلام، خیریت موجود، خیریت مطلوب۔ ایک ماہ کی غیر حاضری پر معذرت۔ ماہِ جون کا دوشیزہ بیس تاریخ کے بعد ملا اور وہ بھی انارکلی سے۔ میرا گھر گلشنِ راوی لاہور میں ہے۔ برائے کرم یہاں بھی کسی بک اسٹال پر ضرور دوشیزہ رکھوا دیں تاکہ انارکلی جانے کی زحمت نہ کرنی پڑے اور وہ بھی بالخصوص۔ سلسلہ وار کہانیوں پر میں نظر ڈالنے سے گھبراتی ہوں کیونکہ گزشتہ واقعات بھول جاتی ہوں۔ ایسے میں بعض چیزیں سمجھ نہیں آتیں۔ جون کے رنگِ افسانہ میں منزہ سہام کا "وہ اک لمحہ" اچھا لگا۔ یاسر نے بہت مثبت انداز میں ایمان کو سپورٹ کیا ورنہ لڑکے اکثر ایسے موقعوں پر "جاہلانہ غیرت" کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاملات کو بگاڑ لیتے ہیں۔ غزالہ عزیز کا "سمجھوتے زندگی کے" ایک حقیقت پسندانہ تحریر تھی۔ شاہدہ نے بہنوئی کے رویے کو سمجھ کر بروقت فیصلہ کر لیا جو بالکل درست تھا۔ عورت کے جوانی میں بیوہ ہو

Be-Belle®
INNERWEAR
Pakistan's First
2-Layer Fabric Bra!

سب کو رمضان مبارک۔ پہلا روزہ ہے، افطاری کا وقت قریب ہے۔ جی پی او میں بیٹھی خط لکھ رہی ہوں۔ انتخاب خاص کی کہانی کار تو بس میرے خیال میں ہاجرہ مسرور ہیں۔"

☆ رضوانہ عزیز شیخ! تبصرہ اچھا کیا ہے۔ بھئی آپ گھر جاؤ اور افطاری بناؤ۔ پہلا روزہ اور تم گھر سے باہر، ایسا ظلم..... پتا نہیں اس کا کون شکار ہوگا۔ پرچہ کے بارے میں تمہاری شکایت نوٹ ہوگئی ہے، سرکولیشن مینجر اس کو دیکھ لیں گے۔ نظم مل گئی ہے۔

✉ فریدہ خانم لاہور سے۔ "محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! سب سے پہلے میں انتخاب خاص کے "سہارا" پر بات کروں گی۔ بہت خوب صورت افسانہ، ماں اور بیٹے کی انوکھی محبت دل کے تار چھیڑ گئی۔ آج کے دور میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ کرے کہ سب بیٹے ماؤں کی محبت کو سمجھیں، آمین۔ لکھاری کا نام بوجھنے والا سلسلہ بہت ہی دلچسپ لگا۔ میں نے بڑی محنت سے نام جان لیا ہے اور آپ کو بھیج رہی ہوں۔ دل میں شدید تمنا ہے کہ میں جیت جاؤں بلکہ مجھے تو ابھی سے دوشیزہ گفٹ ہیمپر کا انتظار ہو رہا ہے۔ "خدیجہ مستور" ہے جناب لکھاری کا نام اور مجھے پتا ہے کہ میرا جواب بالکل ٹھیک ہے۔ منزہ سہام کا اداریہ پڑھ کے احساس ہوا کہ وہ اپنے والد سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور آپ کا سایہ ان کے سر پر سلامت رکھے، آمین۔ "دوشیزہ کی محفل" کے خطوط اچھے لگے۔ اب اور بھی اچھے ہو جائیں گے۔ جب میرا نام شامل ہو جائے گا، کہیے کیا خیال ہے؟ مجھے دوشیزہ میں کوپن والا سلسلہ بالکل پسند نہیں ہے۔ اسے کاٹنے سے تو ڈائجسٹ خراب ہو جائے گا۔ کیا فوٹو کاپی نہیں چل سکتی؟ اس بار سرورق بہت سادہ سا ہے۔ "سہارا" میں کاشی نے حال کا موضوع چنا۔ بہت اچھا لگا۔ بہت خوب۔ اللہ تعالیٰ کراچی پر اور ہم سب پر اپنا فضل و کرم رکھے، آمین۔ البتہ اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ اجمل علی شاہ کا رشتہ جب علینہ سے ہوا تو راؤ افضل شاہ کا اس شادی میں کوئی ذکر نہیں۔ "ادراک" مدیحہ عدنان کی ایسی خوب صورت کاوش جس نے بہت سی خواتین کی آنکھیں کھول دی ہوں گی۔ بہت خوب۔ "آج کی عورت" صائمہ حیدر کی مثبت کاوش، بس تھوڑی سی مزید محنت کی ضرورت تھی۔ "تھینک یو ڈائری" بھی روبینہ شاہین کا آنکھیں کھولنے اور شعور جگانے والا ایک خوب صورت افسانہ تھا۔ "کھٹیا" پڑھ کے دل بہت اداس ہوا۔ خواہشات اور حسرتیں انسان کو کتنا خوار کرتی ہیں؟ "یہ ہوئی نا بات" میں کچھ سوالات اچھے اور مزیدار نہیں تھے۔ البتہ جسے انعام ملا وہ سوال و جواب اچھے تھے۔ شاعری میں توصیف انور واحدی کی غزل بہت ہی اچھی لگی۔ دانش رحیم اور سائرہ غلام نبی کی نظمیں بھی زبردست تھیں۔ میری اردو شاعری کی پہلی کتاب "مختلف" شائع ہوئی ہے۔ آپ سب کی دعائیں چاہیے۔ اجازت اللہ حافظ۔"

☆ فریدہ! تم نے خط چھاپنے کا حکم دیا ہے تو چلو ہم کوشش کرتے ہیں۔ تم شاعرہ بھی ہو اور صاحب کتاب بھی ہو، بہت اچھا لگا پڑھ کر۔ انعام کا فیصلہ ہم نہیں کرتے۔ سوال تو ہمارے نہیں ہوتے ہاں جواب کوشش کریں گے کہ تم کو پسند آئیں۔ کیا اچھا لگا اور کیا برا آئندہ بھی بتاتی رہنا، خوش رہو۔

دوستو! پھر سے آپ سے اجازت لینے کی گھڑی آگئی، کیا کریں اگلے ماہ آپ سے ملاقات کے لیے، اس ماہ کی محفل کا اختتام ضروری ہے۔ دعا ہے کہ دوشیزہ کی محفل مسکراہٹوں سے سجی رہے، اس کے آنگن کے ستارے سدا جھلملاتے رہیں۔ آپ سب کو رمضان المبارک اور اس کے انعام عید الفطر کے ساتھ ساتھ، یوم آزادی بھی بہت بہت مبارک ہو۔

آپ سب کی اپنی
رخسانہ سہام مرزا

کہتے ہیں کہ جدید ٹیکنالوجی کے باعث یہ دنیا گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ اب گھر بیٹھے ریڈیو، ٹیلی وژن اور انٹرنیٹ، یہاں تک کہ جدید موبائل فون پر بھی ہر لمحہ دنیا بھر میں ہونے والے واقعات کے حوالے سے خبریں، نت نئی معلومات، جدید تحقیقات، ایجادات اور تجربات سے آگہی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تفریح سے بھرپور پروگرامز دیکھنا بھی آسان ہوگیا ہے۔ جیسے جیسے دنیا بھر میں جدید ٹیکنالوجی کے باعث ترقی حاصل کرنا آسان ہوا ہے، ویسے ویسے ہمارے لیے ان تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات خواہ وہ خبریں ہوں یا انفوٹینمنٹ یا انٹرٹینمنٹ کے حوالے سے پروگرامز کی ججمنٹ (judgement) کرنا مشکل ہوتا جارہا ہے کہ خبر میں خبریت ہے بھی یا نہیں؟ یا جو مواد تفریحی پروگرامز کے نام پہ ہم تک پہنچایا جارہا ہے، وہ واقعی ہمیں صحت مند اور صاف ستھری تفریح فراہم کررہا ہے یا نہیں؟ حقیقتاً یہ پروگرامز تفریح کے صحیح مفہوم کو پیش کر بھی رہے ہیں یا نہیں یا ان کا مقصد محض بے سروپا باتیں ہیں؟ وقتی طور پر ہی سہی، ہم خود کو پُرسکون محسوس کرتے ہیں یا پھر نت نئے فیشن اور کپڑوں کی نمائش، ڈانس، چیخ چیخ کر یا رو رو کر اپنی جانب متوجہ کرنا ہے۔

ان شوز کی ابتدا میں گھر کے تمام افراد، خصوصاً گھریلو خواتین کو صبح کے وقت ہلکے پھلکے انداز میں تفریح فراہم کرنا تھا لیکن اب یہ مارننگ شوز آفس جانے والے حضرات، اسکولز، کالجز جانے والے بچوں اور خواتین خصوصاً گھریلو خواتین، کو خبریں، مختلف قسم کی معلومات اور دلچسپ باتوں کے ذریعے ایک اچھی تفریح فراہم کرتے ہیں لیکن جوں جوں ٹیکنالوجی کو فروغ حاصل ہوا، ان تمام مارننگ شوز نے بھی (Television Rating points - T.R.P.) جسے عرفِ عام میں صرف ریٹنگ بھی کہا جاتا ہے، اس ریٹنگ کو حاصل کرنے کے لیے کروٹ بدلی اور ہوگیا ہر روز تماشہ شروع.....

بہ زبانِ شاعر کہ

ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

اب ان مارننگ شوز پر نگاہ ڈالیں تو صبح کے وقت کم و بیش ہر چینل پر یہ میلہ سجا ہوتا ہے۔ ڈانس، فیشن شوز، مہنگے مہنگے ملبوسات، شادی بیاہ، منگنیاں، ڈھولکی اور زیادہ تر شادیاں حقیقی نہیں بلکہ ڈرامہ ٹائزڈ (dramatized) ہوتی ہیں اور میاں بیوی اور ساس بہو کے جھگڑے اور ان جھگڑوں کو کبھی الجھاتی، تو کبھی سلجھاتی ہوئی چیخ چیخ کر بولتی ہوئی میزبان، جیولری اور شاندار سیٹ، جن پر بے شمار مہنگی مہنگی اشیا کا استعمال بھی اب لازمی ہوگیا ہے اور پھر یہ شادیاں کپل ڈانسنگ (couple dancing) کے بغیر تو بالکل ہی ادھوری نظر آتی ہیں، جسے ہماری روایات اور کلچر کا نام دے دیا جاتا ہے۔ کئی مارننگ شوز میں تو عوام کو جادو ٹونے سے نکالنے کے لیے بھی محنت کرتی خواتین نظر آتی ہیں۔ اسی طرح آنسوؤں کے ساتھ، بہت سی حقیقتوں کو سنایا اور بتایا جارہا ہوتا ہے۔ جس سیٹ پہ کچھ دن پہلے ڈانس کیا جاچکا ہے اب قبر کا احوال بتایا جارہا ہوتا ہے۔

قبر کا احوال، قبر کے معاملات، روح کی حقیقت اور اس جیسے بے شمار معاملات پر روشنی ڈالنے کے لیے مختلف چینلز پر بے شمار اچھے پروگرامز پیش کیے جارہے ہیں، جہاں کئی جید علماء ان معاملات اور دیگر مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں، جہاں پر ان پروگرامز اور موضوعات کا تقدس برقرار رکھا جاتا ہے تاکہ اگلے ہی ہفتے، اسی set پر پھر دوبارہ سے بے ہنگم موسیقی و ڈانس شروع کردیا جائے یعنی دوسروں کو نصیحت، خود میاں فصیحت.....

مارننگ شوز اپنے اصل مقصد میں صحت مند تفریح فراہم کرنے کے حوالے سے کتنا انصاف کررہے

ہیں؟ اس سروے میں ہم نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والی شخصیات سے اسی حوالے سے پوچھا تو کچھ اس طرح انہوں نے اپنی رائے سے آگاہ کیا ہے۔

حنا یامین (پروڈیوسر پی ٹی وی)

مارننگ شوز کا جو بنیادی مقصد تھا' وہ اب ختم ہوتا جارہا ہے۔ مارننگ شوز کی ٹارگٹ آڈینس، خواتین ہیں تاکہ وہ ان شوز کو دیکھ کر محظوظ ہوسکیں، لیکن اب خواتین کو محظوظ کرنے کی بجائے جو کچھ دکھایا جاتا ہے' وہ ان کو ڈپریس کردیتا ہے۔

مسز صفیہ الیاس (ہاؤس وائف)

مجھے تو لگتا ہے کہ ان مارننگ شوز کا مقصد محض فیشن کی عکاسی کرنا ہے یا پھر شادیاں کروانا اور ہم لوگ اس یکسانیت سے تنگ آچکے ہیں جبکہ کچھ عرصے پہلے تک یہ تمام شوز کافی حد تک informative تھے۔ اب معلومات سے زیادہ فیشن اور ڈیزائنر ویئر کی پروموشن نظر آتے ہیں۔

وجیہا جاوید (چیف سب ایڈیٹر آف میگ)
(Chief sub-editor of The Mag)

میرے خیال سے تو مارننگ شوز بس اب وقت ضائع کرنے کا ذریعہ ہیں۔ کچھ عرصے پہلے واقعی یہ شوز معاشرے میں اچھی معلومات اور صحت مند تفریح فراہم کررہے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہورہا ہے۔ جب سارے موضوعات پہ بات ہوچکی ہے، تو اب ہر صبح بس ہر مارننگ شو میں ڈانس کو پروموٹ کیا جارہا ہے یا پھر چھاپے مار مار کر خواتین خود معاشرے کی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہیں۔

رانا محمد طارف محمود (Ptv producer)

ابلاغ عامہ عموماً معاشرتی رویوں' احساسات و رسومات کی نمائندگی کرتا ہے۔ بلاشبہ آج کل مارننگ شوز عوام کو محظوظ کرنے یا educate کرنے سے زیادہ ایک ذہنی اذیت کا سبب بن چکے ہیں' محض rating کے لیے، اس قدر پروجیکشن غلط ہے۔

اسماعیل امین (طالب علم' کراچی یونیورسٹی)

کچھ عرصے پہلے مارننگ شوز انفوٹینمنٹ فراہم کرتے نظر آتے تھے، لیکن اب بیشتر شوز اسٹیریوٹائپ ہوگئے ہیں۔ اگر انٹرٹینمنٹ ہے تو اتنی کہ زندگی کا مقصد ہی انٹرٹینمنٹ نظر آتا ہے اور اگر کسی خاص موضوع کو لے کر چلتے ہیں، تو بے زاری اور مزاحیہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

مسز گل رعنا (ہاؤس وائف)

ابتدا میں تو مارننگ شوز معلومات کے ساتھ ساتھ اچھی تفریح بھی عوام کو مہیا کرتے تھے لیکن بعد میں ان مارننگ شوز کو ایک بھیڑ چال کی شکل دے دی گئی اور اب تو کسی بھی شو میں نہ تو کسی موضوع کو سنجیدگی کے ساتھ سامنے لایا جاتا ہے، نہ ہی ان کا کوئی نتیجہ ہوتا ہے اور بعض اوقات تو سارا شو ڈرامہ لگ رہا ہوتا ہے۔ بطور viewer اتنا ہمیں بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ کیا ڈرامہ ہے اور کیا حقیقت؟ اب مارننگ شوز کا مثبت تاثر ختم ہوتا جارہا ہے۔

مہرین تسلیم (Ptv producer)

مجھے تو اب مارننگ شوز میں کوئی مقصدیت نظر نہیں آتی ہے' صرف مادیت نظر آتی ہے۔ لوگوں کے مسائل سامنے لانے کے لیے پورا ڈرامہ کری ایٹ کرتے ہوئے مسئلہ پیش کیا جاتا ہے، جہاں مسئلہ پیچھے رہ جاتا ہے تو ایکٹر سامنے..... اور حل پھر بھی ہاتھ نہیں آتا ہے۔

نازش ایاز (P.R.O. to CPLC)

مارننگ شوز صرف اور صرف ڈپریشن پھیلا رہے ہیں۔ جب بھی دیکھو' مہنگے ملبوسات' جیولری کی باتیں ہورہی ہوتی ہیں۔ انٹرنیشنل برانڈ کے بارے میں بتایا جارہا ہوتا ہے جو کہ کم از کم ان حالات میں جب مہنگائی آسمان سے باتیں کررہی ہے' افورڈ کرنا ناممکن ہے۔ جس سے ڈپریشن ہی ہوتا ہے یا پھر اگلے دن کبھی قہقہے تو کبھی روتی بلکتی ہوئی اینکرز نظر آتی ہیں۔

مسز ارم وسیم (ہاؤس وائف)

شروع میں' میں بہت شوق سے مارننگ شوز دیکھا کرتی تھی' اب تو نہ بھی دیکھو تو پتا ہوتا ہے کہ کون سا ویک ہوگا یا تو شادی ویک یا رونا دھونا یا سائے اور آسیب کے واقعات۔ ہر شو میں یکسانیت آگئی ہے، اس لیے دیکھنے کا دل نہیں چاہتا ہے۔ کوئی مقصدیت ہی نہیں ہے۔

ثوبیہ خانم (producer Ptv)

مجھے تو آج کل مارننگ شوز میں سب سے زیادہ جو بات نظر آرہی ہے' وہ یہ ہے کہ ہر ٹاپک extreme (انتہا) پر ڈسکس ہوتا ہے۔ پورا پورا ویک (week)، ایک ہی ٹاپک کو دکھایا جارہا ہوتا ہے۔ اس پر بات کی جارہی ہوتی ہے یا تو خوامخواہ بے تحاشہ قہقہے یا پھر بات بے بات رونا' آنسو بہانا.....

مسز معین (ہاؤس وائف)

میں تو بہت شوق سے مارننگ شو دیکھتی ہوں' خاص طور پر جب مختلف شعبوں کے ڈاکٹرز کو بلایا جاتا ہے، تو خاصی انفارمیشن ملتی ہے۔ اسی طرح شادی ویک کو انجوائے کرتی ہوں۔

اجمل میر (Ptv producer)

مارننگ شوز کے ذریعے خواتین کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی رسومات' فیشن کے بارے میں آگاہی حاصل کرسکیں۔ مردوں کے اس معاشرے میں اس طرح کے پروگرامز ان کے لیے ضروری ہیں۔

فوزیہ قریشی (H.R. officer at Shaheen Air Lines)

میں عموماً رات کے وقت repeat ٹائمنگ میں مارننگ شوز دیکھا کرتی تھی، لیکن اب تو ان شوز کو دیکھنے سے بہتر یہ لگتا ہے کہ سوجائیں کیونکہ نہ تو ان میں پہلے کی طرح ہلکی پھلکی تفریح ہے اور نہ ہی معلومات۔ صرف اور صرف بے ہنگم موسیقی' ڈانس اور ساس بہو کے جھگڑے ہی نظر آرہے ہوتے ہیں۔

مسز صائمہ وسیم (ہاؤس وائف)

میں تو جب بھی یہ مارننگ شوز دیکھتی ہوں، تو انٹرٹینمنٹ سے زیادہ لگتا ہے کہ اینکر صاحبہ خود کو نمایاں کررہی ہیں۔ کبھی رو رو کر تو کبھی چیخ چیخ کر۔ عجیب سی بے زاری ہوتی ہے، اب تو صبح کے وقت ان مارننگ شوز سے۔ اکثر اوقات تو اینکر صاحبہ کی اپنی پوری فیملی بیٹھ کر ان کی تعریف کررہی ہوتی ہے۔

ان تمام شخصیات کے علاوہ بھی ہم نے جس سے بھی رائے لی تو بیشتر افراد نے کہا کہ مارننگ شوز اپنے اصل مقصد یعنی صحت مند تفریح فراہم کرنا سے ہٹ چکے ہیں اور بھیڑ چال کا شکار ہیں۔

اکثر افراد خصوصاً خواتین نے کہا کہ بچوں کو اسکول اور شوہر کو آفس بھیجنے کے بعد وہ چاہتی ہیں ٹی وی کھول کر کسی اچھے چینل کا مارننگ شو دیکھیں تاکہ پورے دن کے لیے فریش ہوسکیں، لیکن بیشتر چینلز پر ڈپریشن پیدا کرنے والے موضوعات پر بات ہورہی ہوتی ہے اور مشہور میک اپ آرٹسٹ سے کیے گئے میک اپ اور مشہور ڈیزائنرز کا لباس پہن کر لاکھوں میں تنخواہ لینے والی اینکر کو کیا معلوم کہ اس مہنگائی میں گھر کا بجٹ بنانا کس قدر مشکل ہے نا کہ ڈیزائنر ویئر پہننا ممکن ہو اور صبح صبح اتنا ڈپریشن دیکھ لینے کے بعد باقی دن بھی اس کے ہی زیر اثر گزرتا ہے۔

موجودہ دور میں میڈیا کی جانب سے تلخ حقیقتوں کے ساتھ ساتھ چند ایسے پروگرامز کی بھی ضرورت ہے جو کہ معاشرے میں رہنے والے ہر فرد کو صحت مند تفریح فراہم کرسکیں اور صبح کے وقت ایسے پروگرام کرنے چاہئیں کہ جس میں انفارمیشن کے ساتھ ساتھ اصلاح کا پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آئے۔

.....☆☆.....

سنئے سوال

مشہور ومعروف ٹی وی ڈرامہ رائٹر

طاہر شیخ

ذیشان فراز

☆ وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟
♥ طاہر شیخ۔
☆ وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟
♥ بمبئی۔
☆ زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟
♥ ''دلو'' AQUARIUS۔
☆ علم کی کتنی دولت کمائی؟ اور کہاں سے؟
♥ B.A HONS (LONDON)
B.LITT (OXFORD)
☆ آپ کی فیملی کتنے افراد پر مشتمل ہے؟
♥ پانچ۔
☆ موجودہ کیریئر سے مطمئن ہیں؟
♥ اپنی عالیشان سرکاری نوکری سے تو میں ریٹائر ہو چکا ہوں اور ڈراما رائٹنگ کو کبھی کیریئر بنانے کا سوچا نہیں۔
☆ شوبز سے رشتہ کب اور کس شعبے میں جوڑا تھا؟
♥ 1966ء میں، بحیثیت رائٹر۔
☆ آپ کے چند یادگار ڈرامے؟
♥ یور اوبیڈینٹ سرونٹ، آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی، پہنچی وہیں پہ خاک وغیرہ صرف میرے نہیں ''پی ٹی وی'' کے بھی نہایت ہی یادگار ڈرامے ہیں۔
☆ آپ کے کام کی تعریف یا تنقید کس حد تک ہوتی ہے؟
♥ تعریف بہت سمجھ دار لوگوں کی طرف سے لیکن کم ہوتی ہے۔ تنقید یہ ہوتی ہے کہ آپ کا ڈراما خشک، گلیمر سے محروم ہوتا ہے۔
♥ آپ کا نیا کام؟
☆ ''بلیک بورڈ جنگل'' بہت جلد ناظرین دیکھیں گے۔
☆ ڈرامہ رائٹنگ کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟
♥ جی یہ بات درست ہے۔

☆ کون سی خوشبو آپ کی کمزوری ہے؟
♥ گلاب۔
☆ دھنک کے سات رنگوں میں کون سا رنگ دل کو بھاتا ہے؟
♥ ہرا۔
☆ لباس جگ بھاتا پہنتے ہیں یا من بھاتا؟
♥ جگ بھاتا۔
☆ اردو والے ''سفر'' کا ذریعہ کیا ہے؟
♥ چار پہیے والی گاڑیاں۔
☆ صبح آنکھ کھلنے کے بعد کیا اور کسے دیکھنا اچھا لگتا ہے؟
♥ اپنے محبوب کو۔
☆ کون سا ایسا دوست ہے جس سے ہزار بار ملنا بھی خوشی اور طمانیت کا باعث ہو؟
♥ وہ شخص اب بقیدِ حیات نہیں۔

☆ بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟
♥ کتابیں پڑھتا ہوں۔
☆ دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟
♥ رات۔
☆ تنہائی پسند ہیں یا محفل پسند؟
♥ تنہائی پسند۔
☆ حساس ہیں یا......؟
♥ حساس ہوں۔
☆ کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟
♥ جھوٹ اور بے حسی۔
☆ دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت، اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔
♥ صحت، اس کے بعد جو مل جائے۔
☆ پہلی ملاقات میں ملنے والے کی کس بات سے متاثر ہوتے ہیں؟
♥ اس کی شخصیت سے۔
☆ کرنٹ افیئر اور سیاست سے کس حد تک دلچسپی رکھتے ہیں؟
♥ کرنٹ افیئر میرا پسندیدہ سبجیکٹ ہے۔
☆ خودستائشی کے کس حد تک قائل ہیں؟
♥ بالکل نہیں۔
☆ یاد کا کوئی جگنو جو تنہائی میں روشنی کا باعث بنتا ہو؟
♥ بہت سارے ہیں۔
☆ غصے میں کیا کیفیت ہوتی ہے، خاموشی یا چیخ وپکار؟
♥ خاموشی۔
☆ کتابوں سے دوستی ہے؟ ہے تو کیسی کتابوں سے؟
♥ جیسے ''شہاب نامہ''۔
☆ ادیب پسند آتا ہے یا کہانی، شاعر متاثر کرتا ہے یا شاعری؟
♥ تحریر پسند آتی ہے۔
☆ لوگوں کی نظر میں آپ کی شخصیت کیسی ہے؟

اعلیٰ' اچھی' بس ٹھیک؟

♥ بس ٹھیک۔

☆ موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟

♥ مجھے موت کبھی نہیں ڈراتی۔

☆ فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتے ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

♥ مکمل یقین رکھتا ہوں۔

☆ تفریح کے لیے پسندیدہ جگہ؟

♥ اپنا کمرہ۔

☆ سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥ خوف آتا ہے، سب کچھ ڈوب جانے کے خیال سے۔

☆ کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟

♥ دونوں۔

☆ اخبار' میگزین پڑھنا عادت ہے یا وقت گزاری کا ذریعہ؟

♥ وقت گزارنے کے لیے۔

☆ ٹی وی پر کیسے پروگرام دیکھتے ہیں اور فلم کیسی پسند آتی ہے؟

♥ ہر قسم کے پروگرام اور فلم دیکھتا ہوں۔

☆ شوبز کی دنیا میں پسندیدہ ترین شخصیت؟

♥ ضیا محی الدین۔

☆ آپ آئیڈیل پر یقین رکھتے ہیں؟ اگر ہاں تو کیوں؟ اور نہیں تو کیوں نہیں؟

♥ آئیڈیل کچھ نہیں ہوتا۔

☆ خود آپ کسی کا "آئیڈیل" قرار پائے؟

♥ پتا نہیں۔

☆ کیا آپ اچھے رازداں ہیں؟

♥ اپنے ذاتی خیال میں "ہوں"۔

☆ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں' اس بات پر کس حد تک یقین ہے؟

♥ یقین نہیں رکھتا۔

☆ زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کے قائل ہیں یا تدبیر کے؟

♥ تدبیر۔

☆ کبھی زندگی سے بیزاری بھی ہوئی ہے؟

♥ ہاں! کئی بار ہوئی ہے۔

☆ خودکشی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں' کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟

♥ جو زندگی سے ڈر کر بھاگے وہ بزدل ہی ہوتا ہے۔

☆ "ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا" کس حد تک عمل کرتے ہیں؟

♥ ہمیشہ۔

☆ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہے؟ اگر ہے تو کیسی موسیقی؟

♥ ہاں یقین رکھتا ہوں، اچھی موسیقی۔

☆ گلوکاری کی دنیا میں آپ کی پسندیدہ آوازیں؟

♥ جگجیت سنگھ۔ مہدی حسن۔

☆ حرفِ آخر کیا کہنا چاہیں گے؟

♥ زندگی ایک آزمائش ہے۔

.....☆☆.....

منی اسکرین

ARY کے نئے ڈرامے

م۔ش۔خ

قارئین! جب آپ یہ کالم پڑھ رہے ہوں گے رمضان المبارک کے بابرکت مہینہ کا آغاز ہو چکا ہوگا، ARY اس دفعہ فیضان رمضان کے عنوان سے اس ماہِ رمضان میں خصوصی نشریات پیش کررہا ہے،
رمضان المبارک کو بھرپور عقیدت سے پیش کر رہے ہیں معروف ہوسٹ اور مایہ ناز جرنلسٹ ڈاکٹر شاہد مسعود اور ان کے ساتھ ناظرین کی پسندیدہ شخصیت مایا خان بھی شانہ بشانہ ہیں۔ آیئے اب چلتے ہیں ARY کے پروگراموں کی طرف۔ رمضان کا اسپیشل سیریل ''بینڈ بجے گا'' پیر سے لے کر جمعہ کی رات 9 بجے تک دکھایا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ناظرین کے لیے، خصوصی کھیل رمضان کے حوالے سے ''بلبلے'' یکم رمضان سے لے کر 30 رمضان تک روزانہ 7:30 بجے آن ایئر ہوگا۔
صبح سحری کی نشریات رات 2:30 بجے سے لے کر 6 بجے تک اور افطاری کی نشریات 3 بجے سے لے کر 7:30 بجے تک دکھائی جائیں گی۔ سحری میں جو

فیصل قریشی ''ٹوپی ڈراما'' کے ایک منظر میں

پروگرام پیش کیے جائیں گے ان میں حسنِ عشق، نیکی، سحری میں 2 سال سے کامیابی کے زینے طے کرنے والا پروگرام ''عالم اور عالم'' 5 بجے سے لے کر 6 بجے تک معروف ہوسٹ تسلیم صابری پیش کریں گے۔ افطاری کے پروگراموں میں عشائیہ، چاہت رسول، نعتیہ مقابلہ، نیکی کے مہمان اور پروگرام ''میٹھی افطاری'' میں عام لوگوں کو مدعو کیا جائے گا، جو ہمارے خصوصی مہمانوں کے ساتھ افطاری کریں گے۔ ان تمام پروگراموں کے ہدایت کار کامران خان ہیں۔
''ٹوپی ڈرامہ'' جس کے مرکزی کردار اعجاز اسلم اور فیصل قریشی نے انجام دیے ہیں، یہ خوبصورت ڈرامہ ناظرین میں بہت مقبول ہورہا ہے۔ ''ٹوپی ڈرامہ'' ہر اتوار کی رات 9 بجے دکھایا جائے گا۔
ڈیجیٹل کے پروگرام ''گڈ مارننگ'' کو ندا پاشا بڑی خوبصورتی سے پیش کررہی ہیں اور ہر دفعہ اپنے پروگرام میں خوبصورت شخصیات کو مدعو کرتی ہیں۔
کیو ٹی وی میں سحر و افطار کی خصوصی نشریات میں رحمت سحر، نعمت افطار، کو تسلیم فاضلی پیش کریں گے۔ ہر منگل کی صبح ماہرِ تعلیم اور معروف شخصیت سندھ انٹر بورڈ کے چیرمین انوار احمد زئی صاحب تفسیر قرآن پیش کرتے ہیں۔ انوار احمد زئی کی سادگی اور ان کی گفتگو کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا ہے کہ وہ حکومت پاکستان کی ایک بڑے ادارے کی چیئرمین ہیں۔ پروگرام ''حفظ القرآن'' جس میں حافظ بچے مقابلے کے لیے شرکت کریں گے۔ یہ پروگرام افطار کے بعد پیش کیا جائے گا۔ پروگرام ''رمضان خزینہ'' کو پروفیسر میمونہ مرتضیٰ ملک لائیو پیش کریں گی۔ مفتی

''گڈ مارننگ'' کی ندا پاشا کا ایک انداز

سہیل رضا امجدی پروگرام ''حاصل ترابی'' رات 10 بجے پیش کریں گے۔ مولانا کوکب نورانی اور مفتی منیب الرحمٰن پروگرام ''ارمغان رمضان'' رات 8 بجے پیش کریں گے۔ پروگرام ''محبت مصطفیٰ'' رات 10:30 پیش کیا جائے گا جس کے مقرر ثاقب شامی ہوں گے۔ کیو ٹی وی کے معروف پروگرام روشنی صبح 9:30 بجے لے کر 11:30 بجے تک نادر شاہ خان پیش کرتے ہیں۔

......☆☆......

بچپن کی ایک یادگار عید

گل

آج کل ٹی وی پر بچوں کے ساتھ ہونے والے لرزہ خیز واقعات دیکھ اور سن کر ہر صاحب دل پریشان ہے۔ بچوں کو اکیلے باہر بھیجتے ہوئے خوف آتا ہے لیکن میں جس دور کی بات کرنے جارہی ہوں وہ آج سے بہت مختلف تھا۔

میرا بچپن راولپنڈی کے ایک قدیم محلے میں گزرا۔ ہمارے خاندان کے سات آٹھ گھر ایک ہی گلی میں تھے۔ اس گلی میں ہم سب بچے بڑی آزادی سے گھومتے پھرتے تھے، کھیلتے کودتے تھے، وہ گلی گویا ہمارے گھر کا ہی ایک حصہ تھی لیکن اس گلی کے باہر ہمیں اکیلے نکلنے کی اجازت نہ تھی اور ہم سب بچوں کو سختی سے اس پابندی پر عمل کروایا جاتا تھا۔

اول رمضان سے ہی عید کا اہتمام شروع ہو جاتا تھا۔ اس وقت میری عمر بمشکل آٹھ یا نو سال تھی۔ میری ایک چچی جو گوٹے کا بہت اچھا کام کرتی تھیں، میرے لیے ہمیشہ کی طرح عید کا جوڑا اپنے ہاتھوں سے سیا تھا۔ اس پر خوب صورت گوٹے کا جال بنایا۔ میں تو سرخ رنگ کا گوٹے والا جوڑا لے کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی، ضد کر کے میں نے ہیل والے سینڈل بھی خریدے اور بے چینی سے عید کا انتظار کرنے لگی۔

آخر خدا خدا کر کے وہ دن آ ہی گیا۔ عید پر ہمیشہ مجھے میری بڑی آپا ہی تیار کرتی تھیں، امی تو اس دن بڑے کھانے کی تیاری میں مصروف ہوا کرتی تھیں (اس دن سارے خاندان کا کھانا ہمارے گھر میں ہوتا تھا جسے بڑا کھانا کہا جاتا تھا) میں نے اپنا گوٹا لگا سرخ جوڑا اور ہیل والے سینڈل پہنے، آپا نے میرے بال بنائے، لپ اسٹک اور نیل پالش بھی لگائی۔ میرے کانوں میں سونے کی موٹی موٹی بالیاں اور کنگن تو ویسے ہی ہر وقت رہتے تھے ایک دو چھوٹی انگوٹھیاں جو میں اکثر گم کرتی رہتی تھی لیکن ہمیشہ دوبارہ مل بھی جایا کرتی تھیں۔ آپا نے اپنی الماری کھولی تو میری نظر ان کے نقشین جیولری باکس پر پڑی جس میں ان کی شادی کے لیے بنا کر رکھا زیور پڑا ہوتا تھا، انہوں نے لاڈ میں آ کر مجھے اپنا بھاری سا ہار اور جھومر بھی پہنا دیا۔

میری خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ سب ہی میری سج دھج کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ بازو میں لٹکے چھوٹے سے پاؤچ میں عیدی بھی جمع ہو رہی تھی۔ مجھے حیرانگی ہے کہ کسی بزرگ نے بھی مجھے اتنا سونا پہنانے پر اعتراض نہیں کیا، نہ ہی کسی کو کوئی تشویش ہوئی جب کہ اس کے تھوڑے ہی دن پہلے میں اپنے درزی کی بیوی کو پٹولوں (کپڑوں کی کٹائی سے بچے ہوئے چھوٹے پیس جو بچیاں گڑیوں کے کپڑے سینے کے لیے درزیوں سے لیا کرتی تھیں) کے عوض چھ تولے کے کنگن اتار کے دے آئی تھی جو اس نے آ کر میری امی کو دیے اور کہا کہ آپ نے اتنی چھوٹی بچی کو اتنا سونا پہنا رکھا ہے، جس کی قدر و قیمت کا اسے ادراک تک نہیں ہے۔ وہ یہ کسی کو بھی اتار کر دے دیتی ہے لیکن میں نے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ کوئی اس کے زیور اتار لیتا۔

دوپہر کے کھانے تک ہم سارے کزنز مل کر

کھیلتے رہے۔ گھر میں پڑے جھولے پر جھولتے رہے، لیکن دوپہر کے بعد جب سب اِدھر اُدھر بکھر گئے، بڑے اپنی گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔

ہمارے گھر میں ایک نوکرانی تھی، مجھ سے تین چار سال بڑی ہو گی۔ نام اس کا فاطمہ تھا لیکن سب اس کو جھلی کہتے تھے۔ کہنے لگی کہ سب لوگ عید پر جھولے جھولنے دور جاتے ہیں اور آپ لوگ گھر سے نکلتے ہی نہیں۔ کمپنی باغ میں میلہ لگتا ہے، جس میں اتنے بڑے بڑے جھولے اور موت کا کنواں بھی ہوتا ہے۔"

میرا دل یہ سب سن کر مچلنے لگا لیکن ڈر بھی لگ رہا تھا کیونکہ ہمیں تو اپنی گلی سے باہر جانے کی اجازت ہی نہ تھی لیکن وہ عید کی رونقوں کا کچھ اس انداز سے ذکر کر رہی تھی کہ میں وہ سب دیکھنے کو تیار ہو گئی۔

ہم سب کی نظر بچا کر گھر سے نکل گئے۔ میں موت کا کنواں دیکھنے کو بے تاب تھی لیکن وہ جگہ ہمارے گھر سے کچھ زیادہ ہی فاصلے پر تھی اس لیے شاید وہ بھی اتنا حوصلہ نہ کر سکی اور قبرستان میں پڑنے والے جھولوں کی تعریفیں کرنے لگی لہٰذا میں اس کے ساتھ قبرستان چلی گئی، جہاں قبرستان کے باہر درختوں کے ساتھ کئی لوگوں نے جھولے باندھ رکھے تھے اور معمولی پیسے دے کر لوگ جھولے لے رہے تھے۔ میں نے بھی خوب جھولے جھولے۔ وہاں عید کے خصوصی بازار سے خوب شاپنگ کی، کھایا پیا لیکن دماغ میں موت کا کنواں ہی اٹکا ہوا تھا۔

میں نے اسے کہا یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو تم بتا رہی تھیں۔ کہنے لگی چلو آگے چلتے ہیں غزنی کی پینگ پر جھولیں گے لیکن کمپنی باغ جانے کا حوصلہ شاید اس کو بھی نہیں ہو رہا تھا۔ بہر حال ہم غزنی کی پینگ کی طرف چل پڑے۔

میں اب سوچتی ہوں تو اپنی اس بے وقوفانہ دلیری پر حیرت ہوتی ہے۔ جہاں پر آبادی اور قبرستان ختم ہوتا تھا وہاں اونچے نیچے ٹیلے تھے، جن میں کچھ قدرتی غار تھے اور کچھ افغان خانہ بدوشوں نے کھود کر بنائے ہوئے تھے۔ ایک قدرتی جوہڑ تھا، جس پر بڑ کا ایک قدیم درخت سایہ کیے ہوئے تھا۔ یہاں پر خانہ بدوش عموماً سردیاں گزارنے آیا کرتے تھے۔ دور ایک کچے مکان کے آنگن میں بیری کا ایک قدیم درخت تھا جس کے ساتھ لمبا جھولا پڑا تھا۔ یہاں پر لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ یہی غزنی کی پینگ تھی جسے ایک بندہ نہیں بڑھا سکتا تھا، دو لڑکیاں مل کر بڑھاتی تھیں۔

میں اور جھلی بھی جھولے پر بیٹھ گئے اور پینگ بڑھانا شروع کی۔ جھولے کے ساتھ میرا جھومر اور ہار بھی لہرا رہا تھا۔ یہاں پر ہم نے اتنے جھولے لیے کہ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ ہمیں گھر چلنا چاہیے۔ عیدی بھی خرچ ہو چکی تھی۔ شام سے پہلے گھر پہنچنا ضروری تھا۔

ہم تقریباً بھاگتے دوڑتے ہوئے اپنی گلی پہنچے تو پتا چلا کہ مجھے ڈھونڈا جا رہا ہے۔ اب تو جھلی کی بھی سٹی گم ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ الزام اس کے سر جائے گا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ گھر جانے کی بجائے پہلے بڑی تائی اماں کے پاس چلتے ہیں۔ وہ ساتھ لے کر گھر جائیں گی تو سزا میں کمی ہو جائے گی۔ سو ہم نے ایسا ہی کیا۔

پہلے تو تائی اماں نے ہمیں خوب ڈانٹا، جھلی کو بھی ہلکے سے دو طمانچے جڑے اور پھر ساتھ لے کر آئیں۔

پہلے تو ہمیں صحیح سلامت دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی پھر یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ سارے زیورات بھی صحیح سلامت تھے پھر بھی ہمیں اتنی سختی سے ڈانٹا گیا کہ دوبارہ کبھی غزنی کی پینگ جھولنے کا خیال تک دل میں نہ آیا۔

میں سوچتی ہوں کہ خدانخواستہ آج کوئی بچی اتنے زیورات پہن کر، اکیلی جھولا جھولنے چل پڑے تو اس کا کیا حال ہو؟ یہ سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ☆☆

سلسلۂ خاص

زمرنعیم

تم میرے ساتھ رہو

سماجی مسائل اور معاشرتی رویوں سے کشید کیے گئے، سلسلہ وار ناول کی چھ رہویں قسط

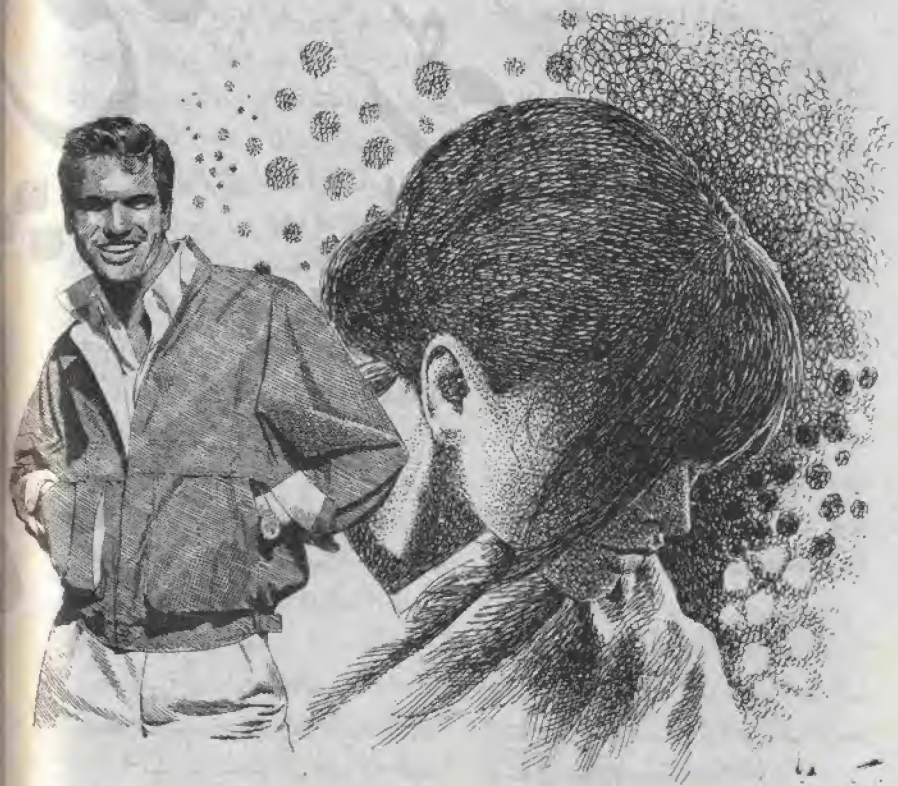

''انصاری ہاؤس'' میں ظہیر اکبر زریں بیگم کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے دو بیٹے حماد اور عباد ہیں۔ عباد کی بیوی سنبل ہے، جو گھر کے کام کاج میں گھن چکر بنی رہتی ہے۔ پھر بھی ساس سے باتیں سنتی ہے جب کہ حماد کے دو بچے ہیں اور بیوی شمسہ بھی گھر میں اپنی ساس کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ ظہیر اکبر کی دوسری بیوی ان حالات میں ان کی زندگی میں آئیں کہ وہ بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ ان سے ان کا ایک بیٹا اُسود علی ہے۔ سارا کاروبار، گھر بار، جائیداد اُسود علی کے نام ہے اور وہ زریں بیگم کے عتاب میں زندگی گزار کر ایک فیصلے کی چوٹ چڑھ چکا ہے جس کے نتیجے میں زریں بیگم کی بھتیجی نائیلہ اس کی بیوی بن چکی ہے۔ علیشہ نجف ایک مشہور فوٹو گرافر ہے۔ وہ اُسود علی کی نگاہ میں آگئی اور اُسود اس پر دل ہار بیٹھا۔ علیشہ نجف ایک مضبوط کردار کی لڑکی ہے۔ اس نے اب تک شادی نہیں کی۔ اس کے ماں باپ بیرون ملک مقیم ہیں۔ اسے اپنے پروفیشن سے عشق ہے۔ وہ محبت، عشق جیسی خرافات پر یقین نہیں رکھتی۔ اُسود علی روایتی عاشقوں کی طرح ہر جگہ اپنا دل لیے اس کے آگے کھڑا رہتا ہے۔ علیشہ اس کے اس سڑک چھاپ اسٹائل سے زچ ہے اور اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ زرغام بخاری، اُسود اور علیشہ کا دوست ہے۔ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا سربراہ ہے۔ وہ اور اس کی بیوی نادیہ کو اولاد کی صورت خدا نے آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ زرغام اور نادیہ دونوں ہی بہت فکرمند ہیں۔ ان کے جڑواں بچے سہک اور فلک ہیں اور دونوں ہی انتہائی کمزور اور ایک حد تک ابنارمل ہیں۔ نادیہ ان کی زندگی کے تار جوڑنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہے۔ بچوں کی نگہداشت کے لیے سوزین نامی ایک فل ٹائم Maid موجود ہے۔ گھر کی ماسی نے سہک اور فلک کی پریشانی بھانپ کر پیر شاہ کے ڈیرے تک نادیہ کو پہنچا دیا ہے۔ اب نادیہ پیر شاہ صاحب کی مرید گی میں آچکی ہے۔ کہانی کا ایک کردار تابندہ بھی ہے۔ تابندہ غربت کی چکی میں پسنے والے ایک گھر کی کفیل ہے۔ زرغام بخاری کی پرسنل سیکریٹری کے فرائض انجام دینے والی تابندہ ایک بہن اور بھائی کی خواہشات اور ضروریات کے تحت اپنی زندگی کو ان کے لیے وقف کر چکی ہے۔ زرغام بخاری اور تابندہ کے درمیان ایک غمگسار والا رشتہ بھی موجود ہے۔ تابندہ اپنے باس کا بہت خیال رکھتی ہے جب کہ زرغام بھی تابندہ کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اُسود علی اور علیشہ کا ٹکراؤ تو اکثر ہوتا رہتا ہے جو ہمیشہ علیشہ کے لیے ناخوشگوار ثابت ہوتا ہے۔ دوسری طرف زرغام بخاری کے گھر میں نادیہ نے پیر شاہ کے تعویذوں اور تبرکات وغیرہ سے اپنے آپ کو کسی ان دیکھی زنجیر میں قید کر لیا ہے۔ ماسی اپنی مالکن کا پیسہ پیر شاہ کے ڈیرے پر دل کھول کر لٹوا رہی ہے۔ زرغام بخاری کا دل بیوی کی ان حرکتوں سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ اس نے آفس میں موجود سیکریٹری تابندہ کی توجہ پا کر اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ تابندہ کو بھی حالات کے پیش نظر ایسے ہی کسی سہارے کی تلاش تھی۔ انصاری ہاؤس میں نائلہ کی ہٹ دھرمیاں جاری ہیں۔ زریں بیگم ہر طرح سے اُسود علی اور نائلہ کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے نائلہ کے کھونٹے کو مضبوط کرنے کی تگ و دو میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتی ہیں۔ دوسری طرف تابندہ کا باپ اپنے بڑے بھائی سے ملنے لگا ہے۔ اس کی ماں، حمیدہ کو خدشات نے آگھیرا ہے۔ یہ ملاپ انہیں خطرے کی گھنٹی کا احساس دلا رہا ہے۔ زرغام بخاری کو نادیہ، اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر نفسیاتی ڈاکٹر فرقان حمیدی کے پاس لے جاتی ہے۔ زرغام کی برنس پر بے تو جہی اب آفس والے بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ علیشہ بھی زرغام کی اس کیفیت پر پریشان ہے۔ نادیہ کا شاہ پیر پر یقین پختہ ہو رہا ہے اور وہ اس کے گھر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ علیشہ کا اُسود علی سے ہنوز ٹکراؤ جاری ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اُسود علی کے لیے قطعاً سنجیدہ نہیں ہو پا رہی۔ تابندہ نے گھر کی موجودہ صورت حال پر زبان کھولی تو باپ رشید علی کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ اپنے بھائی کے بیٹوں سے زبردستی تابندہ اور ردا کا نکاح پڑھوانے کی دھمکی دے کر گھر سے نکل گیا۔ زرغام بخاری اور نادیہ کے درمیان رشتوں کی خلیج حائل ہونے لگی ہے۔ سوزین، نادیہ کی بچوں پر عدم توجہی کی بابت پریشان ہے اور پھر وہ بچوں کی وجہ سے پریشان ہو کر ڈاکٹر ثمائلہ باقر کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ علیشہ پریشان ہے کہ آخر اُسود علی کی اس میں دلچسپی کیوں جنون کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ایک شادی شدہ آدمی سے اس طرح کی وابستگی اس کے لیے سوہانِ روح بن چکی ہے۔ زرغام شدید ذہنی اذیت سے دوچار ہے۔ نادیہ کسی صورت شاہ پیر کے چنگل سے نکلنے پر آمادہ نہیں۔ اُدھر حمیدہ اور رشید احمد میں ٹھن گئی ہے۔ حمیدہ بچیوں کے مستقبل کے لیے کسی سمجھوتے پر تیار نہیں۔ یہ صورت حال تابندہ کے لیے بھی پریشان کن تھی۔ اس نے زرغام سے ملنے کا فیصلہ کیا اور..... تابندہ، زرغام سے اپنی پریشانی کہنے آئی تھی مگر اُس کے اپنے مسائل نے اُسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔ نادیہ پوری شدت سے پیر شاہ کے چنگل میں پھنس چکی ہے۔ زریں بیگم کو اُسود علی کے فارن ٹور کی بھنک پڑ چکی تھی۔ اس بار وہ اپنا داؤ چلنے میں کامیاب ہو گئیں اور نائیلہ کو اس کے ساتھ بھیجنے پر راضی کر لیا۔ پیر شاہ نادیہ کی انکیسی میں مصروف تھے۔ نادیہ کی آنکھ کھل گئی اور ڈر کے مارے وہ بے ہوش ہو گئی۔ زرغام کے لیے یہ صورت حال بالکل

اچانک تھی۔ علیشہ بھی مجبوراً فارن ٹور پر اُسود کے گروپ میں شامل ہے۔ تابندہ کے تایا اپنے بیٹوں کا رشتہ لے کر اُس کے گھر پہنچ گئے۔ پیر شاہ اس بار نادیہ سے موٹی رقم ہتھیانے میں کامیاب ہو گیا مگر زرغام بخاری اور نادیہ کے بیچ میں ایک بے اعتمادی کی خلیج حائل ہو چکی ہے۔ سوزین، سہک اور فلک کے معاملے میں اب پیر شاہ کے علاج کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زرغام کی شہہ پر دوبارہ سے کنسلٹنٹ سے رابطے میں ہے۔ اِدھر تابندہ اور زرغام کے درمیان بھی بے اعتباری کی دیوار گر چکی ہے اور زرغام تابندہ سے اپنی اُنسیت اور وارفتگی کا اظہار کر کے اُس کے تمام خدشات دور کر دیتا ہے۔ خالد عظیم کے دفتر میں علیشہ اور اُسود کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ اُسود کو پھر سے بے عزت کر دیتی ہے۔ اُسود کو پہلی بار اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ علیشہ کے دل میں بھی پہلی بار اپنے ہتک آمیز رویے کا احساس جاگتا ہے۔ ایئر پورٹ نکلنے سے قبل اچانک علیشہ کے دروازے پر بیل بجتی ہے۔ وہ دروازہ کھولتی ہے تو سامنے اُسود کو کھڑے پا کر اُسے غصہ تو آتا ہے مگر وہ پی جاتی ہے۔ اُسود نائلہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے بجائے، اُس کے بھائیوں کے پاس دبئی چھوڑ آیا۔ اُسود اپنی اس جرأت پر خود بھی حیران تھا، نائلہ سے یہ خبر جب زریں بیگم تک پہنچی تو وہ اس حکم عدولی پر انگاروں پر لوٹنے لگیں اور اُسود علی کو مزا چکھانے کا فیصلہ کر لیا، تابندہ، ردا سے اُس لڑکے کا نمبر لے لیتی ہے جسے وہ پسند کرتی ہے اور پھر اُس سے بات کرنے کا سوچتی ہے۔ نادیہ، زرغام کے اچانک مطمئن رویے سے پریشان ہے۔ فارن ٹور پر علیشہ اور اُسود کی نوک جھونک جاری ہے لیکن علیشہ کے رویے میں ایک حد تک نرمی آچکی ہے۔ زریں بیگم، نائلہ کے ساتھ پیر شاہ جی تک پہنچ چکی ہیں۔ تاکہ کسی بھی طرح اُسود، نائلہ کے اشاروں پر ناچ سکے۔ پیر شاہ جی نے انہیں کچھ تعویذ دیے ہیں جنہیں لے کر وہ گھر آگئیں۔ تابندہ، ردا کے کہنے پر نوید سے ملنے ایک ریسٹورنٹ پر پہنچ جاتی ہے مگر نوید نہیں آتا اور وہ روا پر برستی اُسے واپس گھر لے آتی ہے۔ زرغام اور تابندہ اپنی محبت پر مطمئن ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ تابندہ کی ماں اور باپ اُس کے تایا کے بلانے پر اُن کے گھر جاتے ہیں۔ تابندہ کے رشتے پر رشید احمد دوٹوک الفاظ میں فی الحال انکار کر دیتا ہے جس پر حمیدہ حیران رہ جاتی ہے۔ اُسود علی کا اپنے فرینڈ کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ زرغام تک بھی یہ خبر پہنچتی ہے، وہ فکرمند ہے۔ علیشہ سے رابطہ کر کے وہ اُسے تسلی دیتا ہے کہ وہ کسی چیز کی ٹینشن نہ لے اور پرابلم ہے تو اُسود کو واپس بھیج دے۔ علیشہ اُسے مطمئن کر دیتی ہے کہ وہ سب کچھ آسانی سے Manage کر لے گی۔ نائلہ تک بھی T.V کے ذریعے یہ خبر پہنچتی ہے۔ وہ خوش ہے۔ زریں بیگم اسے پیر شاہ کی کرامت گردانتی ہے۔ ردا، تابندہ سے دوبارہ نوید سے ملنے کے لیے کہتی ہے جس پر وہ سختی سے منع کر دیتی ہے اور اُسے بھی نوید سے دور رہنے کی نصیحت کرتی ہے۔ سوزین ڈاکٹر کے کہنے پر پیر شاہ کی دی گئی دوا کا Test کرنے کے لیے انہیں دوا دیتی ہے جس کی رپورٹ ڈاکٹر اور سوزین کو حیران کر دیتی ہے کیونکہ دوا میں ڈرگز کی نشاندہی ہوتی ہے اور پھر..... **اب آپ آگے پڑھیے:**

حمیدہ کی تھکن اُس کے لہجے و رویے کو کڑوا کر گئی۔

''اری! کبھی تو آرام سے بھی کوئی بات سُن لیا کر۔'' رشید احمد کے چہرے پر آتا کسی خوشی کا رنگ ماند پڑ گیا اور وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''آرام سے ہی تو پوچھ رہی ہوں۔ کیا میں نے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے، جو چلا کر محلے بھر کو سنا رہے ہو۔'' حمیدہ کے لہجے میں پھر سے بے زاری عود کر آئی۔

''محلے کو کہاں میں تو تمہیں بتانے کو دوڑا آیا ہوں۔ تمہیں پتا ہے بھائی جی پہلے ردا کی شادی کے لیے مان گئے ہیں۔''

''اچھا! واقعی؟'' حمیدہ کے چہرے کا تاثر بھی یکدم بدل گیا۔ ردا کی شادی کا تو اُس پر بھی جنون سا سوار رہنے لگا تھا۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کل کے بجائے آج ہی اُسے چلتا کرتی اور خود پُرسکون ہو جاتی۔ ردا سے اُسے عجیب سا دھڑکا رہنے لگا تھا۔

''ہاں..... ہاں بھائی جی نے اپنے بال بچوں سے مشورہ کیا ہے۔ اُن کے بڑے بیٹے کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پہلے چھوٹے بھائی کی شادی ہونے پر۔'' رشید احمد نے گرمجوشی سے بتایا تو حمیدہ نے بھی شکر کا سانس لیا۔

"چلو شکر ہے۔ یہ معاملہ تو نمٹا۔ کب تک آرہے ہیں تمہارے بھتیجے۔" حمیدہ شکر کا کلمہ پڑھتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اگلے مہینے کے شروع میں ہی آجائیں گے۔ بس جب تک تم اپنی تیاری پوری کرلو۔ میں نے بھائی جی سے کہہ دیا ہے کہ ہم نے لمبی چوڑی تفصیلوں اور تاریخوں میں نہیں پڑنا۔"

"ہاں..... ہاں فکر نہ کرو۔ ہو جائے گی تیاری۔ میں تابندہ سے کہوں گی کہ اپنے دفتر سے شادی کے لیے کچھ اُدھار لے لے۔"

"ہاں تابندہ ہی کچھ کرے گی۔" رشید احمد کے چہرے پر ایک دم ملال سا بکھر گیا۔ افسردگی اُس کے پورے وجود سے جھلکنے لگی تھی۔

"اچھا اب فکر نہ کرو۔ اللہ مالک ہے۔ میں تمہارے لیے روٹی لاتی ہوں۔ تم ہاتھ دھو کر آؤ۔" حمیدہ کو اُس کی افسردگی نے شرمندہ کر دیا تھا۔ کچھ بھی تھا آخر وہ اُس کی بیوی تھی۔ کمرے سے باہر آتی رداء، ماں اور باپ کی باتیں سُن کر پاؤں پٹختی واپس کمرے میں چلی گئی تھی۔

☆.....☆

"سب بکواس ہے۔ جھوٹ ہے یہ۔" نادیہ کا ردِعمل بے ساختہ اور بے یقین تھا۔ سوزین کی اطلاع نے نہ صرف اُسے برہم کر دیا تھا بلکہ اُسے بالکل بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ اُس کے بچوں کی رپورٹ میں ثابت ہو چکا ہے کہ بچوں کو افیون یا حشیش دی جارہی ہے۔

"میڈم Fact is Fact میڈیکل رپورٹ سے یہ بات Prove تو ہو چکی ہے۔ پھر بھی آپ کو Doubt ہے تو آپ اپنے شاہ صاحب کی دی ہوئی میڈیسن کا لیبارٹری Test کروالیں۔" سوزین نے بہت ہمت کر کے اپنا موقف بیان کیا تھا۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی کہ کسی طرح نادیہ قائل ہو جائے۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ اتنے نیک اور پہنچے ہوئے بزرگ پر شک کرنے کا انجام جانتی ہو کیا ہوگا؟" نادیہ سنتے ہی بھڑک اُٹھی۔ "صرف اُن کی وجہ سے میرے بچوں کی طبیعت سنبھلی ہے۔ اُن میں Movement ہوئی ہے اور تم مجھے مشورہ دے رہی ہو کہ میں..... نہیں مجھے شاہ جی پر پورا اعتماد ہے۔" نادیہ کا اٹل اور پُریقین انداز و لہجہ سوزین کو چپ کرا گیا۔ نادیہ نے کچھ لمحوں کے بعد مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے سوزین کو مخاطب کیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم میرے بچوں کو یہ زہر دے رہی ہو اور الزام.....؟ یقیناً تم ہی ایسا کر رہی ہو؟" نادیہ کا الزام سوزین کو نہ صرف تڑپا گیا بلکہ وہ بدک کر کھڑی بھی ہوگئی۔

"میڈم آپ مجھ پر شک کر رہی ہیں۔ میں پانچ سال سے آپ کے بچوں کی دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ آپ سے زیادہ خیال رکھا ہے میں نے اُن کا اور آپ..... مجھے ہی....." سوزین انگریزی میں ساری بات کہتی کہتی رو پڑی۔ "خدا جانتا ہے میں نے اپنے پیشے اور عمل میں کبھی بددیانتی نہیں کی۔"

"ہر مجرم پکڑے جانے پر ایسے ہی دہائی دیتا ہے۔ تم میرے بچوں کی دشمن نکلو گی مجھے پتا نہیں تھا۔ شاہ صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ میں نے سانپ خود پال رکھے ہیں۔ مجھے پہلے کیوں خیال نہیں آیا کہ تم بے دین ہو۔ اپنی منافقت سے ہمیں ہی نقصان پہنچا سکتی ہو۔ یا اللہ! یہ کیا ہو گیا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ مجھے تم جیسی عورت کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ نکل جاؤ اسی وقت۔" نادیہ جیسے اپنے آپ میں نہیں رہی تھی۔ اک جنون سا اُس پر سوار ہو گیا تھا۔

ذیابیطس اور روزہ

رمضان کے روزوں کے حوالے سے دبئی کے این ایم سی اسپیشلیٹی ہاسپٹل میں کنسلٹنٹ اینڈوکرائنولوجسٹ ڈاکٹر علاؤالدین محمود نے ذیابیطس کے مریضوں کو مشورہ دیا ہے کہ ٹائپ ون ذیابیطس کے ایسے مریض جنہیں دن میں کئی بار اپنا بلڈ شوگر لیول چیک کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ان کے لیے روزہ رکھنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس لیے انہیں یہ مشورہ دینا چاہیے کہ وہ روزہ نہ رکھیں، تاہم ٹائپ ون ذیابیطس کے مریض اگر افطار اور سحر کے درمیان اپنی انسولین کی خوراک ایڈجسٹ کرنے کے قابل ہو جائیں تو وہ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ٹائپ ٹو ذیابیطس کے مریضوں کے لیے مشورہ ہے کہ وہ اپنے اصل کھانے کے فوراً بعد دوائیں لے لیں۔ یہ کھانا زیادہ تر لوگ افطار کے بعد کھاتے ہیں۔ لیکن اگر سحری کے وقت دوا کھائی جائے تو اس کی خوراک آدھی ہونی چاہیے کیونکہ ہمیں اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ دوسرے دن کہیں ان کا بلڈ شوگر لیول گر نہ جائے۔ جو صحت بخش اور متوازن غذا وہ رمضان سے پہلے کھاتے رہے ہیں اُسے افطار اور سحر میں برقرار رکھنا چاہیے اور خاص طور پر افطار کے موقع پر کاربوہائیڈریٹ اور چکنائی سے لبریز غذاؤں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ افطار کے موقع پر ہلکی پھلکی چیزوں مثلاً کھجور اور سوپ سے روزہ کھولیں، پھر ایک گھنٹہ بعد کھانا کھائیں اور آخر میں سحری بھی ہلکی پھلکی غذاؤں پر مشتمل ہونی چاہیے۔

سوزین کچھ لمحے کھڑی حیرت سے اُسے تکتی رہی پھر اپنے آنسو پیتی وہاں سے نکل آئی۔

☆.....☆

علیشہ اسٹیج کے پیچھے کنٹرول روم میں اپنی ٹیم کے ساتھ تمام انتظامات دیکھ رہی تھی۔ کئی ملکی چینلز اس شو کی کوریج کر رہے تھے۔ ایک بڑا اور مشہور چینل اس شو کو Live دکھا رہا تھا۔ علیشہ اور اُس کی ٹیم اُس چینل کے لیے بھی کام کر رہی تھی۔ سارے تکنیکی ماہرین اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔

شو کی ابتداء میں ہی کنٹرول روم سے باہر علیشہ کو کسی نے بلاوا بھیجا تو وہ ناچار باہر چلی آئی۔ بلانے والی شخصیت کو دیکھ کر نہ صرف وہ حیران ہوئی بلکہ پریشان بھی۔

"تم.....؟ یہاں..... کیسے....." علیشہ نے بے ساختہ پوچھا۔

"کیا؟ کیوں؟ کیسے کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے، تمہاری خاطر" سر پر لگی چوٹ اور ٹوٹی ہوئی کلائی کی تکلیف اور مخدوش جسم کی اکڑاہٹ کے باوجود اسود علی کی مسکراہٹ بڑی دلکش تھی۔

"Are you carzy۔ ہاسپٹل سے تمہیں آنے کی پرمیشن کس نے دی؟" علیشہ کے چہرے پر مسلسل حیرت رقصاں تھی۔ وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ اتنی چوٹوں کے باوجود وہ اُٹھ کر یہاں تک چلا آیا تھا۔

"وہاں مجھ سے رہا نہیں جا رہا تھا اور پھر اس ایونٹ میں میرا ہونا بھی تو ضروری تھا نا۔" اسود نے جلد ہی اپنی بے خودی پر قابو پا کر معقول جواز دیا۔

"سارا پروگرام سیٹ ہو چکا ہے۔ اینکرز کو اسکرپٹ دیا جا چکا ہے۔ تمہاری Entery اب کہیں نہیں ہو سکتی۔ ویسے بھی تم اس حالت اور حلیے میں پروگرام میں شامل ہو کر کیا کرو گے؟ میری مانو تو جا کر اپنے روم میں Rest کرو۔ ہم تمہیں پروگرام کی ریکارڈنگ دکھا دیں گے۔" علیشہ نے اپنے طور پر اُسے قائل کر کے بات ختم کر دی۔

"مجھے ریکارڈنگ نہیں دیکھنی اور تمہارے لیے تو یہ ناممکن نہیں ہے۔" اسود علی بضد تھا۔

"میں نے ایسا کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا اور پلیز تم میرا ٹائم ویسٹ مت کرو۔" علیشہ زچ ہوئی۔ اسود اُس کی

کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''تم چاہتی ہی نہیں ہو کہ پڑوسی ملک کی حسین، مہ جبین ماڈلز اور ایکٹریس مجھ سے Impress ہوں۔'' اُسود نے اُسے تپانے کی کوشش کی۔

''کیا کہا؟ میں نہیں چاہتی؟ میری بلا سے تم کسی کو بھی Impress کرو اور سنو میرے حوالے سے ساری خوش فہمیاں اپنے دل سے نکال دو۔ میری سوچوں میں بھی تمہارا گزر نہیں ہے۔'' علیشہ پاؤں پٹختی پلٹی اُسی لمحے پروگرام ڈائریکٹر بھی کنٹرول روم کے دروازے سے نمودار ہوا۔ اُسود کو باہر کھڑا دیکھ کر وہ بھی حیران ہوا۔ اس پروگرام کو کافی انڈسٹریلسٹ کی سپورٹ بھی تھی، جس میں اُسود بھی شامل تھا۔

''اُسود تم؟ یار تمہیں تو Rest کرنا چاہیے۔''

''اُسود علی کو Rest کی نہیں غیر ملکی حسینا ؤں سے ملنے کی ضرورت ہے۔ آپ انہیں اُن سے ملوا دیں گے تو موصوف کی ساری حسرتیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔'' علیشہ نے پلٹ کر جلبلاتے ہوئے جواب دیا تو پروگرام ڈائریکٹر آفاق خورشید بے ساختہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''یہ بات ہے یار۔ فکر نہ کر تیری Meeting کروا دوں گا۔ تُو پہلے اپنی حالت تو درست کر لے۔ اگر ایسے ہی ملنا ہے تو آجا۔'' آفاق خورشید اُسے اپنے ہمراہ لے کر کنٹرول روم میں چلا گیا۔ علیشہ اُسے گھورتی رہ گئی۔

☆.....☆

''امی آپ اور ابو جو سوچ رہے ہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' ردا رشید احمد کے لیٹنے کے بعد دوپہر کے کھانے کے برتن دھوتی حمیدہ کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔ ردا نے کافی دنوں سے ماں کا خیال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ حمیدہ زیادہ تر کام خود ہی کرنے لگی تھی۔

''اور تُو جو سوچ رہی ہے کیا وہ ہو جائے گا؟'' حمیدہ نے سر اُٹھا کر دھیمے مگر تلخ لہجے میں کہا تھا۔

''ہاں میں کر کے رہوں گی۔ آپ سب دیکھ لینا۔ ورنہ اپنی جان دے دوں گی۔'' ردا نے بپھرتے ہوئے دھمکایا تو حمیدہ یکدم کھڑی ہو گئی۔

''اچھا؟ اتنی بے غیرت ہو گئی ہے تُو کہ ماں باپ کی عزت کا تجھے ذرا خیال نہیں ہے اور اپنے یار کے لیے جان دینے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ آجا میں ہی تیرا بھوت نہ اُتار دوں۔ مرنے کا مزا چکھا دوں تجھے۔'' حمیدہ کو نہ جانے کیا ہوا تھا اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھک کر روٹی بیلنے والا بیلن اُٹھایا اور تاڑ تاڑ اُسے مارنا شروع کر دیا۔

ردا کو حمیدہ سے ایسی توقع نہیں تھی کندھوں اور بازوؤں پر پڑتی ضربوں نے اُسے پہلے تو بوکھلا دیا، اپنے بچاؤ کے لیے پیچھے بنتی ہوئی صحن کی طرف آئی۔ حمیدہ کی زبان بھی تابڑ توڑ گالیاں اُگلتی اُسے جنونی انداز میں مارنا شروع تھی۔ رشید احمد بھی گھبرا کر اُٹھا اور پھر سارا منظر دیکھ کر بے اختیار حمیدہ کی طرف بڑھا۔

''حمیدہ..... حمیدہ..... بس کر، جوان لڑکی کو مارے گی کیا؟ لوگ کیا کہیں گے۔'' رشید احمد نے پہلے زبان سے روکا پھر بڑھ کر بیلن چھین لیا۔ ردا ڈھیٹ بنی کھڑی تھی۔

''لوگ تو بہت کچھ کہیں گے رشید احمد۔ یہ..... یہ لڑکی تجھے اور مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔ تُو مجھے کہیں سے زہر لا دے۔ میں وہ دن دیکھنے سے پہلے مرنا چاہتی ہوں۔'' حمیدہ دہائیاں دیتی، بین کرتی فرش پر ہی بیٹھ گئی۔ رشید احمد نے ایک نظر پہلے حمیدہ کو دیکھا اور پھر ردا کو۔

''زہر تجھے کیوں..... زہر میں اسے اپنے ہاتھوں سے دوں گا۔ ایسی اولاد کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ کان کھول کے سن لے حمیدہ آج کے بعد یہ لڑکی نہ گھر سے باہر جائے گی اور نہ چھت پر ورنہ.....'' رشید احمد کو بھی جلال آ گیا تھا۔

''دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔'' رشید احمد نے بڑی مدت کے بعد اس طرح غصے میں دیکھا تھا۔ ردا باپ کی دھاڑ سن کر ہی لرزنے لگی تھی۔ کچھ بھی تھا ابھی اُس میں کچھ شرم باقی تھی۔

☆.....☆

''یا خدا!! اتنا بڑا الزام.....؟ میڈم نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں سوچا کہ میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔ اتنے معصوم اور چھوٹے بچوں پر ایسا ظلم اور میں..... او خدا! یہ سب مجھ کو سنوانے سے پہلے موت ہی دے دیتا۔'' سوزین اپنے کمرے میں بستر پر سر جھکائے بیٹھی آنسوؤں کے ساتھ اپنے خدا سے مخاطب تھی۔ اُسے سخت دھچکا لگا تھا۔ اُسی لمحے نادیہ اُس کے کمرے میں بنا دستک داخل ہوئی۔ سوزین بے ساختہ متوجہ ہوئی۔ اُس کے آنسو آنکھوں میں ہی جم گئے۔ نادیہ نے آتے ہی اُس کے قریب ایک چیک پھینکا اور پھر اُس سے مخاطب ہوئی۔

''میں نے تمہارا حساب کر دیا ہے۔ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ شام تک تم مجھے یہاں نظر نہ آؤ۔'' نادیہ کا رویہ اور انداز غصے بھرا تھا۔

''میڈم آپ ایموشنلی ڈسیجن لے رہی ہیں۔ پلیز ایک بار ذرا غور سے سوچیں تو سہی۔ میں ایسا کیوں کروں گی۔ یہ بچے مجھ کو بھی پیارے ہیں میڈم۔ میں اُن کے ساتھ.....'' سوزین اُس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر نادیہ نے اُس کی ایک نہیں سنی۔

''بس مجھے کچھ نہیں سننا۔ میں اپنے بچوں کی دشمن کو ایک اور موقع دے کر اپنے بچوں کی زندگی سے نہیں کھیل سکتی۔ تم اِس قدر سفاک اور ظالم ہو گی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے تم پر بھروسہ کیا اور تم.....'' نادیہ کی سوچیں اور ذہن اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ سوزین ہی اُس کے بچوں کو نشہ آور دوا کھلاتی ہو گی۔

''میڈم میں خدا کی قسم کھاتی ہوں کہ میں نے.....''

''خبردار جو تم نے میرے سامنے جھوٹی قسم کھائی۔ بس اب تم نکل جاؤ ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے بھی کر سکتی ہوں۔ میرا ظرف دیکھو کہ میں تمہیں ایسے ہی جانے دے رہی ہوں۔ ورنہ پیر صاحب تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں اُن کے حوالے کر دوں۔ وہ خود تمہیں پولیس کے حوالے کریں گے۔ خدا کے لیے میری نظروں کے سامنے سے چلی جاؤ ورنہ.....'' نادیہ واقعی جنونی ہو رہی تھی۔ بولتے بولتے تھک کر وہ اُس کے کمرے سے نکل گئی۔ سوزین کے پاس یہاں سے جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

☆.....☆

تمام سلیبریٹیز کے فوٹو شوٹ بیک اسٹیج پر بھی جاری تھے اور علیشہ اس کام میں پیش پیش تھی۔ علیشہ سبھی اداکاروں اور مہمانِ گرامی کی انفرادی و اجتماعی تصویریں لینے میں مصروف تھی کہ اچانک اُس کے کیمرے کے سامنے اُسود چلا آیا۔

''It's not fair Alisha۔ تمہارا کیمرہ یہاں سبھی پر Focus ہے سوائے میرے۔ تم صرف میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو؟'' علیشہ نے کیمرہ بند کر کے دوسری طرف قدم بڑھائے تو اُسود اُس کے پیچھے لپکے

ہوئے خفگی بھرے لہجے میں کہا تو وہ یکدم پلٹ کر اُسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔

''آخر تمہیں تکلیف کیا ہے۔ میرا کیمرہ کسی پر بھی Focus رہے تم مجھ پر الزام لگانے والے کون ہوتے ہو اور تمہیں ایک بات بتا دوں، میرے کیمرے میں آنے کے لیے پہلے خود میں وہ Quality پیدا کرلو، پھر مجھ سے بات کرنا۔'' علیشہ کو اُس کی مداخلت نے تپا دیا تھا۔ اُسود مسلسل اُسے زچ کر رہا تھا۔ اب اُس کی برداشت جواب دے گئی تھی، تبھی وہ اِس لب و لہجے میں اُس کے ساتھ مخاطب تھی۔

''اگر جوہری ہی ہیرے کی پہچان نہ رکھتا ہو تو دنیا بھی ہیرے کو پتھر ہی سمجھے گی نا۔'' اُسود نے جیسے اُسے چڑایا۔

''اگر تم واقعی ہیرا ہو تو اپنی بات Prove کرو۔ میرا سر مت چھوڑو پلیز۔''

''اگر مجھے ہی Prove کرنا ہے تو پھر جوہری کا کیا کام ہے۔'' اُسود نے اُسے لاجواب کرنے کی کوشش کی۔ اردگرد کے لوگ بھی اب اُن کی طرف متوجہ تھے۔ ایک دو ماڈلز بھی شوٹس کے لیے تیار تھیں۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو اُسود علی...... Really میں تمہیں سمجھ نہیں پائی۔'' علیشہ واقعی بے بس سی ہوگئی تھی۔ زخمی حالت میں پٹیوں میں، جکڑا انسان اِس وقت کوئی جنونی لگ رہا تھا۔ علیشہ اتنے بڑے موقع پر اپنی ذات سے متعلق دنیا کو کوئی اسکینڈل نہیں دینا چاہتی تھی۔

''میری پہلی خواہش، میرے ساتھ اچھے سے ماحول میں بیٹھ کر ایک کپ کافی پی لو۔ اس سے زیادہ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔'' اُسود کا وہی پہلے روز والا انداز و رویہ...... علیشہ اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ چاہتی تو ایک بار پھر انکار کرسکتی تھی مگر کچھ سوچ کر اُس نے ہامی بھرلی۔

''اوکے کل شام میں تمہارے ساتھ چائے پینے کے لیے تیار ہوں۔''

''Thanks a lot......Thanks.....Really!'' اُسود کے چہرے پر خوشی کے کئی دیپ سے جل اُٹھے تھے۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ علیشہ اتنی آسانی سے اچانک مان جائے گی۔

علیشہ اُسے وہیں چھوڑ کر پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوچکی تھی جب کہ اُسود ایک طرف بیٹھ کر آنے والے دن کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔

☆......☆

زرغام بخاری اپنے کسی کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھا، جب اُسے کسی خاتون کی آمد کی خبر دی گئی۔ ویسے تو تابندہ اس قسم کی مداخلت نہیں کیا کرتی تھی مگر سوزین کے اصرار نے اُسے مجبور کردیا تھا۔ زرغام نے اُس کی مداخلت پر خاصی ناپسندیدگی سے ڈانٹ دیا تھا۔

''مس تابندہ آپ کو اگر Rules & manners معلوم نہیں ہیں تو آپ کا وہاں بیٹھنے کا کیا فائدہ؟''

''سر! I am sorry۔'' تابندہ نے ڈانٹ سن کر انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا۔ پھر پاس کھڑی سوزین سے مخاطب ہوئی۔

''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ سر میٹنگ میں ہیں۔ اگلے دو گھنٹے تک وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔ پلیز آپ پھر آجایئے گا یا پھر اُن کے لیے میسج چھوڑ دیں۔'' تابندہ نے اپنی اخلاقیات کا دامن نہ چھوڑا اور شستہ لہجے میں سوزین کو مخاطب کیا۔

''سر کو یہ نمبر دے دیجیے گا پلیز۔ انہیں جب بھی فرصت ملے مجھے کال ضرور کریں۔ مجھے انہیں کچھ انفارمیشن

دینی ہے۔'' سوزین نے اپنا سیل نمبر نام کے ساتھ چٹ پر لکھ کر اُسے تھمایا تو تابندہ نے چٹ لے کر احتیاط سے دراز میں رکھ لی۔

سوزین کے چہرے پر پھیلی مایوسی نے تابندہ کے دل میں ہمدردی سی پیدا کردی تھی۔ نہ جانے وہ زرغام سے کس ضرورت کے تحت ملنا چاہتی تھی۔ تابندہ کی نظریں اُسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

☆......☆

''سنو نائلہ آج رات سے پہلے ہی کسی بہانے اُسود کے سرہانے وہ تعویذ رکھ آؤ۔'' زریں بیگم نے بہانے سے نائلہ کو چہل قدمی کے لیے بلوایا تھا۔ اصل معاملہ تو تعویذات کے بارے میں گفت و شنید کا تھا۔ دونوں اس وقت لان میں ساتھ ساتھ ٹہل رہی تھیں۔

سنبل کو دونوں کے اس نئے معمول پر حیرت بھی تھی اور تجسس بھی۔ ابھی اُس کے ذہن سے رات والا واقعہ محو نہیں ہوا تھا۔ دونوں کا آدھی رات کو اکٹھے گھر میں داخل ہونا۔ سنبل کچن کی کھڑکی سے انہیں دیکھ تو رہی تھی مگر اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو سے محروم تھی۔ البتہ اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ دونوں کسی نئی سازش میں مشغول ہیں۔ نہ جانے کس کی شامتِ اعمال آنے والی تھی۔

''مگر پھوپو! میں اِدھر انیکسی میں کیسے جاؤں گی۔'' نائلہ نے عذر تراشا، چہرے پر کچھ بے زاری سی بھی تھی۔

''بی بی! اپنے پیروں سے جاؤ گی اور کیسے جاؤ گی۔'' زریں بیگم کو اُس کا جواب پسند نہیں آیا تھا۔

''مم...... میرا مطلب ہے پھوپو...... میں اکیلی جاؤں گی؟''

''نہیں سارے گھر کو جمع کر کے لے جاؤ۔ بے وقوف لڑکی کبھی تو عقل سے کام لیا کرو۔ کچھ باتیں اپنے سائے سے بھی چھپا کر رکھنی چاہئیں۔'' زریں بیگم چلتے چلتے رک گئیں اور خفگی سے کر اُسے جواب دیا۔

''پھوپو...... مجھے وہاں ڈر لگے گا اور...... پھر کسی نے مجھے تعویذ رکھتے پکڑ لیا تو......'' نائلہ نے اپنے خوف کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ زریں بیگم ماتھا پیٹ کر رہ گئیں۔

''واقعی تم بے عقل ہو۔ شوہر کو پانے کے لیے ذرا سی مشقت نہیں ہوتی تم سے اور چلی ہو اُسے مٹھی میں کرنے۔''

''میں صحیح تو کہہ رہی ہوں پھوپو۔ مجھے انیکسی میں جاتے کسی نے دیکھ لیا اور اُسود کو بتا دیا تو؟'' وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

'کوئی تمہیں اِدھر جاتے دیکھ بھی لے گا تو کیا ہے؟ آخر تم اُسود کی بیوی ہو۔ وہاں جاسکتی ہو اور اب یہ بزدلی چھوڑ دو۔ جاؤ ابھی یہ کام کرو۔'' زریں بیگم نے زبردستی اُسے اندر کی طرف دھکیلا تا کہ وہ اپنے کمرے سے تعویذات لا کر انیکسی میں جاسکے۔

نائلہ بادلِ نخواستہ اندر کی طرف چلی آئی۔ تھا تو یہ مشکل عمل مگر آخر اُسے یہ کر گزرنا تھا اور بقول زریں بیگم کے بہت محتاط ہو کر۔

☆......☆

'یا اللہ! کیا کروں؟ میرے ماں باپ ہی میری بات نہیں سمجھ رہے۔ ایک جہنم سے نکال کر مجھے دوسرے جہنم میں پھینکنا اُن کے لیے کتنا آسان ہوگیا ہے۔' ردا کمرے میں آکر مسلسل رونے میں مشغول تھی۔ اتنی تکلیف

اُسے اپنی ماں کی مار کی نہیں تھی جتنا دُکھ اُسے اُن کے رویے اور فیصلے کا تھا۔ چارپائی پر بیٹھ کر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے روتے سسکتے اور مسلسل سوچتے ہوئے نہ جانے اُسے کتنی دیر ہوگئی تھی۔ اُس کے اندر ایک طوفان سا اُٹھ رہا تھا۔ جو اپنے ساتھ بھی کچھ بہالے جانے کا اشارہ دے رہا تھا۔

'میری خوشی...... میری زندگی کے سکھوں کی انہیں کوئی پروا ہی نہیں ہے۔ ساری زندگی محرومیاں دے کر، ایک ایک چیز کو ترسا کر، پھر سے مجھے ترسنے، تڑپنے کے لیے آگے بھیج رہے ہیں۔ کیا ملے گا آخر، وہی سب کچھ جو ابو نے امی کو دیا۔ طعنے، کوسنے اور بے بسی...... میں...... میں ایسی زندگی نہیں جیوں گی۔ اگر ان لوگوں نے اب میرے ساتھ کوئی زبردستی کی تو...... میں...... میں انہیں چھوڑ جاؤں گی۔ ہاں! یہاں سے چلی جاؤں گی میں۔ پھر کبھی ان کی شکل نہیں دیکھوں گی۔ کبھی نہیں۔'

ردا نے بڑی بے دردی سے اپنے آنسو پونچھے۔ اُس کے چہرے پر اُس کے اٹل ارادوں کی سختی پھیل گئی تھی۔

☆......☆

''اُف...... یار آج بہت تھک گیا ہوں۔'' زرغام بخاری نے اپنی ریوالونگ چیئر کی پشت سے کمر ٹکا کر سر اور گردن کو بھی پیچھے ڈالتے ہوئے بازو پھیلا کر اپنی تھکن ایک انگڑائی میں زائل کرنے کی کوشش کی۔

تابندہ میٹنگ کے بعد اُس کے بلانے پر اُس کے آفس میں چلی آئی تھی۔ زرغام نے اُسے دیکھ کر ہی یہ اظہار کیا تھا۔ ''سر! آپ بھی تو مسلسل Busy رہے ہیں، سارا دن۔'' تابندہ نے سامنے بیٹھتے ہوئے اُس کی جانب مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا تو وہ ایکدم سیدھا ہو کر متوجہ ہوا۔

''اتنے دنوں بعد تو کام کیا ہے۔ کتنا کچھ تو Delay تھا۔'' زرغام نے یکدم اپنی جگہ چھوڑی اور کھڑا ہو گیا۔ ''Thank`s God، آج کافی کچھ Final ہو گیا۔ کل کا دن بھی ایسا ہی گزرنے والا ہے۔'' بات کرتے کرتے ہاتھ بڑھا کر میز سے اپنا سیل فون اور سگریٹ کیس، لائٹر اُٹھایا۔

''سر آپ...... اب اپنے گھر جا رہے ہیں؟'' تابندہ نے اُس کے اچانک اُٹھ جانے پر قدرے تعجب سے پوچھا۔

''نہیں بھئی میرا تو دو دن تک گھر جانے کا ارادہ ہے، نہ پروگرام۔ فی الحال تو میں ڈنر کے لیے جا رہا ہوں۔ تم بھی چل رہی ہو۔'' تابندہ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اُسے پیشکش کر رہا ہے یا پوچھ رہا ہے۔

''سر! میں......؟'' تابندہ نے بے ساختہ پوچھا۔

''کیوں؟ تم نہیں جانا چاہتیں؟'' زرغام کے استفسار میں کچھ خفگی سی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے سر۔ میں چل رہی ہوں۔'' تابندہ فوراً ہی گھبرا کر بولی۔ پھر اُس کے ساتھ آفس سے پارکنگ میں چلی آئی۔ اچانک ہی تابندہ کو سوزین کا پیغام یاد آیا تھا۔

''سر! شام کو ایک خاتون آپ سے ملنے آئی تھیں۔ کوئی پرسنل میٹر تھا شاید۔'' گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے تابندہ نے اُسے بتایا تو وہ کچھ بے زاری سے جواب دینے لگا۔

''پلیز تابی! اِس وقت میں کسی کے بھی بارے میں بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ بس سمجھو کہ ہم Time Enjoy کرنے نکلے ہیں۔ پلیز Relax رہو۔'' زرغام نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اُسے ٹوک دیا تو وہ بھی خاموش ہو گئی۔ زرغام سے زیادہ اُس کے لیے کچھ اہم نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ خوب صورت وقت گزارنا اُس کی بھی خواہش تھی۔

کچھ منٹ بعد ہی وہ زرغام کے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ڈنر کے ساتھ ماحول سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

☆.....☆

''بیگم صیبہ! یہ تو مجھ سے نہیں سنبھلتے۔ یہ کاکا (فلک) تو رو رو کے ہلکان ہو گیا ہے۔'' ماسی بختے نے کمرے میں داخل ہوتی نادیہ کو دیکھتے ہی دہائی دی۔ دوپہر سے نادیہ نے ماسی بختے کو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے پابند کر دیا تھا مگر اُس سے بچے سنبھل رہے تھے نہ بہل رہے تھے۔ نادیہ بھی فلک کے مسلسل رونے کی آواز پر ہی اپنے کمرے سے نکل کر آئی تھی۔ قریب آ کر اسے پتا چلا کہ ماسی بختے کے اناڑی پن سے لگائے ڈائپر نے فلک کو پورا بھگو دیا ہے۔ وہ اسی لیے رو رہا تھا۔

''اُف ماسی۔ فلک بھیگا ہوا ہے اور تم نے اُسے چینج ہی نہیں کروایا۔'' نادیہ کے لہجے میں غصہ اور ماتھے پر شکن آ گئی تھی۔ سوزین کو گئے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے اور بچوں کی یہ حالت تھی۔ فیڈر بھی سرہانے اُلٹا پڑا تھا۔ دودھ بہہ کہنک کی گردن اور سینے تک کو گیلا کر چکا تھا۔ نادیہ کو یہ دیکھ کر غصے کے ساتھ کوفت بھی ہوئی۔

''بیگم صیبہ! ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو بدلے تھے، میں نے ان کے کپڑے۔ یہ فیروی روئے جا رہے ہیں۔''

''یہ دونوں گیلے ہیں۔ اس لیے رو رہے ہیں۔'' نادیہ نے زچ ہو کر جواب دیا۔ ''ہٹو اِدھر۔ میں خود چینج کرواتی ہوں۔ وہ سامنے کیبنٹ سے تولیہ، ڈائپر وغیرہ نکال کر لاؤ۔'' نادیہ نے اُسے بچوں کے بیڈ کے پاس سے ہٹا کر ہدایت دی۔ ماسی فوراً کمرے میں موجود الماری کی طرف گئی اور چیزیں نکال لائی۔

''بیگم صیبہ! آپ نے بڑا چنگا کیا۔ سچی مجھے تو وہ عورت ایک آکھ (آنکھ) نہیں بھاتی تھی۔ شکل سے ہی جادوگرنی لگتی تھی۔ آپ نے دیکھی شاہ جی کی کرامت۔ آپ کا دشمن کیسے آپ کے سامنے آ گیا۔ اب آپ فکر نہ کرو۔ آپ کے بچے بھی بھلے چنگے ہو جائیں گے۔ بس شاہ جی پہ بھروسا رکھنا۔'' ماسی بختے اُس کے پریشان تاثرات بھانپتے ہوئے بول رہی تھی۔

نادیہ بچوں کی موجودہ حالت پر پریشان تھی۔ وہ بہ یک وقت دونوں بچوں کو سنبھال نہیں سکتی تھی۔ سوزین نے دونوں کو بہت سہولت سے سنبھالا ہوا تھا۔

''شاہ صاحب کے بھروسے پر ہی تو میری آس بندھی ہے مگر اب سوچتی ہوں بچوں کے لیے کسی آیا کا انتظام تو کرنا پڑے گا۔ یہ تم سے تو سنبھلیں گے نہیں۔'' نادیہ نے گیلے تولیے سے پہلے فلک کا جسم صاف کرتے ہوئے اظہار کیا۔

''بیگم صیبہ! اس بار ذرا چھان پھٹک کے کسی عورت کو رکھنا اور ہاں شاہ جی کہہ رہے تھے کہ آپ اپنی چیزیں، کپڑے لتے میرا مطبل (مطلب) ہے زیور وغیرہ۔ اک واری ضرور دیکھ لیں۔ کدھرے (کہیں) وہ اپنا کم نہ دکھا (دکھا) گئی ہو۔''

''نہیں وہ ایسی عورت نہیں تھی۔'' نادیہ نے بے اختیار گواہی دی تو ماسی یکدم چمک کر بولی۔

''رہن دیں بیگم صیبہ۔ وہ چنگی ہوتی تو آپ کے ساتھ دغا کرتی؟ آپ کے بچوں کی دشمن آپ کے لیے ہنے وی اعتبار والی اے۔''

''اچھا! بس چھوڑ دو اُس کا ذکر۔ میرا دل پہلے ہی پریشان ہے۔ جاؤ خانساماں سے کہو اچھی سی چائے بنا کر

بھیجے اور آ کر یہ سامان بھی سمیٹو۔'' نادیہ واقعی پریشان تھی۔ ماسی کی باتیں اُسے مزید پریشان کر رہی تھیں۔ اس لیے اُس نے ماسی کو ٹالا تھا۔

☆.....☆

نائلہ پہلی بار کچھ کرنے سے پہلے اس قدر ڈر رہی تھی۔ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پانے کے لیے اُس نے دو تین گلاس اوپر تلے پانی پیے۔

سنبل کو بار بار اُس کا کچن میں آنا کھٹک رہا تھا مگر وہ اُس سے وجہ نہیں پوچھ سکتی تھی۔ زریں بیگم کا خوف بھی تھا اور نائلہ کی تنک مزاجی سے بھی ڈرتی تھی اور پھر زریں بیگم بھی لاؤنج میں آ بیٹھی تھیں۔ آخر نائلہ پھر گھر سے نکل کر لان میں چلی گئی۔ انیکسی کی طرف جاتے ہوئے اُس کے قدم لرز رہے تھے۔ سنبل بجس کے باوجود اُس کے پیچھے نہ جا سکی البتہ کچن کے دوسرے دروازے سے جھانک کر اُس نے نائلہ کو انیکسی کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ کئی سوال اُس کے ذہن میں اُبھر رہے تھے۔ سب سے پہلا سوال تو یہی تھا کہ آخر نائلہ اَسود کی غیر موجودگی میں وہاں کرنے کیا گئی ہے۔ آخر اپنے سوالات کے ساتھ ہی وہ رات کا کھانا بنانے میں مصروف ہو گئی۔

نائلہ نے پیر صاحب کے دیے گئے تعویذوں کو دوپٹے کے پلو میں باندھ رکھا تھا اور پلو اپنی مٹھی میں دبا رکھا تھا۔ کسی کے نہ ہونے کے یقین کے باوجود، وہ بہت احتیاط سے اِدھر سے اُدھر دیکھتی، کمروں میں بتیاں جلاتی اَسود کے بیڈ روم میں داخل ہو گئی۔ کمرے میں اَسود کے مخصوص پرفیوم کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے ہی اُس نے لائٹ جلائی وہ دروازے میں ہی کھڑی رہ گئی۔ اُس کی نظروں کے سامنے عجیب منظر تھا۔

کمرے کی دیواروں پر علیشہ کی پوسٹر سائز تصویریں آویزاں تھیں۔ نائلہ کے تو تن بدن میں جیسے کسی نے آگ لگا دی۔ وہ جس کام سے آئی تھی وہ تو اُسے یاد نہیں رہا۔ وہ طیش میں ابھی تصویریں پھاڑنے کے لیے آگے بڑھنے ہی لگی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ اُسے یاد آیا کہ وہ کیا کرنے آئی تھی مگر اب وہ ایسا کرنے کے بجائے اس کمرے میں آگ لگا دینے کا سوچ رہی تھی۔

زریں بیگم کو خدشہ تھا کہ نائلہ کام ٹھیک طریقے سے نہیں کرے گی۔ اس لیے وہ بھی اُس کے پیچھے ہی چلی آئی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھنے سے اُن کا سانس پھول گیا تھا۔ اس لیے وہ ذرا سانس لینے کے لیے دروازے کے پاس ٹھہر گئی تھیں۔ نائلہ کو زریں بیگم کی آہٹ نے ہی چونکایا تھا۔

''کـــــو.....ن.....؟'' نائلہ کی آواز چاہ کر بھی حلق سے نہ نکل سکی اور نہ ہی دروازے کے باہر کھڑی زریں بیگم تک پہنچ سکی۔ وہ خود ہی کچھ لمحوں بعد اندر داخل ہوئیں۔ نائلہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اُس کی سانس رک گئی تھی اور ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔

''یـــــہ.....پھـــــوپو آپ.....؟'' زریں بیگم کو دیکھتے ہی اُس کی اٹکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔

''او.....ف، پھوپو میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ میں سمجھی کہ.....'' زریں بیگم نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں تم سمجھی کہ موت کا فرشتہ آ گیا۔ خدا کے لیے کچھ تو حوصلے سے کام لو۔'' زریں بیگم اُس کی طرف دھیان دیے بغیر ہی فوراً بیڈ پر براجمان ہو گئیں۔ اُس کے بکھرے حواسوں اور اُڑی رنگت کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ فی الحال انہیں اس کا علم نہ تھا۔

''حوصلہ! کیسے کروں حوصلہ؟ آپ کے بیٹے نے تو کیا کیا گل کھلا رکھے ہیں۔ دیکھیں تو ذرا۔'' نائلہ نے پھر سے طیش میں آتے ہوئے تصویروں کی طرف اشارہ کیا تو زریں بیگم بھی ٹھٹک کر دیکھنے لگیں۔ نائلہ کی باتیں انہیں جھوٹ لگا کرتی تھیں مگر یہاں تو ثبوت موجود تھا۔ ایک خوب صورت حسین ترین لڑکی کا چہرہ اُن کی نظروں کے سامنے بھی تھا۔

''یہی ہے وہ چڑیل..... ڈائن، جس کے عشق کا بھوت سوار ہے عشق زادے پر۔ میری بات کا آپ کو یقین ہی نہیں تھا۔'' نائلہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسود اور علیشہ اُس کے سامنے ہوں اور وہ دونوں کا منہ نوچ لے۔ ایک تصویر کو تو اُس نے اپنے تیز ناخنوں سے بڑھ کر نوچ بھی لیا تھا۔ زریں بیگم جو فی الوقت اس صدماتی کیفیت میں تھیں۔ نائلہ کی حرکت پر اُسے چیخ کر روکا۔

''نائلہ..... مت کرو۔ ایسا..... اُسے خبر نہیں ہونی چاہیے کہ تم اُس کی غیر موجودگی میں یہاں آئی ہو۔ چلو آؤ واپس۔ میں خود اُس کا بھوت اُتار دوں گی۔ دیکھ لینا اپنے ہاتھ سے اتارے گا وہ یہ تصویریں۔'' زریں بیگم نے اُٹھ کر نائلہ کو مزید تخریب کاری سے روکا اور پھر زبردستی اُسے ساتھ لے گئیں۔ حالانکہ وہ مزاحمت کر رہی تھی۔

☆.....☆

زریں بیگم اور نائلہ کی رہائشی حصے سے وقتی غیر موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر سنبل نے شمسہ کو فون کر لیا۔ کل سے اُسے موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ تیسری چوتھی بیل پر شمسہ نے فون ریسیو کیا۔ اُس کی آواز ہی اُس کی حالت کا پتا دے رہی تھی۔

''ہیلو بھابی کیسی ہیں آپ؟'' رسمی علیک سلیک کے بجائے سنبل نے براہِ راست پوچھا۔ اُسے زریں بیگم کا لان سے اندر آنے کا خدشہ بھی تھا۔

''کیسی ہو سکتی ہوں؟ چاہ کر بھی ابو کو مطمئن نہیں کر پائی کہ میں صلح صفائی سے چند دن کے لیے آئی ہوں۔'' شمسہ کا غصہ اترنے میں بائیس تیئس گھنٹے کافی تھے۔

''تو! آپ آجائیں ناں واپس۔'' سنبل نے اُس کی تکلیف سمجھتے ہوئے مخلصانہ مشورہ دیا۔

''کیسے آجاؤں واپس؟ اتنی تذلیل کے بعد۔ مما کو تو چھوڑ وہ..... وہ شخص بھی دوسروں کے لیے مجھے ہی بے عزت کر گیا اور..... اور اُس نے پلٹ کر اب تک خبر لی ہے، نہ معذرت کی ہے۔'' شمسہ نے ذرا افسوس کے ساتھ دکھ بھرے لہجے میں اظہار کیا۔

''بھابی آپ تو جانتی ہیں کہ اِدھر سے ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہونے والا۔ مما کے اشارے کے بغیر حماد بھائی اور عباد بھی کوئی قدم اُٹھالیں۔ ایسا ہو سکتا ہے؟ آپ کو خود ہی بچوں کی خاطر واپس آجانا چاہیے۔'' سنبل نے آخری بات کافی جھجک کر کہی۔ شمسہ اس بار تو بھڑک ہی اُٹھی۔

''میں خود سے آجاؤں؟ ایسا تو ہرگز نہیں ہوگا اور اب تو میں اُس گھر میں آنا بھی نہیں چاہوں گی جہاں نائلہ موجود ہوگی۔ تم بے شک مما کو بتا دینا۔ بلکہ سبھی کو بتا دینا۔ اب میری برداشت ختم ہوگئی ہے۔'' آخر میں وہ روہانسی ہوگئی۔

سنبل اُس کی کیفیت سمجھتی تھی مگر اُس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ فقط اتنا بولی۔ ''بھابی بچوں کے لیے تو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اچھا آپ ٹینس مت ہوں۔ انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔''

''سوری سنبل، میں تم جیسی برداشت پیدا نہیں کر سکتی۔ میں اپنے بچوں کے لیے اپنی Self Respect قربان نہیں کروں گی۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی ہو۔'' شمسہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

''میں تو آپ کے لیے دعا ہی کر سکتی ہوں۔ اچھا بھابی میں پھر کال کروں گی۔ آپ بچوں کو پیار دینا۔'' سنبل کو آہٹ محسوس ہوئی تو اُس نے فوراً ریسیور رکھ دیا۔

زریں بیگم اور نائلہ عجیب تیوروں سے ہال میں داخل ہو رہی تھیں۔

☆.....☆

ردا، حمیدہ سے آنکھ بچا کر چھت پر چلی آئی تھی۔ حمیدہ کو معلوم تھا تا بندہ تاخیر سے آئے گی، اسی لیے وہ اپنے سارے کام نمٹا کر برآمدے میں بچھی چارپائی پر ستانے لیٹی تھی۔ پھر نہ جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔ ماں کو سوتا پا کر ردا دبے پاؤں چھت کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ بہت دن ہو گئے تھے محبوب کا دیدار کیے ہوئے، نوید کے دیے ہوئے سیل فون پر بات چیت تو ہو جاتی تھی مگر دیکھنے کی تمنا تو باقی رہتی تھی۔

نوید سے وقت مقرر کر کے اور تازہ ترین ساری صورتِ حال بتا کر اُس نے ملنے کا پروگرام فوری طور پر طے کیا تھا۔ اب وہ اپنی خوشی پانے کی خاطر ہر حد سے گزرنے کو تیار تھی۔

نوید بُری صحبت میں پڑا ہوا، بیوہ ماں کے لاڈ پیار میں بگڑا ہوا نوجوان تھا۔ کبوتر بازی، لڑکیوں سے عشق معاشقے راتوں کو گن پوائنٹ پر چھین جھپٹ کرنا اُس کے خاص مشغلے تھے اور اُسے نشے کی بھی لت تھی۔ چرس کے ساتھ شراب پینا اُس کا من پسند مشغلہ تھا۔ ردا کو یہ سب دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُسے تو بس اس کی چکنی چپڑی باتیں، مستقبل کے رنگین وعدے اور اپنے چاہتے میں نمایاں، اُس کی مردانہ شخصیت نے متاثر کر رکھا تھا۔

ردا کافی محتاط ہو کر چھت پر آئی تھی۔ اس وقت شاذ و نادر ہی کوئی اپنی چھت پر نظر آتا تھا۔ سبھی کیبل کے مرہونِ منت ملنے والی تفریح میں کچھ اس قدر مگن و مست ہوتے تھے کہ اپنے ہی گھر کے کسی مرد کے بارے میں خبر نہیں ہوتی تھی۔ وہ کیا کر رہا ہے اور کہاں ہے۔

وہ اوپر آئی تو حسبِ وعدہ نوید پہلے ہی اُن کی چھت پر پڑی جھلنگا سی چارپائی پر نیم دراز، سگریٹ کے کش لینے میں مشغول تھا۔ اُن کے اور نوید کے گھر کی چھت کے درمیان ایک اور چھت تھی۔ نوید اکثر چھت پھلانگ کر ملنے آتا تھا مگر نہ جانے کیوں ردا آج اُسے دیکھ کر کچھ ٹھٹک کر خوف زدہ بھی ہوگئی تھی۔

نوید اُسے دیکھتے ہی سیدھا ہو بیٹھا اور پھر بڑی ترنگ میں مصرعہ پڑھا۔ ''بہت دیر کی مہرباں آتے آتے'' مصرعہ پڑھ کر سگریٹ کا گہرا کش لے کر اس نے دھواں ردا کے چہرے کی طرف چھوڑ دیا۔ ردا چند قدم کے فاصلے پر ٹھہری تھی۔ الجھن سے انگلیاں مروڑتی وہ ازحد بے چین سی نظر آرہی تھی۔

''وہ..... امی جاگ رہی تھیں۔ وہ مجھے بہت ڈرلگ رہا ہے۔'' ردا نے آخر اپنے خوف کا اظہار کر دیا۔ نوید سر جھٹکتا، سگریٹ کا کش لگاتا یکدم کھڑا ہو کر بے پروائی سے بولا۔

''ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری بات پر اعتبار نہیں ہے کیا؟ اگر تو ساتھ دے تو ساری دنیا کے سامنے چھین کے لے جا سکتا ہوں تجھے۔'' وہ اُس کے قریب ہوتا ہوا اپنی بات پر زور دیتا ہوا بولا۔ ردا کو اُس کا اعتبار دلاتا رویہ ہی تو زیر کر دیتا تھا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ ہوں مگر تم پہلے اپنی امی کو تو بھیجو۔ اس طرح میرے کہنے پر تو میرے گھر والے نہیں

مان سکتے۔ جب تک کہ تم اور تمہاری امی آ کر مجھے عزت سے نہ مانگ لیں۔'' ردا نے غیر محسوس انداز میں چند قدم پیچھے سرکتے ہوئے فاصلہ پیدا کیا۔

''اوئے بتایا تو تھا کہ جس طرح تیرے ماں باپ کو اپنے بچے پیارے ہو گئے ہیں، اسی طرح میری ماں کے دل میں وی اپنے بھرا کی سُتی (سوئی) محبت جاگ گئی ہے۔ اپنی بھتیجی کو بیاہنے کا خواب دیکھ رہی ہے وہ بھی۔''

''اس کا مطلب ہے تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے۔'' ردا نے بے یقینی سے پوچھا۔

''کروں گا کیوں نہیں۔ اسی لیے تو اتنا خطرہ مول لے کر آتا ہوں۔ پر یہ بھی جانتا ہوں کہ نا تو تیرے گھر والے راضی ہوں گے اور نہ میرے۔ یہ کام ہمیں خود ہی کرنا ہوگا۔ میں آج تجھ سے یہی بات کرنے آیا ہوں۔'' نوید نے بے باکی سے اُس کے گال پر چٹکی لی اور مزید بولا۔ ''تجھ سے دوری اب مجھ سے دی برداشت نہیں ہوتی۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میرے گھر والے تو شاید مجھ سے زبردستی کر جائیں مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ جیسا تم کہو گے میں وہی کروں گی۔'' ردا کو بھی محبوب کا لمس اور قرب نشہ آور محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے فوراً آئندہ کا پروگرام بنانے میں مصروف ہو گئی۔

اُسے اب جیسے دنیا کا خوف رہا تھا اور نہ گھر والوں کا۔ دونوں میں طے ہو گیا تھا کہ ایک دو دن میں موقع دیکھ کر دونوں ہی اپنے اپنے گھر سے نکلیں گے اور ایک منزل پر ملیں گے۔

☆.....☆

نہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ ڈنر سے واپس آ کر زرغام بخاری چند ضروری کام بھی نمٹا چکا تھا اور پھر کچھ دیر آرام کی خاطر تابندہ کے ساتھ اپنے دوسرے آفس کے کمرے میں صوفے پر نیم دراز کافی سے بھی محظوظ ہو رہا تھا اور تابندہ کے ساتھ سے بھی۔

تابندہ بھی آج تمام فاصلے مٹائے بالکل پاس ہی تو بیٹھی تھی۔ محبوب کی دلجوئی میں کتنی تسکین ملتی ہے، وہ آج سمجھ پائی تھی۔

''You Know تابندہ، میں جب بھی تمہارے ساتھ ہوتا ہوں، میری Feelings بدل جاتی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے وقت یہیں ٹھہر جائے اور ساری دنیا منجمد ہو جائے۔'' زرغام بخاری نے سگریٹ کے مرغولے فضا میں ایک طرف چھوڑتے ہوئے خواب ناک اور گمبھیر لہجے میں کہا۔ رات کے گیارہ بجے تھے اور وہ دونوں تنہا تھے۔ میگزین کی پرنٹنگ کا کام ہو رہا تھا۔ اس لیے زرغام کو آج رات یہاں ٹھہرنا تھا۔

''میرے احساسات بھی کچھ ایسے ہی ہیں مگر.....'' تابندہ نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا اور بات ادھوری چھوڑ دی۔

''مگر.....؟'' زرغام نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا بھی۔

''مگر ہمارے احساسات کے لیے کبھی وقت نہیں ٹھہرتا اور نہ ہی دنیا تھمتی ہے بلکہ یہ دونوں طاقتیں ہی انہیں کچلنے کی کوشش میں رہتی ہیں اور.....'' تابندہ نے جھجکتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اچانک ہی اُسے رات کے گزرنے کا احساس ستانے لگا تھا۔

''اُفوہ یار! اتنے رومانٹک موڈ کو ایسی باتوں سے خراب تو نہ کرو۔ دیکھو یہ جو وقت اور دنیا ہے ناں، یہ ہمارے

حساب سے چلتے ہیں۔ تمہیں اس کی اتنی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' زرغام نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنے اور اُس کے درمیان فاصلہ کم کرتے ہوئے اُس کا ہاتھ تھام کر تسلی دینے کے سے انداز میں کہا۔

''پروا تو کرنی پڑتی ہے زرغام، آخر میں ایک لڑکی ہوں اور معاشرے اور مذہب نے میرے لیے کچھ قانون مقرر کر رکھے ہیں۔'' تابندہ مسلسل اُسی احساس میں تھی۔

''آج تم نے مجھے بور کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے؟ Really میں تم سے یہ سب سننا نہیں چاہتا تھا۔''

''Sorry میں بھی یہ سب کہنا نہیں چاہتی تھی۔ بس اپنی مجبوری میں کہہ گئی۔ Actually ہماری کلاس میں لڑکیوں کو اختیارات نہیں دیے جاتے ناں، اس لیے اپنا جائز حق مانگنے سے بھی ڈرتی، جھجکتی ہیں۔'' تابندہ نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اُس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی تو وہ ہنس دیا۔

''I Know، تمہارا خوف میں سمجھتا ہوں۔ Don`t worry میں تمہیں کبھی بغاوت کے لیے نہیں کہوں گا۔'' زرغام نے جیسے اُس کی ساری سوچیں پڑھ لی تھیں، پھر اچانک ہی اُس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''Come on, ok تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیتا ہوں مگر کل تمہیں جلدی آنا ہوگا۔'' زرغام مسکراتے ہوئے وعدہ لے رہا تھا۔

''جانا تو میں بھی نہیں چاہتی مگر..... کل جلدی آنے کے لیے مجھے جانا ہی ہوگا۔'' تابندہ بھی ایکدم ہلکی پھلکی ہو کر کھلکھلا دی۔ اُس کی آنکھوں میں اچانک جو شوخ سا رنگ اُترا تھا۔ زرغام کو اپنی رات گزارنے کا جیسے سبب مل گیا تھا۔

☆.....☆

''کاش..... کاش پھوپو آپ نے مجھے روکا نہ ہوتا تو میں پیٹرول چھڑک کر اُس منحوس، ڈائن کی تصویروں کو تو آگ لگا دیتی۔'' نائلہ زریں بیگم کے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے اپنا غبار، اپنا پچھتاوا ظاہر کر رہی تھی۔

''آہستہ بولو۔ کوئی سن لے گا۔'' زریں بیگم نے قدرے نیچی آواز میں محتاط ہو کر کہا۔

''سننے دیں۔ ساری دنیا کو پتا چلنا چاہیے کہ اُسود علی کتنا شریف انسان ہے۔ شادی مجھ سے کی اور معاشقے کسی اور سے لڑا رہا ہے۔ آ جائے ذرا ساری دنیا کے سامنے۔ اُس کا پول نہ کھولا تو میرا نام نائلہ نہیں۔'' نائلہ کے اندر جیسے کسی نے آگ بھر دی تھی۔ وہ بھڑک بھڑک کر چنگاریاں اڑا رہی تھی اور زریں بیگم اُسے قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''نائلہ..... نائلہ..... خدا کے لیے چپ ہو جا۔ دیکھ جب گھی سیدھی انگلی سے نکل سکتا ہے تو ہمیں انگلی ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں کل ہی شاہ جی کے پاس پھر جاؤں گی اور پورا بندوبست کراؤں گی۔ دیکھنا خود ہی تمہارے سامنے گھٹنے ٹیک دے گا۔'' زریں بیگم نے پھر سے اُسے پچکارا۔

سنبل جو نائلہ کی چیخ پکار سن کر تجسس کے مارے زریں بیگم کے کمرے کے باہر آ کھڑی ہوئی تھی۔ زریں بیگم کی بات سُن کر ششدر رہ گئی۔ وہ کس شاہ جی کا ذکر کر رہی تھیں اور کیا بندوبست کرنے والی تھیں۔ سنبل سمجھ کر بھی جیسے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''مت دیں مجھے جھوٹی تسلیاں۔ آخر وہ اپنی ہی من مانی کر رہا ہے نا۔'' وہ مزید بھڑکی۔

''من مانی؟ من مانی کیسی؟ تم نے خود ہی تو بتایا کہ وہاں اُس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ تمہیں چھوڑ کر گیا تھا تو

سزا بھگت لی نا اُس نے۔ اب بھی دیکھنا شاہ جی کی کرامت رنگ لائے گی۔ بس تمہیں ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔" زریں بیگم نے اُسے پھر سے رام کیا۔

"بس میں ہی صبر کروں۔" وہ بڑبڑائی اور اُسی طرح دندناتی ہوئی کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ وہ تو شکر تھا کہ سنبل بروقت ایک طرف ہوگئی تھی ورنہ اس وقت جو ہنگامہ برپا ہوتا تو الامان، الحفیظ۔

اندر زریں بیگم سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ اُن کی نظروں میں بھی بار بار وہی تصویریں گھوم رہی تھیں۔

☆.....☆

"کیا کرنے گئی تھیں تم اوپر؟ منع کیا تھا نا تمہیں۔" ردا اپنے آپ میں مگن نیچے اُتر رہی تھی کہ آخری سیڑھی پر حمیدہ کی کرخت آواز نے اُس کے قدم پکڑ لیے۔ اُس کی سانس ٹھہر گئی۔ روح فنا ہونے لگی۔ اپنی چوری پکڑے جانے کے خوف سے اُس کا کھلتا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"دیکھ ردا مجھے سچ سچ بتا دے۔ چھت سے رقعے بازی کرتی ہے نا تُو، اُس کے ساتھ۔" حمیدہ کو جیسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کسی سے ملنے کی جرأت بھی کر سکتی ہے۔ اُس کا تو خیال تھا کہ نوبت صرف اشارے بازی اور خط وغیرہ تک ہوگی۔ ردا، ماں کی لاعلمی پر لمبی سانس کھینچ کر جلدی سے بولی۔

"نہ..... نہیں امی۔ وہ تو میں ہوا خوری کے لیے اوپر گئی تھی۔ دل گھبرا رہا تھا تو گرمی....."

"بس بس رہنے دے اپنے چلتر۔ خوب جانتی ہوں میں کہ تُو آج کل کن ہواؤں میں ہے۔ آئندہ اگر تجھے اوپر جاتے دیکھا ناں تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔ جا دفع ہو اندر، ابھی تیرا باپ بھی آنے والا ہے۔" حمیدہ نے اُسے خوب لتاڑا، ردا بھی اس وقت کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے دل میں جو ٹھان چکی تھی، اُس کے بعد اُسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ ماں کے پاس سے نکل کر وہ کمرے میں چلی گئی۔

☆.....☆

"دھیان کدھر ہے تمہارا۔ کہا تھا نا تمہیں کہ نائلہ کے لیے بروسٹ بنا دینا مگر تمہیں بھی اب کچھ سنائی نہیں دیتا۔" سبھی کھانے کے لیے جمع تھے۔ سوائے نائلہ کے جو بلانے کے باوجود نہیں آئی تھی۔ اب زریں بیگم اُس کے کمرے میں اُس کا کھانا ٹرے میں سجوا کر بھیج رہی تھیں۔ کھانے کی میز پر انہیں بروسٹ نظر نہیں آیا تو وہ میز پر پانی رکھتی سنبل کو سنائے بغیر نہ رہ سکیں۔

"کیا ہو گیا! جو آج ایک آدھ چیز تمہارے حکم کے مطابق نہیں بن سکی۔ یہ باقی کھانا کم تو نہیں ہے۔" ظہیر اکبر نے خلاف توقع مداخلت کر کے زریں بیگم کے ماتھے کی تیوریاں مزید بڑھا دیں۔

"کیا مطلب ہے؟ اب تمہاری بہوویں میری ضد میں اپنی من مانی کریں گی۔ میری ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رہی۔ میرا اس گھر میں کوئی مقام نہیں ہے۔" زریں بیگم کے لہجے اور چہرے سے برہمی و قہر برسنے لگا تھا۔ "میرے گھر میں اب ان کی حکمرانی چلے گی؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ کان کھول کر سن لو، تم بھی اور تمہاری بہویں بھی۔" زریں بیگم کا فشارِ خون بڑھ گیا تھا۔ اب انہیں سنبھالنا مشکل تھا۔ ظہیر اکبر کے چہرے پر اپنی مداخلت کا ملال نظر آنے لگا تھا۔ حماد جو بجھا بجھا سا بیٹھا تھا وہ بھی یکدم اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے خاصی بے زاری سے بولا۔

"اب کیا یہاں ہر روز کھانے کے وقت یہی تماشہ ہوا کرے گا۔ انسان ایک وقت بھی سکون سے کہیں کھانا نہیں کھا سکتا۔"

"اچھا! اب تمہارے ہی بولنے کی کسر رہ گئی تھی۔ سمجھ رہی ہوں میں تمہاری ٹون کہ تم کہاں سے بول رہے ہو۔" زریں بیگم نے حماد کو بھی جھاڑ کے رکھ دیا۔ اِس وقت انہیں اپنی ذات کے علاوہ کسی کا احساس نہیں تھا۔

"او پلیز مما! مجھے تو آپ اپنے جھگڑے کا حصہ نہ بنائیں۔" حماد اُسی بے زاری سے بولتا ہوا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ اپنے پیچھے اُس نے عباد کی آواز سُنی تھی۔

"حماد بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم ایک وقت بھی مل کر نہیں بیٹھ سکتے۔" آخر وہ بھی سنبل پر ہی نزلہ اُتارنے لگا۔ اُس کی کوئی نہیں سُن رہا تھا۔

"تم نے جب سب کچھ کرنا ہی ہوتا ہے تو پھر بکری کی طرح مینگنیں ڈال کر دودھ دینے کا مقصد۔ تمہیں بھی مزا آتا ہے۔ روز روز کی بدمزگی سے۔" شوہر کی چڑھائی پر سنبل کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اپنی بات کہنے سے پہلے اُس نے بڑی شاکی نظروں سے عباد کو دیکھا۔

"کوئی مجھے بھی کچھ کہنے کا موقع دے گا۔ میری بھی کوئی سُنے گا۔" وہ زچ ہو کر چیخ سی پڑی۔

"تم تو نہ ہی بولو تو اچھا ہے۔"

"پروین..... پروین۔" عباد نے اُسے درشتگی سے جھاڑتے ہوئے پروین کو پکارا۔ وہ کچن میں روٹیاں پکا رہی تھی، نور اچلی آئی۔

"جی صاب۔"

"یہ مما جو کہہ رہی ہیں پہلے وہ کرو۔ جاؤ نائلہ کو کھانا دے کر آؤ۔"

"صاب جی وہ تو کھانا کھا چکی ہیں۔ گھنٹہ پہلے ہی۔ سنبل بی بی نے اُن کے لیے بروسٹ بنایا تھا ناں، تو وہ خود ہی آ کر سارا اپنے کمرے میں لے گئیں۔ ایک بوٹی وی نئی چھوڑی۔" پروین کو موقع مل گیا تھا۔ نائلہ کی جی حضوری کر کر کے تو وہ بھی تنگ تھی۔

"اچھا۔" عباد کے چہرے پر خفت پھیل گئی اور وہ سنبل سے نظریں چرا گیا۔

"تمہیں بھی عادت ہو گئی ہے زریں بیگم۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی تماشہ کھڑا رکھتی ہو۔ بے فکر ہو جاؤ تمہاری چہیتی کھانا کھا چکی ہے۔" ظہیر اکبر بھی تلخی سے بولے اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اب مجھے کیا پتا تھا۔ اسے بتا دینا چاہیے تھا مگر نہ جی مجھے کچھ بتانے سے نواب زادی کی شان نہ گھٹ جاتی۔" زریں بیگم اپنی غلطی مان لیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ خوامخواہ حماد بھی اُٹھ کر چلا گیا۔ پروین جا اُسے بلا کر لا۔" زریں بیگم! یکدم ایسے ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

سنبل حسب عادت وہاں سے نکل کر کچن میں چلی آئی۔ زریں بیگم سے اپنی بے عزتی کروانے کی اُسے عادت ہو گئی تھی مگر عباد کا رویہ سہنا اُس سے دوبھر ہو رہا تھا۔ غصے اور دکھ سے آنسو پیتی وہ سنک میں پڑے خالی برتن دھونے لگی۔

☆.....☆

"دیکھو تا بندہ۔ اس طرح رات کو دیر سے آنے کی اجازت میں تمہیں نہیں دے سکتا۔" رشید احمد خلاف توقع جاگ رہا تھا۔ تا بندہ تقریباً بارہ بجے گھر پہنچی تھی۔ دل ہی دل میں فکرمند تو حمیدہ بھی تھی مگر کسی سے اظہار نہیں کر پا رہی تھی۔ تا بندہ نے آ کر کپڑے بدلے تو رشید احمد نے اُسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔

''ابو! میں امی کو بتا کر گئی تھی اور.....'' اُس نے مدطلب نظروں سے ماں کو دیکھا مگر حمیدہ صاف نظر بچا گئی۔

''اور کیا؟ صرف بتا دینے سے ہماری فکر ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا کی زبانوں کا پتا ہے نا، گز گز بھر لمبی ہیں، جن سے صرف آگ نکلتی ہے۔ ایک بار دامن کو پکڑ لیں تو سارا وجود ہی بھسم کر ڈالتی ہیں۔'' رشید احمد نے اُس کی بات سنے بغیر اپنے خدشے ظاہر کیے۔

''ابو دنیا کے حساب سے تو میرا نوکری کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ آپ کس دنیا کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھیں ابو نوکری کرنا میری مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی۔ دنیا نے کبھی ہماری مجبوری دیکھی ہے اور نہ ہماری ضرورتیں آ کر پوری کرے گی۔ اس لیے آپ دنیا کا ہوا اپنے حواسوں پر سوار مت کریں۔ آپ کو مجھ پر اعتماد ہے نہیں۔'' تابندہ نے دلائل دے کر قائل کرنے کی کوشش کی۔

رشید احمد بھی ایکدم چپ کر گیا۔ کہتا بھی کیا۔ دنیا کے خوف سے زیادہ بھیانک غربت و مفلسی کے وہ دن تھے جو آج بھی انہیں یاد آ کر سہما دیتے تھے۔ ''مجھے تم پر اعتماد ہے مگر.....'' رشید احمد نے توقف کرتے مجبور سے لہجے میں کہنا چاہا تو تابندہ نے اُس کی بھی مزید نہیں سنی۔

''بس پھر اپنا اعتماد قائم رکھیں۔ میں ایسا کچھ نہیں کروں گی جس پر آپ کو ندامت ہو۔ بہر حال آفس کے کام کے سلسلے میں چند دن مجھے دیر سے ہی آنا پڑے گا۔ کیونکہ آفس کے کچھ لوگ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اُن کے آتے ہی میں اپنی پرانی روٹین سے واپس آیا کروں گی۔'' تابندہ نے جیسے بات ختم کر دی اور پھر کمرے کی طرف مڑ گئی۔

حمیدہ نے رشید احمد کو ملامتی نظروں سے دیکھا کیونکہ وہ اس سلسلے میں اُس کے ساتھ جھگڑ چکا تھا۔ جب کہ بیٹی کے سامنے کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا۔

☆.....☆

اُسود علی ہوٹل کے کمرے میں پڑا کافی بے چین و مضطرب تھا۔ وقت تھا کہ کٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ تصور میں آنے والے کل کے حوالے سے بہت سی سوچیں متحرک تھیں۔ علیشہ سے حالِ دل کہنے کی جسارت کا بھی ارادہ تھا، نتیجے کی پروا کیے بغیر۔ اب تو وہ چاہتا یہی تھا کہ جلد از جلد علیشہ اُس کی زندگی میں شامل ہو جائے مگر اُسے علیشہ کو منانے اور قائل کرنے کا کوئی گُر، کوئی ہنر ہی نہیں آتا تھا۔

جب وہ سوچ سوچ کر تھک گیا تو کونے میں پڑی میز سے اپنا لیپ ٹاپ اُٹھا لایا۔ وقت گزارنے کا کوئی مشغلہ تو چاہیے تھا۔ اپنے ذاتی تصویری البم کو کھولتے ہوئے اُس نے علیشہ کی Pics کو کلک کیا۔ یادوں کے کئی لمحے نئے سرے سے اُس کے ذہن میں اُجاگر ہو گئے۔ علیشہ کے کئی پوز باری باری اُس کی نظروں میں سمانے لگے۔ تصویریں دیکھتے ہوئے وہ جیسے تصور میں اُسی سے مخاطب بھی ہونے لگا۔

''کوئی بات، کوئی کشش تو ہے تمہارے اور میرے درمیان علیشہ۔ ورنہ تمہاری بے رخی اور ناراضگی کے باوجود، میرا دل تمہاری طرف نہ لپکتا، نہ ہی تمہاری چاہ کرتا۔ کچھ تو ہے جو مجھے تم سے باندھتا ہے۔ میں تو اسے محبت کہتا ہوں۔ تم اسے کچھ بھی کہو، کوئی بھی نام دو، آخر تمہیں یقین کرنا ہی پڑے گا کہ میرے دل میں صرف اور صرف تمہاری چاہت ہے۔ میری طلب میں صرف تمہارا ساتھ ہے اور میرے دل کو یقین بھی ہے کہ ہمارا ساتھ ہمیشہ کا ہے۔ میرے نصیب کا ہر راستہ تمہاری طرف ہی جاتا ہے۔ ایک دن تم بھی اس حقیقت کو مان جاؤ گی۔''

اُس کی نظریں علیشہ کی تصویر پر تھیں اور وہ اُسی سے مخاطب بھی تھا۔ عجیب سا سرور اُسے اپنے رگ و پے میں دوڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ عزت، یہ کیف اُس کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ اُس کی پیشکش پر اُس کے ساتھ ایک شام گزارنے پر آمادہ تھی، گویا اُس کی زندگی میں کچھ گنجائش تو تھی۔

اِس موقع سے فائدہ اُٹھانے کا اُسے ہی کوئی لائحہ عمل اختیار کرنا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد ایک خوب صورت پلاننگ اُس کے دل کو لگی، تب ہی وہ مطمئن ہو کر سو پایا تھا۔

☆.....☆

سنبل جان بوجھ کر کافی دیر لگا کر کمرے میں آئی تھی۔ عباد پلٹ کر معذرت کرنے بھی نہیں آیا تھا۔ یہ ان بھائیوں کی سب سے بڑی خامی تھی۔ اپنی غلطی کے باوجود اپنی انا میں رہتے تھے۔

''کیا بات ہے آج مجھے کھانے کے بعد چائے نہیں ملنی تھی۔'' عباد نے اُسے ایسے مخاطب کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''بھیجی تو تھی پروین کے ہاتھ۔'' سنبل سپاٹ لہجے میں جواب دیتی کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھ گئی۔

''بالکل بکواس چائے تھی وہ تو..... تم نے خود نہیں بنائی ہوگی نا۔'' عباد نے کروٹ بدل کر اُس کی طرف رخ کر کے متوجہ کیا۔ وہ مسلسل الماری میں منہ گھسائے کھڑی کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

''تو اکیلی میں کیا کیا کروں۔ انسان ہی ہوں، مشین تو نہیں ہوں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہو گئی اور آخر میں اُس کے لہجے میں نمی گھل گئی۔ عباد اپنے رویے پر نادم ہوا۔

''تو کون تمہیں مشین کہہ رہا ہے؟'' وہ اُٹھ کر اُس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

''صرف زبان سے نہیں کہا گیا اور نہ سمجھتا تو مجھے یہاں ہر کوئی مشین ہی ہے، جس کے نہ احساسات ہوتے ہیں، نہ جذبات۔'' وہ عباد کے اپنے کندھوں پر ٹھہرے ہاتھ سرد مہری سے ہٹا کر کپڑوں کا ہینگر لے کر ہینگنگ راڈ پر لٹکانے لگی۔

''تم میرے بارے میں تو یہ مت کہو۔ Really مجھے ہی تو تمہارے احساسات و جذبات کا خیال ہے۔ اُس وقت مما کو خاموش کروانے کے لیے میں نے مصلحتاً تمہیں ڈانٹا تھا۔'' عباد نے زبردستی اُس کا رخ اپنی جانب موڑا۔

''مصلحتاً؟ مصلحتاً کسی کو ذلیل کرتے جاؤ اور کہو کہ.....'' سنبل ایک بار پھر رو دی۔ عباد کے لیے اُسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ کبھی کبھی ہی احتجاجاً بول اُٹھتی تھی۔ ورنہ تو اُس نے ہمیشہ صبر سے کام لیا تھا۔

''اچھا پلیز..... اب رونا تو بند کرو۔ آئندہ تمہیں کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔ دیکھو میں کان پکڑتا ہوں۔ میرے باپ کی توبہ..... سوری..... موڈ ٹھیک کرو نا۔'' عباد نے واقعی کان پکڑ لیے، تو وہ آنسو بھری آنکھوں سے دیکھے گئی مگر چاہ کر بھی مسکرا نہیں سکی۔ تکلیف ہی اس قدر ہوئی تھی۔

''کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ اسی لیے موڈ ٹھیک نہیں ہوا۔ اچھا آؤ تمہیں پزا کھلا کے لاتا ہوں۔'' عباد نے اُس کا بازو تھام کر اپنی جانب کھینچا۔

''نہیں مجھے کچھ بھی نہیں کھانا اب۔ میں بس اب سونا چاہتی ہوں۔''

اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط
ماہ ستمبر میں ملاحظہ فرمائیں

مکمل ناول

عقیلہ حق

میں، محبت اور چاند رات

محبت اعزاز کی طرح عطا کی جاتی ہے اور تمغے کی طرح سینے پر سجائی جاتی ہے۔ زینب نے بھی حیدر کی محبت اعزاز کی طرح وصول کی تھی اور اب اپنی زندگی کی سب سے حسین چاند رات کو وہ بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی، سو جب تک حیدر رہا دہ......

سطر سطر محبت میں ڈوبی ایک خاص تحریر، مکمل ناول کی صورت

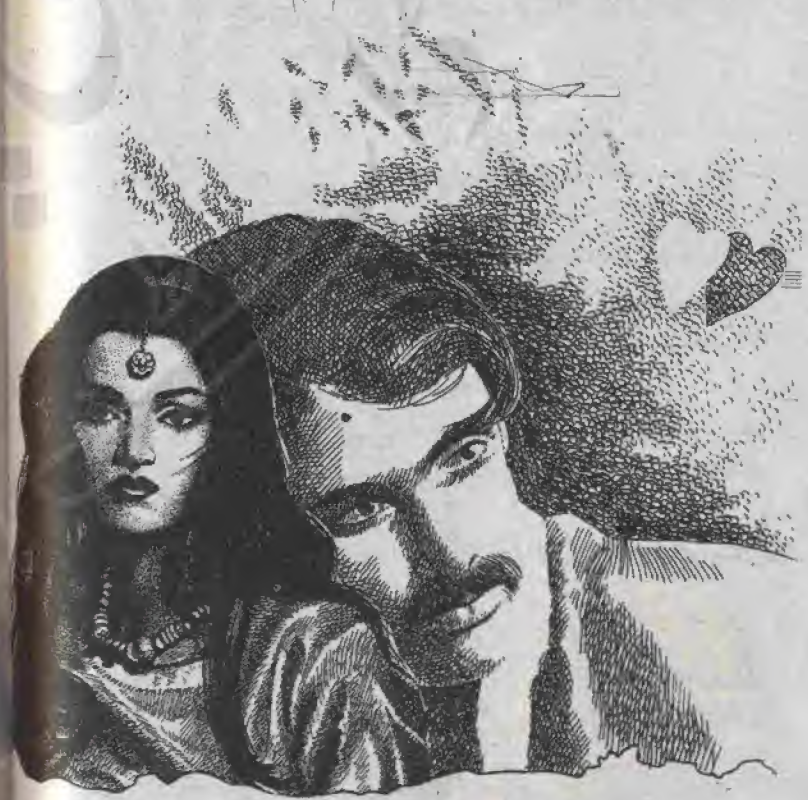

آج انتیسواں روزہ تھا۔ سورج سارا دن تمازت پھیلانے کے بعد آہستہ آہستہ مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سورج کی اورنج ہوتی کرنیں آسمان کو ایک عجیب سی طمانیت دے رہی تھیں، قوی امید تھی کہ آج چاندرات ہو۔

''چاندرات'' اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور برآمدے میں آ کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف ایک اُداس سی نگاہ ڈال کر اُس نے گردن جھکا کر گھر میں مہکتے پھولوں کی خوب صورتی کو دیکھا اور پھر ایک گہرا سانس لے کر اُن کی خوشبو اپنے اندر اُتارنے کی کوشش کی لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر کوشش بار آور ہو، پھر اُس نے تیزی سے غروب ہوتے سورج پر ایک افسردہ سی نظر ڈالی اور اُس لمحے جب افسردگی اُس کی رگوں میں سسکنے لگی اور آنکھیں برسنے کو تھیں کہ دروازے کی تسلسل بجتی اطلاعی گھنٹی نے اُس کو حال میں واپس کھینچ لیا۔

اُس نے چند لمحوں تک انتظار کیا کہ شاید کوئی دروازہ کھول دے یا آنے والا مایوس ہو کر پلٹ جائے لیکن شاید آنے والا جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر سے خاموش گھر میں نظریں دوڑائیں لیکن کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا اور دروازے کی مسلسل بجتی گھنٹی نے اس کو مجبور کر ہی دیا کہ وہ اپنی دنیا سے نکل کر دیکھے کہ دروازہ پر کون ہے اور پھر بوجھل قدموں سے جا کر اُس نے دروازہ کھول دیا۔

☆......☆

''محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔'' شافعہ نے پُرزور طریقے سے کہا۔

''جی نہیں، اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ بس دیکھا اور محبت ہوگئی۔ بلکہ اب تو محبت باقاعدہ پلاننگ سے کی جاتی ہے بلکہ اَب تو محبت کا زمانہ ہی نہیں رہا اب تو Life plane کی جاتی ہے۔ اقرارِ محبت سے پہلے باقاعدہ سوچا جاتا ہے۔'' راحت نے شافعہ کی مخالفت میں دلیل دی۔

''اور جو محبت کی جاتی ہے وہ محبت کب ہوئی، وہ تجارت ہوئی اور ہم تجارت کی بات تو نہیں کر رہے، ہم تو محبت کو تلاش کر رہے ہیں۔'' ثوبیہ نے زولوجی کا جرنل بند کر کے گفتگو میں حصہ لیا۔

''اب محبتوں کا زمانہ نہیں رہا، وہ جو طوفانی عشق کرتے تھے نا لیلیٰ مجنوں والا عشق وہ لوگ خاک پیوند ہو چکے ہیں۔ اب زندگی پریکٹیکل ہوگئی ہے، لوگوں کی سوچ کا انداز بدل گیا ہے۔ اَب لڑکے، لڑکیاں دونوں ہی محبتوں سے زیادہ ضرورتوں کو نظر رکھتے ہیں۔ اَب وہ زمانہ گیا۔ جب لڑکیاں سوچتی تھیں کہ بس محبت مل جائے۔ روٹی ملے یا نہ ملے۔ محبت پیٹ بھر دے گی۔ لہٰذا میں بار بار کہوں گی کہ محبت کی جاتی ہے۔ محبت ہو نہیں جاتی۔'' راحت اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

''ارے ہم لوگ دنیا کے اتنے بڑے مسئلے پر اُلجھے ہوئے ہیں اور تم خاموش بیٹھی ہو۔ تم کیوں نہیں بول رہیں۔'' شافعہ نے خاموش بیٹھی زینب کو گھورتے ہوئے کہا۔

''میں کیا بولوں؟ جب سب ہی بولنے لگیں گے تو سنے گا کون؟ اَب کوئی سننے والا بھی ہو تو مائی ڈیئر فرینڈز۔ میں تم لوگوں کے اہم خیالات سے استفادہ حاصل کر رہی ہوں۔'' زینب نے آلو چھولوں سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔

آج یونیورسٹی میں ہفتہ طلباء کا پہلا دن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ لوگ آڈیٹوریم سے ''محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے'' کے عنوان کے تحت زوردار تقاریر سن کر باہر آئی تھیں۔ تقریری مقابلہ ختم ہو گیا تھا۔ جیتنے والی لڑکی اپنے حصے کی ٹرافی اُٹھائے گھر

پہنچ گئی ہوگی لیکن وہ لوگ ابھی تک اُس موضوع میں اُلجھی ہوئی تھیں۔

''بکواس مت کرو۔ زینب تم بھی اپنی رائے دو۔'' ثوبیہ نے اُس کے ہاتھ سے چھولوں کی پلیٹ چھین کر خود کھاتے ہوئے کہا۔

''محبت کی جاتی ہو یا نہ ہو لیکن غنڈہ گردی ضرور کی جاتی ہے۔ شرافت سے چھولے واپس کرو۔'' زینب نے چھولوں کی پلیٹ چھیننے کی کوشش کی جس میں وہ مکمل طور پر ناکام رہی۔

''کس قسم کے گھٹیا پن کرنے کے بجائے تم اپنی رائے دو۔'' ثوبیہ نے چھولوں کی پلیٹ جلدی سے ختم کر کے خالی پلیٹ اُس کے سامنے رکھی اور پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' زینب نے کوئی راہ نہ پا کر ایک لمبی سی سانس کھینچی اور پھر جیسے خلاؤں میں اس کی نگاہیں جم سی گئیں اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''محبت'' اور لفظ محبت پر جیسے اُس کے لب ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے اور آنکھیں......

☆......☆

''اچھا تم یہ بتاؤ کہ تم امتحانوں میں اتنی اچھی نقل کیسے کر لیتی ہو کہ ہر سال ہی پاس ہو جاتی ہو۔'' حیدر نے اُس کا رول نمبر اخبار میں تلاش کرتے کرتے اچانک سر اُٹھا کر اُس سے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' زینب جو آیۃ الکرسی پڑھتے ہوئے حق دق نظروں سے تیزی سے رزلٹ تلاش کرتے ہوئے حیدر پر نظریں جمائے کھڑی تھی، حیرت سے بولی۔

''میرا مطلب ہے مس زینب رفاقت علی صاحبہ کے وہ کون سے Cheating طریقے ہیں جن کو اپلائی کر کے آپ جیسی لڑکی، ہر سال فرسٹ آجاتی ہے۔'' حیدر نے زینب کے فق چہرے کو دیکھتے ہوئے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا ہو گیا ہے حیدر بھائی۔ میں کیوں نقل کروں گی اور آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں، میرا رول نمبر ڈھونڈیے نا۔'' زینب حیدر کی بے سروپا باتوں پر کوفت سے بولی۔

''بے وقوف میں بہت Related سوال پوچھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے تم کبھی بھی اپنی ذہانت سے فرسٹ کلاس نہیں لے سکتیں۔'' حیدر نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''فرسٹ کلاس نہیں لے سکتیں۔'' زینب زیرِ لب بڑبڑائی۔ ''اس کا مطلب ہے...... اِس کا مطلب ہے۔'' اُس کی آنکھیں پھیلیں اور اُس نے حیدر کی مسکراتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اخبار اُٹھایا۔

''میں...... میں فرسٹ آئی ہوں۔ ہے نا حیدر بھائی۔'' وہ خوشی سے چلائی۔

''جی ہاں محترمہ...... میں صحیح تو کہہ رہا ہوں۔ اگر تم اپنی صلاحیتوں سے پاس ہوتیں، اگر تم نے نقل نہ کی ہوتی تو اتنی سی بات سمجھنے میں تم کم از کم آدھا دن نہ لگاتیں۔'' حیدر نے بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں والی زینب کو مسکراتی آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''اماں...... اماں میں فرسٹ آئی ہوں۔'' زینب اُس کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اندر کی طرف بھاگی، جہاں اماں بیٹھی ابا کے لیے کُرتا کاڑھ رہی تھیں۔

'باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن بے وقوف لڑکی تم مجھے بھائی کیوں کہتی ہو' حیدر نے مسکراتے ہوئے سوچا اور پھر زینب کا دلکش سراپا آنکھوں میں قید کر کے آنکھیں موند لیں۔

حیدر، وقاص کے بچپن کا دوست تھا اور وقاص، زینب کا بڑا بھائی۔ سید رفاقت علی کے دو ہی بچے تھے، وقاص اور زینب۔ رفاقت علی ایک سفید پوش گھرانے کے سربراہ تھے، رفاقت علی کا گھرانہ ایک ایسا سفید پوش گھرانہ تھا جہاں پیر پھیلاتے ہوئے دس بار سوچا جاتا لیکن قناعت اور شکر گزاری اس گھرانے کی بہت ساری خصوصیات میں سے ایک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی ضرورت کے لیے بلا ضرورت پریشانی نہ اُٹھانی پڑی اور حیدر، جو ایک بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ اس گھرانے کے اندر ایک فرد ہی کی حیثیت رکھتا تھا اور آفس سے آنے کے بعد وہ اپنے شاندار گھر کے بجائے، زیادہ تر اس گھر میں پایا جاتا جہاں کبھی بجلی چلی جاتی تھی اور کبھی پانی۔

☆.....☆

"یا اللہ! آپ لوگ کب تک کھیلتے رہیں گے۔" زینب نے چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور خود بھی دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ "بس چائے پئیں اور ختم کریں یہ کیرم ویرم، مجھ کو صفائی کرنی ہے۔"

حیدر اور وقاص نہ جانے کب سے بیٹھے کیرم کھیل رہے تھے کیونکہ آج اتوار کا دن تھا اور اتوار کا سارا دن حیدر، وقاص کے ساتھ گزارتا تھا۔ آج بھی حیدر صبح سے آیا ہوا تھا اور وہ دونوں کیرم جما کر بیٹھ گئے تھے۔ زینب صفائی کرنے کے لیے پریشان ہو رہی تھی کہ اُس کو اپنا کام نمٹا کر اپنی واحد دوست طیبہ کے گھر جانا تھا۔ زینب کئی بار آ کر کہہ چکی تھی لیکن حیدر اور وقاص اُس کی بات پر توجہ ہی نہیں دے رہے تھے۔

"وقاص....." اماں نے آواز دی اور وقاص اپنی چائے اُٹھا کر اماں کی بات سننے چلا گیا اور زینب کو یہ موقع انتہائی مناسب لگا۔

"حیدر بھائی میں کیرم اُٹھا رہی ہوں۔" زینب نے تیزی سے گوٹے سمیٹتے ہوئے کہا۔

"چلو ظالم لڑکی، سمیٹ لو کیرم۔" حیدر نے دُکھی ہونے کی ایکٹنگ کی۔

"خیر حیدر بھائی، مجھے ظالم تو نہ کہیں۔" زینب نے جلدی جلدی کشن صوفوں پر رکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تم مجھے حیدر بھائی کیوں کہتی ہو؟" حیدر نے بھی چائے کا کپ اُٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔

"تو کیا کہوں؟"

"کچھ بھی کہہ لو لیکن بھائی نہیں۔" حیدر نے آہستگی سے کہا۔

"چلیں اَب میں آپ کو بھائی جان کہہ دیا کروں گی۔" زینب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن سوچ لیجیے "بھائی جان" سے تصور میں ایک بڈھے سے حیدر بھائی تصور میں آتے ہیں۔"

"تو کیا صرف "جان" سے کام نہیں چل سکتا۔" حیدر اُس کے قریب آ کر اُس کے کان میں گنگنایا۔

"جی۔" وہ اُس کے لہجے پر چونکی اور حیدر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ ہاتھ روکے اُس کے لہجے میں اُلجھی کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆.....☆

کچھ لوگ لگتا ہے بہت ہی خاص مٹی سے بنے ہوتے ہیں اور زینب کا شمار بھی اُن ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف ایک اچھی بیٹی اور بہن تھی بلکہ بی ایس سی سال اول کی ایک بہت اچھی اسٹوڈنٹ بھی تھی۔ وہ بہترین ڈبیٹر، بہترین شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی سادہ مزاج لڑکی بھی تھی۔

اُس کی تربیت میں اُس کی ماں کا ہر ماں کی طرح ایک اہم کردار تھا اور انہیں اپنی بیٹی پر فخر تھا۔ فخر تو اُس پر حیدر کو بھی تھا اور یہ فخر کب پسندیدگی میں ڈھلا اور پسندیدگی کب محبت کی مسند پر جا بیٹھی اس کا اندازہ حیدر کو بھی نہیں ہوا۔ حیدر اکثر سوچتا کہ کب وہ زینب کی محبت میں گرفتار ہوا تو اُس کو سرا نہیں ملتا تھا۔ کبھی کبھی اُس کو لگتا وہ جنم جنم سے ہی اُس کے عشق میں گرفتار ہے اور زینب حیدر کی دلی کیفیات سے بے خبر، اپنی ہی دنیا میں گم تھی اور زینب کی یہی لاپروائی اور سادگی حیدر کو پاگل کرتی تھی۔

حیدر جو وقاص کا واحد اور بہترین دوست تھا، شہر کے ایک مالدار ترین گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ حیدر کے والد شہر کے بہت بڑے بزنس مین تھے اور دو بہنوں سے چھوٹا حیدر اُن کا لاڈلا اور چہیتا تھا۔ حیدر اور وقاص کی دوستی کو کبھی حیدر کے گھر والوں نے ناپسند نہیں کیا تھا کیونکہ حیدر کی خوشی میں ہی اُس کے گھر والوں کی خوشی تھی اور حیدر کی خوشی کیا تھی۔ اس کا ابھی تک کسی کو اندازہ ہی نہیں تھا۔

حیدر کے سرکل میں لڑکیاں اُس کے گرد پروانوں کی طرح گھومتی تھیں لیکن حیدر جو ایک کامیاب بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بولڈ بھی تھا، وہ تو کسی اور کا پروانہ تھا۔

کہتے ہیں محبت انسان کو کمزور بنا دیتی ہے اور حیدر بھی اُس سادہ سی، عام سی لڑکی کے سامنے کمزور پڑ جاتا تھا۔ الفاظ اُس کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ وہ زینب سے اظہارِ محبت کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کیونکہ زینب کے کردار کی پختگی اور مزاج کی سادگی اُس کو ڈراتی تھی کہ اگر اُس نے انکار کر دیا..... اگر وہ بُرا مان گئی تو..... حیدر گھنٹوں بیٹھا یہی سوچتا رہتا۔

محبت پر بند باندھنا مشکل ہوتا ہے۔ محبت اور سیلاب کبھی رکا ہے.....!

☆.....☆

رفاقت علی اور کلثوم بیگم کے لیے حیدر اور وقاص میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یوں تو رفاقت علی اس مزاج کے آدمی تھے کہ جو اُن کے اپنے بھانجے، بھتیجے دو سے تین دفعہ گھر آ جائیں تو اُن کو ناگوار گزرتا کہ لڑکوں کا گھر میں کیا کام؟ لیکن حیدر..... حیدر تو اُن کے لیے وقاص جیسا ہی تھا۔ حیدر سے اُن کو ایک عجیب سی اُنسیت تھی۔ حیدر وہ واحد لڑکا تھا جس کے برجستہ جملے اُن کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے ورنہ مزاجاً وہ ایک ایسے آدمی تھے کہ اُن کے ہم عمر بھی اُن سے سنبھل کر بات کیا کرتے تھے لیکن حیدر کے لیے اُن کا قانون ہی الگ تھا۔

ہر اتوار کو وہ کھانا رفاقت علی کے ساتھ، اُن کے دونوں بچوں کی طرح کھاتا اور اُس کا یہ معمول برسوں سے تھا۔

حیدر وقت اور وعدے دونوں کا بہت پابند تھا اور جو کبھی اُس کو آنے میں معمولی سی تاخیر بھی ہو جاتی تو رفاقت علی بے چین ہو جاتے۔ کبھی کبھی کلثوم بیگم اُنس کر میاں کو چھیڑتیں۔

"لگتا ہے حیدر، وقاص کا نہیں آپ کا دوست ہے۔" تو وہ متانت سے جواب دیتے۔

"بھئی وقاص کا تو وہ دوست ہے لیکن میرا تو بیٹا ہے اور وہ تو اِس قدر محبت کرنے والا باادب لڑکا ہے اگر کوئی اُس کو پسند نہ کرے تو میں سمجھوں گا کہ وہ بدنصیب ہے۔" پھر وہ کلثوم بیگم سے پوچھتے۔ "چلیے چھوڑیے میری بات۔ یہ بتائیے آپ نے بھی تو آج اُس کی پسند کا کھانا بنایا ہے۔" تو وہ ممتا بھرے لہجے میں کہتیں۔

"ہاں وہ میرا بھی تو بیٹا ہے۔" پھر ہنستیں اور شرارت سے کہتیں۔ "سوچ لیجیے دو جوان بیٹوں کی ماں ہوں میں۔"

یوں حیدر اِس محبت بھرے گھر کا ایک فرد تھا، اُسے اپنے وسیع و عریض عالیشان گھر، جس کا کونا کونا قیمتی نوادرات سے سجا تھا، جس کو ہر سال اِٹلی سے

انٹریئر ڈیکوریٹر آکر ری سیٹ کرتے تھے، یہ گھر جس میں سفید چاندنیاں بچھے، عام سے صحن اور موتیا کے پھولوں سے مہکتا یہ گھر پسند تھا جہاں خلوص تھا، محبتیں تھیں، سادگی تھی اور جہاں زینب تھی۔

☆.....

'زینب.....زینب.....' حیدر نے بند آنکھوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ دل ہی دل میں زینب کو پکارا۔ دراز قد، گندم کی طرح دمکتا اور سونے کی طرح دہکتا رنگ، بڑی بڑی خوصورت پلکوں سے ڈھکی ذہین براؤن آنکھیں۔ تراشیدہ ہونٹ اور ہونٹوں کے دائیں طرف ٹھوڑی سے ذرا اوپر وہ سیال تل۔ خوب صورت حسین مسکراہٹ، پھولوں کی ڈال کی طرح لچکتا بدن، کمر پر پھیلے آبشار کی طرح بال اور بالوں کو اپنے حصار میں لیا ہوا وہ مکمل کا سفید نماز کا دوپٹہ۔ نماز.....ہاں زینب کی بہت ساری اچھی عادتوں میں سے ایک اُس کا پنج وقتہ نمازی ہونا بھی تو تھا۔

حیدر اکثر سوچتا یا اللہ! یہ لڑکیاں کہاں تخلیق ہوتی ہیں اور پھر کوئی اس کے اندر سے جواب دیتا کہ شریف ماؤں کے بطن سے ایسی ہی لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں اور گھروں کے اندر مکمل ترین ماؤں کی بھٹیوں میں ایسی لڑکیاں پلتی ہیں۔ جن کی پلکوں پر حجاب ہوتا ہے، جن کی سانسوں میں گلاب ہوتا ہے، جن کا وجود نایاب ہوتا ہے۔''

حیدر جب بھی زینب کو لمبے لمبے سجدے کرتے دیکھتا تو اُس کے اندر ایک اطمینان اُبھرتا، حیدر جس نے کبھی اپنے گھر میں کسی کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا اور جب وہ سفید دوپٹے کے ہالے میں گیلے چہرے کے ساتھ زینب کو نماز پڑھتے دیکھتا تو وہ لمحہ اُس کو حاصلِ زندگی لگتا کیونکہ مرد جب بیوی چننے کھڑا ہوتا ہے تو اُس کی ترجیح ایک پاکباز عورت ہوتی ہے اور زینب تو پھر زینب تھی۔

زینب اُس کو کب سے اچھی لگتی تھی وہ سوچنا بھی چاہتا تو اُس کو یاد نہ آتا۔ شاید جب سے، جب دو پونیاں باندھے ابا کی اُنگلی پکڑے اسکول جاتی تھی یا شاید تب سے جب سیاہ چادر میں لپٹی نظریں جھکائے اُس نے کالج جانا شروع کیا۔ نہ جانے کب سے! حیدر سوچتا اور پھر اپنے آپ سے کہتا، کب سے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، زینب صرف میرے لیے پیدا ہوئی ہے۔ زینب پیدا ہی محبت کے لیے ہوئی ہے اور میں زینب سے محبت کرتا ہوں۔ بے پناہ، بے انتہا، بے تحاشا محبت! لیکن زینب کیا سوچتی ہے یہ فکر اس کو بے چین کر دیتی کہ کیا زینب اُس کی محبت کا جواب محبت سے دے گی؟ کیا زینب ایک ملکہ کی طرح اُس کو اپنی محبت دے دے گی۔

☆.....

''امی دیکھیے نا، میں کتنی دیر سے وقاص بھائی کی خوشامدیں کر رہی ہوں لیکن وہ میری بات بالکل نہیں سُن رہے۔'' زینب نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کلثوم بیگم سے وقاص کی شکایت کی۔

''اچھا میں کہتی ہوں،'' کلثوم بیگم نے سبزی کی ٹوکری ایک طرف کرتے ہوئے اندر نظر ڈالی۔

''امی پلیز میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ وقاص بھائی کو میرے ساتھ فرح کے گھر بھیجیں۔ مجھے ہر حال میں اپنا جرنل لینا ہے۔ کل جرنل certify کروانے کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔ امی پرسوں میرا پریکٹیکل ہے اور اگر جرنل certify نہیں ہوا تو میں پریکٹیکل نہیں دے سکتی، لیکن بھائی کو میرے امتحانات سے زیادہ اپنے کرکٹ میچ کی فکر ہے۔ وہ ٹی وی کے آگے سے اُٹھ ہی نہیں رہے۔ پہلے مجھ سے اپنے سارے کام کروالیے اَب کہہ رہے ہیں کہ میچ ختم ہوئے بغیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ جائیں اور.....''

''تو تم میرے ساتھ چلی چلو۔'' حیدر کب سے کھڑا زینب کی روئیداد سُن رہا تھا۔ زینب کے ساتھ ساتھ کلثوم بیگم بھی چونک گئیں۔

''آپ کے ساتھ۔'' زینب ہچکچائی۔ یہ الگ بات تھی کہ حیدر، رفاقت علی کے گھرانے میں ایک فرد کی حیثیت رکھتا تھا لیکن زینب کبھی بھی اکیلی اُس کے ساتھ باہر نہیں گئی تھی۔ اِس لیے حیدر کی آفر نے اُس کو تذبذب کا شکار کر دیا۔

''ہاں ہاں بیٹا اتنا ضروری جانا ہے تو حیدر کے ساتھ چلی جاؤ۔ حیدر بھی بھائی ہے تمہارا۔'' کلثوم بیگم نے کچھ سوچتی زینب سے کہا اور نہ جانے کیوں حیدر کا حلق اندر تک کڑوا سا ہو گیا اور اُس نے خاموشی سے پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

''کہاں جانا ہے؟'' اَب کے حیدر کی آواز پست تھی۔

''ارے میرے بچے، جیتے رہو۔ اللہ تمہیں ہزار برس کی زندگی دے۔ ذرا اِس کو، اِس کی سہیلی کے گھر پاپوش لے جاؤ۔ اِسے کوئی جرنل، ورنل لینا ہے۔''

''اور تم کیوں کھڑی ہو، یا تو چین نہیں لینے دے رہی تھیں یا پھر فرصت سے کھڑی ہو۔ جاؤ اندر سے چادر اُوڑھ کر آؤ پھر حیدر کے ساتھ جا کر اپنا جرنل لے آؤ۔'' کلثوم بیگم بات ختم کر کے دوبارہ شلجم چھیلنا شروع ہو گئیں اور زینب گنگناتے ہوئے حیدر کے پیچھے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

کہتے ہیں عورت کے اندر اللہ کی طرف سے ایک خاص الارم فٹ ہوتا ہے اور جب کسی مرد کی نگاہ بدلتی ہے، تو وہ الارم بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ لاکھوں کے مجمع میں عورت کی نگاہ ''اُس'' مرد کی طرف اُٹھتی ہے جو اُس کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور جس نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے عمر کے ہر دور میں عورت اُس نظر کو پہچان لیتی ہے اور مرد جب کسی عورت سے محبت کرنے لگتا ہے تو اُس کی نگاہ استہاری سی بن جاتی ہے، اُس کی آنکھیں، اُس کے ہونٹ، اُس کے ماتھے کی لکیریں، اُس کے بال زور زور سے کہنے لگتے ہیں، میں تم سے محبت کرتا ہوں! میں تم کو چاہتا ہوں اور عورت، عورت تو راز دار ہوتی ہے۔ وہ اپنی محبت کو اپنے آپ سے بھی چھپاتی ہے۔ عورت کو کھولنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ عورت کے منہ سے اقرارِ محبت کروانا بہت آزمائش طلب ہوتا ہے۔

گاڑی میں حیدر کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ زینب کے اندر کی عورت سمٹ رہی تھی۔ زینب کے اندر الارم بجنے لگا تھا۔ جس کو وہ بجتے ہی بند کر دیتی تھی کہ دل جو محسوس کر رہا تھا، دماغ اُس کو ماننے سے انکار کر رہا تھا لیکن کبھی دل کے معاملے میں دماغ کی چلی ہے..... زینب ایسا کیوں کر رہی ہے۔ حیدر بس سوچتا ہی رہ گیا۔

☆.....

''کیا بات ہے حیدر تم آج کل اپنے دوست وقاص کے گھر کچھ زیادہ ہی جانے لگے ہو۔'' آج جب حیدر Royal کلب سے گھر آیا تو مسز احتشام نے اُس سے پوچھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اَب وہ جلدی جلدی چائے صرف اس لیے پی رہا ہے کہ اُس کو وقاص کے گھر جانا ہے۔

''آج کل.....'' وہ چائے کا کپ سینٹر ٹیبل پر رکھ کر کے بے ساختہ ہنسا۔ ''ارے ممی میں تو ہمیشہ ہی سے وہاں بہت جاتا ہوں اور آپ کو آج احساس ہوا ہے۔'' حیدر کو تعجب ہوا۔

''دیکھو حیدر میری جان! بچپن بچپن ہوتا ہے۔ ہمیں تمہاری اور وقاص کی دوستی پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ہر چیز کی ایک Limit ہوتی ہے۔ تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو، تم وقاص کے ساتھ خوش رہتے تھے اور سب سے اہم بات بچپن ساری زندگی کا اساس ہوتا ہے اور وقاص تمام مڈل کلاس بچوں کی طرح

ایک ذہین اسٹوڈنٹ تھا۔ تو ہم لوگوں نے یہ سوچا کہ اُس کی دوستی، تم کو بھی کتابوں میں گم رکھے گی اور ایسا ہوا بھی۔'' اُس کی بڑی بہن شائلہ جو اسلام آباد سے آئی ہوئی تھی۔ اُس نے ماں کی بات کو بڑھاوا دیا۔

''یا اللہ! آپ لوگوں نے میری بے لوث دوستی میں بھی اپنا مفاد ڈھونڈ رکھا تھا جو کم از کم میرے علم میں نہیں تھا۔'' حیدر نے تاسف سے کریم کلر کی سلک کی ساڑی میں ملبوس اپنی گریس فل ماں کو دیکھا جس کو آج تک یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس کو کھانا کیا پسند ہے؟ اور وہ کس بات سے خوش ہوتا ہے اور کس بات پر رنجیدہ۔ حیدر کو واقعی ایک عجیب سا دکھ ہوا تھا۔

''ظاہر ہے میری جان! جو لوگ زندگی میں اپنے مفاد مدِ نظر نہیں رکھتے وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔'' بیگم احتشام نے تائیدی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا جو ہر لحہ اُن کی ہم خیال تھی۔

''ہم کو تمہاری وقاص کے ساتھ دوستی میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بیٹا اپنے اسٹیٹس کا بھی خیال رکھو۔ تم تو اپنے سرکل سے گٹتے جا رہے ہو۔ ہم جیسے لوگوں میں بیٹھتے ہیں ہمارا Status of mind بھی ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ عنقریب تمہارے بابا تمہارے نام سے ایک فیکٹری لگا رہے ہیں۔ تم بزنس سرکل میں پریکٹیکلی داخل ہو رہے ہو۔ عام لوگوں سے ملو گے تو عام فیصلے ہی کرو گے۔''

''عام لوگ!'' حیدر کی نگاہوں میں رفاقت علی کا سراپا گھوما۔ ''ممی آپ لوگ عام لوگ کن لوگوں کو کہتے ہیں۔'' حیدر کا لہجہ کھردرا سا ہو گیا۔

''ہم اُن ہی لوگوں کو عام لوگ کہہ رہے ہیں جن کو تم سمجھ رہے ہو۔'' شائلہ نے ایک ادا سے چہرے پر آئی بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے اُڑسا۔

''بغیر کسی بحث کے، تم کبھی کبھی ضرور ملو لیکن ہر وقت کا رابطہ ختم کرو۔'' مسز احتشام کے لہجے میں سفاکی تھی۔ ''اور ساتھ ساتھ اب اپنے سرکل میں زیادہ آیا جایا کرو اور ہاں کل تم کو میرے ساتھ مسز رحمن کے ہاں ڈنر پر چلنا ہے۔'' مسز احتشام نے بے زاری سے کھڑے حیدر کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''خیر حیدر ایک Good news for you۔'' شائلہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور اُس کو اپنے برابر بٹھالیا۔

''اب کون سی بات رہ گئی آپ خاص لوگوں کے پاس۔'' حیدر کا لہجہ خود بخود طنزیہ ہو گیا کہ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اِن لوگوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بتائے کہ جن لوگوں کو یہ عام لوگ کہہ رہے ہیں، وہ حیدر کے لیے کتنے خاص ہیں۔ ماں کیا ہوتی ہے؟ یہ وقاص کی ماں نے اُس کو بتایا۔ باپ کی شفقت اور دوستی اُس نے رفاقت علی کی محبت میں محسوس کی۔ بھائی بہن کی محبت، اِس رشتے کی چاشنی اُس نے وقاص اور زینب کے درمیان محسوس کی۔ اور پاکیزگی کیا ہوتی ہے! زندگی کہاں سانس لینا بھول جاتی ہے۔ کہاں دل چاہتا ہے کہ سب کچھ وار دیا جائے، وہ بات زینب میں تھی، صرف زینب میں۔

''ارے تم تو اب مڈل کلاس عورتوں کی طرح طنز بھی کرنے لگے ہو۔'' شائلہ ہنسی۔ ''ارے بھئی ہم آج کل تمہارے لیے لڑکیاں دیکھ رہے ہیں۔'' شائلہ نے اُس کے سر پر جیسے بم گرا دیا۔

''لڑکیاں اور میرے لیے.....!'' حیدر نے حیران نظروں سے مسکراتی ماں اور بہن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہاں تمہارے لیے۔ اگر کوئی تم کو پسند ہو تو بتاؤ۔'' مسز احتشام نے پیار بھرے لہجے میں اپنے لاڈلے سے پوچھا۔

''میری پسند.....'' حیدر کے لب بے

ساختہ مسکرائے۔

''ہاں تمہاری پسند۔'' مسز احتشام نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر تائیدی نظروں سے شائلہ کی طرف دیکھا لیکن شائلہ کی نظریں تو میز پر رکھے موبائل پر جم سی گئی تھیں اور اُس کا چہرہ خطرناک حد تک سفید ہو رہا تھا اور وہ دھک سے رہ گئیں۔

☆.....☆

''بیٹا بہت عرصہ ہو گیا تمہاری امی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ وہ شاید بہت مصروف رہتی ہیں۔ اب گھر میں میلاد شریف کروا رہی ہوں تو تمہاری امی کو بھی دعوت دینی ہے۔ اس بہانے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تمہاری امی کس وقت گھر پر ہوتی ہیں تاکہ ہم تمہارے گھر آئیں۔'' کلثوم بیگم نے حیدر سے تفصیلاً پوچھا اور حیدر جو خاموشی سے سر جھکائے قرآن پڑھتی زینب کو بہت احترام سے دیکھ رہا تھا، چونک گیا۔

''ارے اماں بس آپ مجھے بتا دیں، کس دن میلاد ہے۔ میں امی کو بتا دوں گا۔'' اس وقت اُس کو اپنے اور زینب کے درمیان اماں کی مداخلت اچھی نہیں لگی تھی۔ زینب قرأت کرتی ہوئی کتنی معتبر لگ رہی تھی۔

مرد محبت کے بارے میں بہت حساس ہوتا ہے۔ چاہے وہ ساری دنیا میں منہ مارتا پھرے لیکن جب وہ گھر بسانے کے لیے عورت کو دیکھتا ہے تو اُس کی اولین ترجیح پاکیزہ عورت ہوتی ہے اور زینب کی پاکیزگی کی تو وہ قسم کھا سکتا تھا۔

''ارے حیدر..... کہاں کھوئے ہوئے ہو بیٹا۔ میں کب سے بولے چلی جا رہی ہوں اور تم کوئی جواب ہی نہیں دے رہے۔'' کلثوم بیگم نے حیدر کا کاندھا ہلایا۔

''جی..... جی اماں یہیں تو ہوں۔'' حیدر کھسیانا سا ہو گیا۔ ''کیا کہہ رہی تھیں آپ؟''

''میں کہہ رہی تھی کہ دعوتیں اس طرح تھوڑی دی جاتی ہیں۔ میں خود جاؤں گی دعوت دینے، اس بہانے تمہارے گھر والوں سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ کیا ہوا جو تمہارے گھر والوں کو آنے کی فرصت نہیں ہوتی، میں مل آؤں گی۔ رشتے نبھانے پڑتے ہیں بیٹا اور میل جول، رشتوں کی زنجیر میں قفل ڈال دیتے ہیں۔ ہر رشتے کو کبھی کبھی ملاقات کے پانی سے سینچا جاتا ہے۔ ورنہ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں ختم ہو جاتے ہیں۔'' اماں نے اُس کو سمجھایا۔ یہ الگ بات تھی کہ حیدر جیسے English medium کے سر پر سے اماں کا فلسفہ گزر گیا لیکن وہ بیٹھا اس طرح سر ہلاتا رہا کہ وہ تو اس صدی کا سب سے بڑا مولوی عبدالحق ہو۔

''اب تم مجھے اپنے گھر کا پتا بتا دینا۔ تمہارا پرانا والا گھر تو میں نے دیکھا ہوا ہے لیکن کل ہی وقاص بتا رہا تھا کہ ماشاء اللہ تم لوگوں نے نیا گھر لے لیا ہے۔'' اماں نے باورچی خانے میں جاتے جاتے پلٹ کر حیدر سے کہا لیکن حیدر سُن کب رہا تھا۔ اُس کے چاروں طرف تو صرف سفید ململ میں لپٹا زینب کا معصوم چہرہ گردش کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے حیدر بھائی، کیا سوچ رہے ہیں؟'' زینب نہ جانے کب قرأت ختم کر کے، سوچوں میں گم حیدر کے لیے چائے لے کر آ گئی تھی۔

''تم اتنی ساری نمازیں کیسے پڑھ لیتی ہو زینب۔'' حیدر نے چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے، کھوئے کھوئے انداز میں زینب سے پوچھا۔

''اتنی ساری نمازیں کہاں پڑھتی ہو جو فرض ہیں بس وہی ٹوٹی پھوٹی ادا کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور یہ سوال تو انتہائی نامناسب ہے کہ کیسے..... کیسے کا کیا مطلب!! نماز بوجھ تھوڑی ہے کہ پڑھوں تو آپ

حیران ہوں۔ نماز تو اللہ اور بندے کا تعلق ہے۔ اللہ جن سے پیار کرتا ہے، ان کو نماز کی توفیق عطا کرتا ہے۔ نماز کا مطلب ہے اللہ سے ملاقات، اللہ سے بات کرنا۔ آپ خود ہی سوچیے ہمارے گھر کون آتا ہے۔ وہی نا جس سے ہم ملنا چاہتے ہیں اور اگر نہ ملنا چاہیں تو کوئی لاکھ دروازہ کھٹکھٹاتا رہے ہم کان بند کیے بیٹھے رہتے ہیں۔ تو نماز تو اعزاز ہے کہ اللہ ہمیں اپنے در پر بلا رہا ہے، ہم سے بات کر رہا ہے، ہماری التجا سن رہا ہے۔ ایک نماز پڑھنے سے ہم اپنے آپ کو بہت دیندار سمجھنے لگتے ہیں اور جب اللہ ہمیں ہماری اوقات سے بڑھ کر نوازتا ہے تو کبھی ہم کہتے ہیں کہ بس اللہ میاں کافی ہے۔ نہیں کہتے نا تو پھر صرف فرض نمازوں ہی پر اکتفا کیوں کرتے ہیں۔ جب ضرورت سے زیادہ مانگتے ہیں تو فرض سے زیادہ ادا بھی تو کریں۔ میں نماز کو بوجھ سمجھ کر ادا نہیں کرتی۔'' زینب نے حیدر کے برابر میں بیٹھ کر دھیمے دھیمے لہجے میں اپنی سوچ اُس پر واضح کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ حیدر کوئی پنج وقتہ نمازی نہیں ہے لیکن وہ چاہتی تھی کہ حیدر کم از کم پانچوں وقت نماز ادا کرے اور زینب کے خیال میں اس سے اچھا موقع نہیں ہو سکتا تھا۔ حیدر کو نماز کی طرف راغب کرنے کا۔

''میں چاہتی ہوں کوئی مجھے بُرا نہ سمجھے۔ سب مجھ سے خوش رہیں تو میں اپنے اللہ کو خوش کیوں نہ کروں؟ اور اپنے اللہ کی خوشی اور رضا کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں کہ

ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اماں خوش رہیں۔ ابا خوش ہو جائیں۔ وقاص کو تکلیف نہ ہو، اللہ خوش رہے۔''

''سب کی خوشی کا خیال ہے تمہیں اور میری خوشی..... حیدر کو آج اپنے فیصلے پر فخر ہو رہا تھا۔

حیدر نے شرارت سے زینب سے کہا۔

''آپ کی خوشی..... آپ کی خوشی کیا ہے؟'' زینب نے کھڑے ہوتے ہوئے زیرِ لب دہرایا۔

''محترمہ زینب رفاقت علی..... میری خوشی۔'' حیدر نے کھڑے ہو کر اُس کی شرارت سے مسکراتی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

''مجھے ہنسی نہیں آ رہی۔'' وہ ہنسی اور حیدر بھی ہنس دیا۔ کیوں کہ محبتوں میں جلدی نہیں کرتے اور حیدر تو محبت سے جینا چاہتا تھا۔ حیدر محبتوں میں وقت دینے کا قائل تھا اور زینب تو زینب تھی۔ جس کو وہ اُس کی رضا سے پانا چاہتا تھا۔

☆.....☆

''کبھی کبھی ایسا لگتا ہے میں جو کچھ محسوس کر رہی ہوں سب غلط ہے۔ میرا وہم ہے لیکن پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ہر وہم سچ لگ رہا ہے اور جب وہم سچ کا لبادہ اوڑھنے لگے تو کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ حقیقت ہوتا ہے۔ تو کیا میرا وہم صحیح ہے۔ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ حیدر بھائی کے انداز بدل رہے ہیں۔ کبھی وہ بھائی کہنے پر اعتراض کرتے ہیں اور کبھی اپنے لیے خوشیوں کا سوال کرتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں عجیب عجیب سوال کرتی ہیں اور میرا دل.....

میرے دل پر اختیار ہو
اور جو سوال کرنے والے کو انتظار ہو
میں اقرار کروں یا انکار کر دوں؟
میرے مالک مجھے اس بات کا اختیار ہو

نہیں..... نہیں میرا دل میرے اختیار میں ہے، ایسا نہیں ہو سکتا میں اور حیدر بھائی..... لاحول ولا قوۃ..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'

زینب اپنے آپ سے دعویٰ کر رہی تھی۔ وہ اپنے اندر اُٹھتے سوالوں کو رَد کر رہی تھی اور جو دعویٰ جھوٹا ثابت ہو جائے تو..... اور جو زینب گرفتارِ محبت ہو

جائے تو..... اقرارِ محبت کی ابتداء صدیوں سے انکار سے ہوتی ہے اور زینب بھی تو انکاری تھی۔

☆.....☆

''ہائے حیدر۔'' حیدر کو آرام سے کاؤچ پر لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا، نازیہ کی آواز پر چونکا۔

سفید و گلابی رنگ، خوب صورت نیلی آنکھیں، براؤن تراشیدہ بال، خوب صورت اسٹائلش سوٹ، ہاتھ میں قیمتی ہینڈ بیگ، ماہرانہ انداز سے چہرے کے نقوش کو اُبھارتا میک اپ..... یہ نازیہ تھی حیدر کی پھوپی زاد۔ حیدر نے سر سے پیر تک نازیہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''ویسے یار ایک بات تو بتاؤ، آج کل سلام دعا کا فیشن ختم ہو گیا ہے کیا؟'' حیدر نے اُس کے قریب کھسک کر اُس کے کان میں رازداری سے پوچھا۔

''اوہ حیدر تم کو کیا ہو گیا ہے۔ ینگ لوگوں میں کیسی سلام دعا Darling۔'' نازیہ ایک ادا سے بولی۔

نازیہ اُس کی پھوپی زاد ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کی ماں اور بہن کی منظورِ نظر بھی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ وہ دل ہی دل میں حیدر کے لیے نازیہ کو منتخب کر چکی تھیں اور حیدر سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بنا رہتا تھا کہ اُس کا دل کبھی بھی نازیہ کی طرف اِس انداز سے مائل ہی نہیں ہوا تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کی ماں اور سب گھر والے اُس سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ گھر میں کھانا تک تو اُس کی پسند سے بنتا تھا، تو پھر شادی جیسے معاملے میں بھی اُس کی پسند کا یقیناً خیال رکھا جائے گا۔

''اُف خدا! تم تو اچھے خاصے مسخرے ہو چکے ہو۔'' نازیہ مسکراتے ہوئے بولی لیکن حیدر معصوم سی شکل بنائے اُس کو دیکھ رہا تھا۔ ''خدا کے واسطے اپنے Face ایکسپریشن نارمل کرو اور جلدی سے میرے ساتھ کلب چلو، آج وہاں بہت زبردست میوزیکل شو ہو رہا ہے۔ شرافت سے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اٹھ جاؤ۔'' نازیہ نے ایک ہاتھ میں ریموٹ لے کر ٹی وی بند کیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اُس کو زبردستی اپنی جگہ سے اُٹھا دیا اور وہ بادل نخواستہ کھڑا ہی ہو گیا کہ وہ جانتا تھا کہ نازیہ اُس کو لینے آئی ہے تو لے کر ہی جائے گی۔ وہ کوئی بات نہیں مانے گی اور جو وہ انکار کرے گا تو وہ ممی کو لے کر آجائے گی اور ممی..... ممی کو تو اِنکار سننے کی عادت ہی نہیں تھی اور وہ اپنی ماں کی اِس عادت سے واقف تھا اور یہی کوشش کرتا تھا کہ وہ اُن کی کسی بات سے انکار نہ کرے کیونکہ ممی بیمار بھی تو تھیں اور وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا اور یہ محبت ہی تھی جس نے کبھی ممی کے سامنے اُسے اِنکار نہیں کرنے دیا۔

☆.....☆

زینب نے کھڑکیوں پر پردے ڈال کر ذرا دور کھڑے ہو کر دیکھا کہ آیا پردے اچھے بھی لگ رہے ہیں یا نہیں۔ پھر اُن کی طرف سے مطمئن ہو کر اُس نے گاؤ تکیوں پر غلاف چڑھائے، کشنوں کو اُن کی جگہوں پر رکھا اور پھر کمرے میں چاندنی بچھا کر تنکے والی جھاڑوں سے خوب جما جما کر پورے گھر کی جھاڑو نکالی۔ صحن میں لگے گملوں کو پانی دیا اور سارے صحن کو خوب سارے پانی سے دھویا تو لگا ایک عجیب سی رونق اِس سادہ سے گھر میں اُتر آئی ہے۔

آج انتیسواں روزہ تھا اور قوی امکان تھا کہ آج ہی چاند رات ہو گی۔ اس لیے زینب روزے سے ہونے کے باوجود جلدی جلدی سارے کام نمٹا رہی تھی کہ عید پر ہر چیز چمکتی دمکتی ہی اچھی لگتی تھی اور زینب کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ عید کے استقبال میں ہر چیز ہی سنوار دے اور یہ اُس کا حق بھی تھا کہ وہ خالی خولی عید منانے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ سارے رمضان روزے بھی رکھتی اور تراویح بھی پڑھتی۔

طاق راتوں میں شب قدر بھی تلاش کرتی تھی تو چاند رات کو ہاتھوں میں مہندی سجا کر کلائیاں بھر کر خوب صورت شیشے کی چوڑیاں بھی پہنتی اور نہ جانے کیوں اُس کو ہمیشہ عید سے زیادہ چاند رات اچھی لگتی تھی۔ اُس کو لگتا اُس کی زندگی میں سال کا سب سے خوب صورت دن چاند رات ہے۔

☆.....☆

''ممی میں اور نازیہ ذرا پارلر تک جا رہے ہیں۔ میں نے لاروش کیٹرنگ کو فون کر دیا ہے، وہ لوگ آ کر ساری ارینجمنٹ کر لیں گے اور ہاں ٹمی ٹیلر میرا سوٹ بھیجے گا وہ خدیجہ سے کہیے گا کہ احتیاط سے الماری میں ہینگ کر دے۔'' شائلہ نے بالوں میں رولر سیٹ کیے بیٹھی، ٹی وی دیکھتی اپنی ماں سے کہا۔

''ویسے بائی دی وے یہ اس قدر تیاریاں کس سلسلے میں ہو رہی ہیں، کہیں نازیہ کی منگنی تو نہیں ہو رہی؟'' حیدر نہ جانے کب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''خیر نازیہ کی منگنی اتنے معمولی فنکشن میں تو ہو نہیں سکتی۔ آج چاند رات ہے اور ہم لوگ ہر سال کی طرح آج بھی چاند رات ڈنر دے رہے ہیں۔'' مسز احتشام نے مسکراتے ہوئے اپنے لاڈلے کو بتایا۔

''ویسے ممی ایک بات ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی روزہ کیوں نہیں رکھتا ہے؟''

''روزہ تو بوڑھے لوگ رکھتے ہیں۔ ہم رکھیں گے تو ساری اِسکن ہی خراب ہو جائے گی۔'' نازیہ نے اپنے خوب صورت گلابی ہاتھ دیکھتے ہوئے ایک ادا سے کہا۔

''خیر تم تو چپ ہی رہو، امپورٹڈ مسلمان۔'' حیدر ہنسا۔

''ہاں تو ممی میں کہہ رہا تھا کہ نہ تو ہمارے گھر میں کوئی روزہ رکھتا ہے اور نہ ہی نماز پڑھتا ہے۔ تراویح اور عبادات کا تو تصور ہی نہیں ہے، تو پھر یہ چاند رات ڈنر، یہ عید ملن پارٹی.....!'' حیدر واقعی جواب چاہتا تھا۔

''My darling اگر روزہ نہیں رکھا تو کیا عید بھی نہیں منائیں۔ after all ہم مسلمان تو ہیں نا اور یہ تم کن چکروں میں پڑ رہے ہو۔ تم اپنے دوستوں کو بلانا چاہو تو Invitation بھیج دو اور تم لوگوں کو یا تو اتنی جلدی ہو رہی تھی یا پھر یہیں بیٹھ گئی ہو۔'' مسز احتشام نے حیدر سے بات کرتے کرتے نازیہ سے کہا۔

''وہ آنٹی شائلہ کی فون کال آئی ہے۔ وہ بات کر رہی ہے نا، اس لیے میں اس کا ویٹ کر رہی ہوں۔'' نازیہ نے اندر کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کیا جہاں شائلہ Land line پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

''او کے ممی، میں چلتا ہوں۔'' حیدر نے کھڑے ہو کر سن گلاسز لگاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا لیکن افطار سے پہلے آنا۔''

''آئی ایم سوری میں نہیں آ سکتا، آج شام مجھ کو بہت ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔ تم لوگ انجوائے کرنا اور نازیہ خبردار تم نے کچھ زیادہ کھایا تو۔'' اُس نے ہنستے ہوئے ایک بار پھر نازیہ کو چھیڑا۔

''ایسی کیا ضروری میٹنگ ہے جو تم چاند رات کو مس کر رہے ہو۔ ساری فیملی ہو گی، بُری بات ہے، جو تم نہیں ہو گے۔'' مسز احتشام کے لہجے میں اِصرار تھا۔

''ٹھیک ہے ممی میں کوشش کروں گا لیکن فی الحال تو میں جا رہا ہوں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔'' حیدر کہتا ہوا جلدی سے باہر چلا گیا اور مسز احتشام خاموش الجھی بیٹھی رہ گئیں اور پھر اُن کی سوچ ایک نقطہ پر آ کر ٹھہر گئی اور وہ نقطہ حیدر کے موبائل پر جگمگاتی سانولی سلونی تصویر والی لڑکی تھی اور پھر جیسے وہ اندر تک دہل گئیں کہ وہ جانتی تھیں کہ

اگر جو وہ سوچ رہی ہیں وہ حقیقت نکلا تو کیا ہوگا اور کیا ہوگا کے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھیں۔

☆.....☆

''یا اللہ! یہاں روزے میں کام کرتے کرتے ہڈیاں ٹوٹ گئیں ہیں اور تم پڑی سو رہی ہو، حد ہوتی ہے ہڈحرامی کی بھی۔'' زینب دوپہر کو ذرا کی ذرا کمر سیدھی کرنے لیٹی تو اُس کی واحد دوست طیبہ چلی آئی۔

''میں تم کو سوتی نظر آرہی ہوں۔ یہ جو سارا گھر جگمگا رہا ہے یہ بھوتوں نے صاف کیا ہے کیا! یا ہمارے گھر میں نوکروں کی فوج ظفر موج کھڑی ہے۔ صبح سے گھر کا کام کر رہی تھی ابھی ذرا ستانے کے لیے لیٹی تو تم دنیا بھر کی فالتو لڑکی چلی آئیں مجھ کو طعنے دینے کے لیے۔'' زینب نے غصے سے کھولتے ہوئے طیبہ کو کھری کھری سُنا دیں۔

''ارے تم کو تو سچ مچ بُرا ہی لگ گیا۔'' طیبہ نے اُس کا غصہ انجوائے کیا۔ ''ویسے یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔'' طیبہ نے اُسے مزید چھیڑا۔

''اوہو یہ آپ سچ بول رہی ہیں۔ خدا کا خوف کرو طیبہ۔'' زینب واقعی سلگ اُٹھی تھی۔

''ارے میری پیاری سی زینب، میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ تم کس قدر سگھڑ بی بی ہو۔ میں تو تمہاری صفائی کی عادت سے اس قدر مرعوب ہوں کہ سوچ رہی ہوں تم کو K.M.C میں جاب دلوا دوں۔'' طیبہ نے اُسے مزید جلایا تو زینب ہنس دی اور طیبہ یہ سوچ کر رہ گئی کہ زینب کی ہنسی کس قدر خوب صورت اور معصوم ہے۔

''چلو دفع کرو سب باتوں کو، یہ بتاؤ خالہ کہاں ہیں۔ نظر نہیں آرہیں۔'' طیبہ نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''امی ذرا حیدر بھائی کے ساتھ چھوٹے ماموں کے گھر گئی ہیں۔'' زینب نے بستر سے اُٹھ کر دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹ کر کیچر لگایا اور آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے فیس کی سلوٹوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' طیبہ نے ٹانگیں سکیڑ کر بستر پر رکھیں۔

''اب کیا بات ہے، مس فسادن۔'' زینب نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ زینب کی وہ ایک ہی تو دوست تھی بلکہ طیبہ کے لیے دوست کہنا درست نہ ہو گا۔ وہ تو زینب کی بہن جیسی ہی تھی۔ دونوں ایک جان دو قالب تھیں۔ کبھی زینب طیبہ کے گھر اور اکثر طیبہ زینب کے گھر پائی جاتی تھی۔

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ حیدر بھائی کچھ زیادہ ہی تمہارے گھر نہیں آنے لگے ہیں۔'' طیبہ کا انداز پُرسوچ تھا۔

''ہائیں اب تمہیں یہ نئی فکر ستانے لگی ہے اور خیر ایسا بھی زیادہ نہیں آنے لگے ہیں۔ ہمیشہ ہی سے آتے ہیں۔ تم نے اب غور کیا ہوگا اور تم کیا رات دن ہمارے گھر جھانکتی رہتی ہو۔'' زینب نے مسکراتے ہوئے طیبہ کی بات کو ٹالا۔

''ارے میں تو بھول ہی گئی، ہم تو کل ہی کو تمہارے سامنے والے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں، اس لیے تم جو کہو گی ہم مان لیں گے، محترمہ زینب رفاقت علی۔'' طیبہ بات کرتے کرتے لمحہ بھر کو رکی تو زینب نے اپنے فرضی کالر جھاڑے۔ ''ہاں تو میں کہہ رہی تھی محترمہ زینب رفاقت علی کہ مجھے زیادہ چکر دکر دینے کی کوشش نہ کرو۔ تمہاری پیدائش سے پہلے میرا گھر اس محلے میں تمہارے گھر کے سامنے ہی ہے بلکہ جب تمہاری امی شادی ہو کر آئیں تو اُن کو میری امی ہی نے گاڑی سے اُتارا تھا۔ اس لیے برائے

مہربانی مجھے اُلٹی سیدھی کہانیاں سنانے سے پہلے دس دفعہ سوچ لینا۔'' طیبہ نے آرام سے تکیے سے ٹیک لگا کر اپنی ٹانگیں پھیلا لیں اور اپنی نظریں زینب کے چہرے پر جما دیں۔

''ویسے ایک بات تو بتاؤ، آج چاند رات ہے۔ تمہارے گھر میں کوئی کام نہیں ہے جو تم اُلٹی سیدھی ہانکنے یہاں چلی آئیں۔ خود تو پاگل ہو ہی مجھے بھی پاگل کر رہی ہو۔'' زینب نے نہ جانے کیوں اُس کی بات ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ اُسے وہیں چھوڑ کر وہ کچن میں آگئی کہ افطاری کا اہتمام بھی تو کرنا تھا۔

''یہ بھی بہت ضروری کام ہے جو میں کر رہی ہوں۔'' طیبہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

''اچھا۔'' زینب کو واقعی حیرت ہوئی۔

''دیکھو زینب باؤلی۔'' طیبہ نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے پکوڑوں کے لیے بیسن گھولتی زینب کو پکارا۔ ''میں بہت دنوں سے حیدر بھائی کے بدلے بدلے تیور دیکھ رہی ہوں۔ اُن کی آنکھیں محبتوں کا اشتہار بنی ہوئی ہیں۔ اُن کا لہجہ تمہارے لیے محبتوں اور شہد سے گُندھا ہوتا ہے اور لگتا ہے اُن کی گاڑی کراچی کے رستے ہی بھول گئی ہے۔ کہیں بھی جانے کے لیے اسٹارٹ کرتے ہیں، خود بخود تمہارے دروازے پر آکر رُک جاتی ہے اور تم نے نوٹ نہیں کیا کہ آج کل اکثر جب وہ آئے ہوئے ہوتے ہیں تو میں چلی آتی ہوں اور.....''

''ہاں..... ہاں میں نے نوٹ تو کیا تھا لیکن سوچا ہو سکتا ہے تم اُن کو لائن مار رہی ہو۔ کیونکہ کریکٹر تمہارا ابھی تو اچھا خاصا مشکوک ہے نا۔'' زینب نے مسکراتے ہوئے اُس کو چھیڑا اور کڑاہی میں تیل ڈال کر چولہا جلایا۔

''تم سے مجھے ایسی ہی گھٹیا بات کی اُمید تھی کیونکہ میں جانتی ہوں ہر آدمی اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق بات کرتا ہے اور معاف کرنا میرا منگیتر عباس، تمہارے حیدر سے سیکڑوں گنا زیادہ اچھا ہے، سمجھیں تم۔'' طیبہ جل ہی تو گئی تھی۔

''تمہارا حیدر۔'' زینب چونکی۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو تم، کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا۔'' زینب نے خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے دیواروں کے بھی کان نکل آئے ہوں۔

''ہاں، ہاں میں نے بہت سوچ سمجھ کر کہا ہے، تمہارا حیدر۔ آج صرف میں کہہ رہی ہوں اور اس سے پہلے کہ ساری دنیا کہے، ساری دنیا سمجھے، تم سمجھ لو زینب۔ حیدر بھائی تم سے محبت کرتے ہیں۔ ارے وہ تو چلتے پھرتے محبت کا اشتہار ہیں اگر تم واقعی انجان ہو تو حیرت ہے اور اگر تم انجان بن رہی ہو تو کم از کم میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ زینب حیدر بھائی تم کو پسند نہیں، پسند تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں حیدر بھائی تم سے محبت کرتے ہیں۔'' طیبہ کے لفظ بارودی گولوں کی طرح زینب پر برس رہے تھے۔ وہ حق دق بیٹھی طیبہ کی باتیں سُن رہی تھی۔ اُس کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ساتوں آسمان ایک پل میں اُس پر آگرے ہوں۔

'یا اللہ! جس بات کو میں اپنا وہم سمجھ کر ٹالتی رہی، نظر انداز کرتی رہی، وہ بات لوگ یقین سے کہہ رہے ہیں۔ کیا واقعی محبت چھپائے نہیں چھپتی۔ تو کیا واقعی حیدر بھائی مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں۔' زینب گم صم سی سوچے چلی جا رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں، تم اس مزاج کی لڑکی نہیں ہو لیکن زینب محبت گناہ تھوڑی ہوتی ہے اگر محبت میں اپنی حدود کا خیال رکھا جائے تو ایک نعمت ہے اور میری جان تقدیر بار بار دروازہ نہیں کھٹکھٹاتی۔

خوش نصیبی کی دستک سنو۔ حیدر بھائی کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتے ہیں اگر وہ تمہاری طرف ہاتھ بڑھائیں تو اُن کا ہاتھ تھام لینا اور.....''

طیبہ نہ جانے کیا کیا بولے جا رہی تھی لیکن وہ گوشت پوست کی لڑکی تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی کہ حیدر کی محبت اشتہار بن گئی اور اُس کو خبر تک نہ ہوئی۔

☆.....☆

آج حیدر نے اُن لوگوں کے ساتھ ہی افطار کیا تھا اور نہ جانے کیوں زینب کو حیدر سے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی اور زینب کہتی تھی کہ حیدر کی محبت کی اُس کو خبر تک نہیں ہوئی اور نہ خبر نہیں ہوئی تو جھجک کیسی۔

روزہ افطار کرتے ہی وہ چھت پر چلی آئی کہ لاکھ ٹی وی ریڈیو پر عید کا چاند ہونے کا اعلان ہو۔ زینب ہمیشہ خود چاند دیکھنے کی کوشش کرتی، چاہے اُس کو نظر آئے یا نہیں اور اِس وقت بھی وہ بڑے غور سے آسمانوں پر بادلوں کے پیچھے، درختوں کی آڑ میں، جہاں جہاں چاند چھپ سکتا تھا تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''چاند..... چاند کو ڈھونڈ رہا ہے۔'' حیدر جو چاند دیکھنے کے بہانے سے اُس کے پیچھے چھت پر چلا آیا تھا اس کے بہت قریب آ کر کہا تھا۔

''جی۔'' زینب گھبرا کر پیچھے مڑی تو سینے پر دونوں بازو لیے براؤن آنکھوں میں بہت سارا اشتیاق لیے وہ مسکراتے لبوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سفید وائل کا کُرتا شلوار پہنے، گریبان پر خوب صورت فیروزے کے بٹن لگائے، پیروں میں نفیس چپل پہنے، ماتھے پر لہراتی خوب صورت لٹ، مسکراتے لب اور شرارت سے مسکراتی آنکھیں۔ زینب نے سر سے پیر تک شاید آج پہلی بار حیدر کو دیکھا تھا اور پھر گھبرا کر رُخ موڑ لیا اور دو قدم آگے بڑھ کر چھت کی باؤنڈری کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

حیدر بھی اُس کے برابر میں آ کھڑا ہوا۔ گلی میں شور مچاتے، ہنستے کھلکھلاتے منچلے آسمان کے چاند کو کم اور چھتوں پر لٹکے چاندوں کو زیادہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حیدر نے ایک نظر گلی میں ڈالی اور پھر ترچھی نظروں سے اپنے سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی گھبرائی گھبرائی سی زینب کو دیکھا۔ پھر حیدر اُس کے ذرا اور قریب آ گیا اور زینب تھوڑی دور اور کھسک گئی۔ حیدر کے لبوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ آ گئی۔

''ایک بات تو بتاؤ زیب!'' حیدر کا لہجہ، آواز، اندازِ تخاطب سب ہی بدلا ہوا تھا۔ زینب خاموش رہی اور طیبہ کے الفاظ اُس کے چاروں طرف رقص کرنے لگے۔

''تم کسی کو پسند کرتی ہو کیا؟'' حیدر کا رواں رواں سوال تھا اور آنکھیں کہہ رہی تھیں 'نہیں' زینب کہہ دو نہیں'۔

زینب خاموش رہی کیونکہ بعض اوقات بولنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ اُس لمحے کوئی اُس سے پوچھتا۔

''جواب دو زیب..... اِس طرح خاموش تو نہ رہو۔'' زینب نے ذرا کی ذرا پلکیں اُٹھا کر سوال بنے۔ اُس شہزادے کو دیکھا اور پھر نظریں جُھکا لیں۔

''آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں۔'' زینب کے سرسراتے لہجے میں حد درجہ شکایت تھی۔

''نہیں میں تم کو کیا سمجھتا ہوں۔ کاش بتا سکتا لیکن محبت کرنا گناہ تو نہیں ہے۔''

''آپ تو اتنا ہمارے گھر آتے ہیں۔ آپ نے کبھی کوئی بات نوٹ کی ہے کیا۔'' زینب کو اپنا کردار بہت عزیز تھا۔

''نہیں بخدا نہیں۔ لیکن کوئی تو ہو سکتا ہے۔'' حیدر نہ جانے کیا سننا چاہتا تھا۔

''کوئی نہیں۔'' بس یہی نکلا تھا اُس کے لبوں سے۔

''کوئی سہیلی کا بھائی، کوئی کزن، کوئی کلاس فیلو کوئی محلے میں..... زینب تم اتنی اچھی ہو اتنی اچھی ہو کہ..... میں کیا کہوں؟'' لفظ حیدر کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

''آپ مجھے اتنا سمجھتے ہیں اور پھر بھی ایسی بات پوچھ رہے ہیں۔'' زینب کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی۔

''نہیں..... نہیں زینب، تم کو دیکھ کر تو زندگی سے پیار ہو جاتا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ اگر میرے بے وقوفانہ سوال سے تم ہرٹ ہوئی ہو تو پلیز.....'' حیدر ملتجی لہجے میں کہتا ہوا اُس کے اور قریب آیا اور پھر اُس کے کپڑوں سے اُٹھتی مہکتی پوائزن کی خوشبو زینب کے چاروں طرف پھیل گئی اور وہ جیسے خوشبوؤں کے حصار میں آ گئی۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔'' زینب نے حتمی انداز میں کہا۔

''تو تمہاری زندگی میں کوئی نہیں؟'' حیدر کا لہجہ مہکا۔

''نہیں۔''

''تم کسی کو پسند نہیں کرتیں؟''

''نہیں۔''

''تو پھر اچھی لڑکی میرے اندر کیا کمی ہے۔ میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے آگے سوالی بنا کھڑا ہوں۔ تم اپنی محبت میرے نام کر دو، زیب۔ مجھے اپنی محبت کے قابل سمجھ لو۔ تم مجھے اپنی محبت دے دو۔''

وہ شہنشاہوں جیسی آن بان رکھنے والا حیدر، جو چلے تو سیکڑوں لڑکیاں اپنے دل تھام لیں۔ وہ زینب رفاقت علی سے محبت کی بھیک مانگ رہا تھا۔

''دے دی۔'' وہ ماحول کا اثر تھا یا طیبہ کی باتوں کی گونج کہ اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

''کیا..... کیا واقعی.....!'' حیدر خوشی سے اُچھل پڑا اور اُسی لمحہ گلی میں چاند ہونے کا شور مچ گیا۔ مسجدوں میں اعلان ہونے لگے۔ گلیوں میں پٹاخے چلنے لگے اور زینب خوشی سے پاگل ہوتے حیدر کو چھت پر چھوڑ کر، دو دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے بھاگ گئی کہ محبت کبھی خیرات میں نہیں دی جاتی۔ محبت اعزاز کی طرح عطا کی جاتی ہے اور تمغے کی طرح سینے پر سجائی جاتی ہے۔ زینب نے بھی حیدر کی محبت اعزاز کی طرح وصول کی تھی اور اب اپنی زندگی کی سب سے حسین چاندرات کو وہ بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ سو جب تک حیدر رہا وہ اپنے کمرے میں لیٹی رہی اور حیدر..... حیدر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج اللہ کے اِس انعام کو وہ کس طرح سنبھالے۔

☆.....☆

میں کیسے بھول سکتی ہوں
تمہارا چہرہ! جو اَب میری آنکھوں میں رہتا ہے
تمہارے ہونٹوں پر کھیلتی وہ مسکراہٹ
محبت برساتی تمہاری وہ آنکھیں
وہ خوشی سے دمکتا تمہارا چہرہ
میں کیسے بھول سکتی ہوں!
وہ چاندرات.....
وہ حسین شام
جب تمہاری محبتوں کی شدتوں کے سامنے
میں نے ہتھیار ڈالے تھے
میں کیسے بھول سکتی ہوں!

عورت جب محبت کرتی ہے تو بس محبت کرتی ہے۔ اُس کا رواں رواں صرف محبت کرتا ہے۔ عورت سراپا محبت بن جاتی ہے۔ عورت محبت میں سب کچھ دان کر کے بھی فاخ ہوتی ہے۔ عورت کو اگر جیتا جا سکتا ہے تو صرف محبت سے اور یہی سب کچھ زینب کے ساتھ ہوا تھا۔

وہ جو یہ سمجھتی تھی کہ محبت اور وہ..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُس کو ایسا لگنے لگا کہ حیدر کے بغیر وہ نامکمل ہے۔ جیسے صدیوں سے وہ حیدر کی محبت میں گرفتار ہے، جیسے اُس نے صرف حیدر سے محبت کرنے کے لیے اِس دنیا میں جنم لیا ہے اور واقعی محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔

☆.....☆

''ارے محترمہ کہاں ہو، کن خیالوں میں گم ہو۔ خدا کے واسطے اَب دوسرا پاکستان نہیں بنانا، بس ایک سیدھے سادے سوال کا جواب چاہیے تھا آپ سے۔ غلطی ہوگئی معاف کردیں۔'' تو بیہ نے اُس کی خاموشی سے اُکتا کر اُس کا شانہ پکڑ کر ہلایا تو جیسے وہ حال میں واپس آگئی اور اُس نے ایک گہری سانس بھر کر پہلے اِن سب کو دیکھا اور کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ سب اُس کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اُس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر رُک گئی اور پلٹ کر حیران اور خاموش دوستوں کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور کہ ''محبت ہو جاتی ہے۔''

☆.....☆

''یہ کیا بکواس ہے۔'' میڈم علی کے دائیں ہاتھ میں خوشبوؤں سے مہکتا ایک گلابی کاغذ تھا۔ جس کو ہاتھ اونچا کر کے وہ لہرا رہی تھیں۔ غصہ کی شدت سے اُن کا چہرہ دہک رہا تھا اور اُن کی آواز ساری کلاس میں گونج رہی تھی اور فرسٹ ایئر پری میڈیکل کی ساری کلاس دم سادھے بیٹھی تھی۔

''Stand up ناظمہ؟ What is this'' انہوں نے گلابی چہرے اور براؤن آنکھوں والی اپنی ہر دلعزیز اسٹوڈنٹ سے گرجتے ہوئے پوچھا کہ اُس کا اسائنمنٹ چیک کرتے ہوئے یہ پرچہ اُن کے ہاتھ لگا تھا اور میڈم علی اور رومانس! یا اللہ کیا آج قیامت برپا ہوگی۔

''کچھ نہیں میڈم۔'' ناظمہ کی آواز لرزی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ What do you mean۔

یہ کچھ نہیں ہے، It`s nothing۔ ٹھیک ہے میں پوری کلاس سے پوچھتی ہوں۔''

''میڈم پلیز۔'' ناظمہ گڑگڑائی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اپنی عمریں دیکھیں اور اپنی حرکتیں دیکھیں۔'' میڈم علی نے ایک نظر پھر اُس گلابی کاغذ پر ڈالی اور پھر اُس کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے۔

ہلکی کاسنی ساڑھی اور ڈارک پرپل بلاؤز میں، بالوں کو خوب صورت سے جوڑے کے انداز میں لیے یہ اُس کی زدلوجی کی ٹیچر تھیں، جن کے نرم مزاجی اور خوب صورت اخلاق کی وجہ سے پوری کلاس ان کی گرویدہ تھی لیکن ناظمہ تو اُن کی عاشق تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا آپ لوگوں کو کیا ہو جاتا ہے۔ یہ محبت وغیرہ سب فضول باتیں ہیں۔ نرا وقت کی بربادی اور دِل آزاری۔ یہ مرد، یہ مرد بڑے بے وفا ہوتے ہیں یہ صرف وقت گزاری کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کی پڑھنے کی عمر ہے اور اِس عمر میں آپ گلابی کاغذوں پر بے ہودہ نظمیں اور غزلیں وصول کررہی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ کب سمجھیں گی۔ ضروری ہے کہ ہر لڑکی خود ہی ٹھوکر کھائے۔ آخر آپ لوگ دوسروں کو لگی ٹھوکر سے کیوں نہیں سنبھلتیں اور جوڑ کے خوب صورت اشعار کہتے ہیں، خوب صورت اشعار لکھتے ہیں، وعدے کرتے ہیں، قسمیں کھاتے ہیں، یہ سب کھیل کھیلتے ہیں۔ زندگی اور عزت صرف لڑکیوں کی ہی برباد ہوتی ہے۔ آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔'' میڈم علی گرج رہی تھیں۔ ناظمہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ساری

کلاس دم سادھے بیٹھی تھی۔

''میڈم کاشف میرے منگیتر ہیں۔'' ناظمہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔

''تو پھر کیا مطلب ہے آپ کا۔ منگنی ہوگئی تو آپ کو عشق چلانے کا لائسنس مل گیا ہے۔'' میڈم علی نے دونوں کہنیاں روسٹرم پر ٹکا کر آگے کی طرف جھک کر ناظمہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انتہائی سرد آواز میں پوچھا مگر ناظمہ خاموش رہی۔

''اور منگنی کی حیثیت کیا ہے؟ صرف ایک وعدہ اور بس..... اور یہاں کون وعدے پورے کرتا ہے۔''

''میں معافی چاہتی ہوں میڈم۔ پلیز مجھے معاف کردیں۔'' ناظمہ نے روتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں اب اِس سلسلے میں کوئی بھی بات کرنا نہیں چاہتی۔ میں پہلی اور آخری بار آپ لوگوں کو سمجھا رہی ہوں۔ مجھے لفظ محبت سے شدید نفرت ہے۔ آپ لوگوں کو خیال رکھنا چاہیے کہ آئندہ میری کلاس میں اِس قسم کی فضولیات کا ذکر بھی نہ ہو۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ محبت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ایک مرد اور عورت میں محبت کا تعلق صرف نکاح کے بندھن کے بعد ہی مناسب رہتا ہے۔ نکاح سے پہلے کی محبت صرف دُکھ دیتی ہے۔'' انہوں نے کہتے ہوئے روسٹرم پر سے اپنا پرس اُٹھایا اور کلاس ختم کیے بغیر کلاس سے چلی گئیں اور ساری کلاس جیسے حال میں واپس آگئی۔

ناظمہ اپنی ڈیسک پر بیٹھی زاروقطار رو رہی تھی اور ساری لڑکیاں اُس کے گرد جمگھٹا لگائے بھانت بھانت کی بولیاں بول رہی تھیں۔

''مت رو یار۔'' اسماء نے جو کہ ناظمہ کی دوست تھی، خط کے ٹکڑے سمیٹتے ہوئے روتی ہوئی ناظمہ سے کہا۔

''ویسے یار میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میڈم علی جو اتنی پولائٹڈ، اتنی پیاری ہیں، محبت کے بارے میں اُن کے نظریات اِس قدر سخت ہوں گے۔'' ایک لڑکی نے دوسری لڑکی سے کہا۔ اسماء نے ناظمہ کی طرف دیکھا جو نم آنکھیں لیے اُن لفظوں کے پتھر چُن رہی تھی جو میڈم علی اُس کو مار کر گئی تھیں۔

''ارے بھئی تم لوگ خوامخواہ ہی پریشان ہو رہی ہو۔ دراصل یہ بڑی عمر کی کنواریاں اِسی طرح اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتی ہیں۔ اب اُن کی خود تو شادی ہوئی نہیں ہے، کسی نے اِن کو اِس قابل ہی نہیں سمجھا، تو یہ لوگ اپنی محرومیوں کا بدلہ دوسروں سے لیتی ہیں، صرف حسد اور جلن۔'' شمسہ نے نخوت سے کہا جس کا ایک ہفتہ پہلے ہی امریکہ میں مقیم اپنے کزن کے ساتھ نکاح ہوا تھا۔

''اور شرافت..... اونہہ..... شرافت کا تو یہ لوگ ڈھونگ رچاتی ہیں۔ وہی بات ہے کہ انگور کھٹے ہیں۔ ان کو زندگی میں کوئی ملا نہیں، کس نے ان کو چاہا نہیں بلکہ لفٹ ہی نہیں کروائی۔ اَب اِن کو زندگی میں کوئی ملا نہیں تو اپنی محرومیوں کو شرافت کا نام دے دیا۔ ورنہ یقین کرو اگر اِن کو کوئی چاہتا، کوئی اِن کو گلابی کاغذ پر مہکتی ہوئی محبت بھری نظم لکھ کر دیتا، تو اِن کے سارے اُصول دھرے کے دھرے رہ جاتے بلکہ اُس زمانے میں تو لڑکیاں گھروں سے بھاگ جاتی تھیں یہ بھی بھاگ جاتیں۔''

ساری کلاس قہقہہ مار کر ہنس دی اور میڈم علی جو اپنا Attendance رجسٹر کلاس میں بھول جانے کی وجہ سے واپس آرہی تھیں۔ لڑکیوں کی باتیں سن کر دھک سے رہ گئیں۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہ تھا کہ بازی اِس طرح بھی پلٹ سکتی ہے۔ شرافت کے کشکول میں، حقارت کے ایسے سکے بھی ڈالے جائیں گے اور میڈم علی بوجھل قدموں کے ساتھ

واپس پلٹ گئیں اور واپس پلٹنا کتنا مشکل ہوتا ہے.....

☆.....☆

''زیب تم مجھ سے اس قدر چھپتی کیوں پھر رہی ہو۔'' زینب جو عصر کی نماز پڑھ کر جاء نماز تہہ کرنے کے لیے اُٹھا ہی رہی تھی کہ حیدر نے پیچھے سے آکر پوچھا۔

آج عید تھی اور حیدر جو دوپہر سے آیا ہوا تھا اُس کی نظریں بے قراری سے زینب کو ہی ڈھونڈ رہی تھیں اور زینب اِس چھوٹے سے گھر میں موجود ہونے کے باوجود اُس کو نظر ہی نہیں آرہی تھی اور حیدر کو عید، عید نہیں لگ رہی تھی اور بالآخر حیدر نے اُس کو دیکھ ہی لیا۔

زینب خاموشی سے جاء نماز تہہ کرنے لگی۔ جب جذبے بدل جائیں تو نظریں اُٹھانا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

سادہ سے نیلے قمیض شلوار اور نیلے کڑھائی والے دوپٹے کے ہالے میں چمکتا پُرنور چہرہ، دونوں ہاتھوں میں سجے خوب صورت مہندی کے نقش و نگار، ہاتھوں میں نیلی ریشمی چوڑیاں، نیلے رنگ کی دو پٹیوں کی چپل میں قید وہ صاف ستھرے خوب صورت پیر۔ اِس سادگی میں کتنا حسن تھا کوئی حیدر کے دل سے پوچھتا۔

''کیا ہو گیا ہے تم کو زیب۔'' حیدر سراپا سوال تھا۔

''پلیز میرے آگے سے ہٹیں، مجھے جانے دیں۔'' زینب نے آہستگی سے کہا۔

''اچھا میری طرف دیکھو۔'' زینب اُسی طرح کھڑی اپنی پیروں کو دیکھتی رہی۔

''مجھے جانے دیں نا!'' زینب کے لہجے میں اصرار تھا۔

''کیوں جانے دوں زیب..... کیا ہو گیا یار..... کیا ایک رات میں میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں یا میری شکل ڈریکولا جیسی ہو گئی ہے جو تم مجھ سے اس قدر گھبرا رہی ہو بلکہ کترا رہی ہو۔ میں پاگلوں کی طرح دوپہر سے بیٹھا ہوں۔ اماں ابا بھی سو گئے اور وقاص تھک ہار کر ٹی وی دیکھنے بیٹھ گیا لیکن تم..... تم نہ جانے کس کونے میں چھپی بیٹھی رہیں۔ یہ کیا طریقہ ہے زینب۔'' حیدر نے خاموش کھڑی زینب سے جھنجھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

'سینگ تو نہیں نکلے لیکن ہاں رشتہ بدل گیا۔ سوچ کا انداز بدل گیا اور جو سوچ بدلی تو لگتا ہے سب کچھ بدل گیا۔' زینب صرف سوچ کر رہ گئی۔

''ارے یار میں وہی حیدر ہوں، جس سے تم لڑتی جھگڑتی تھیں۔ ضد کرتی تھیں۔ زبردستی عیدی لیتی تھیں۔ اب کیا ہو گیا۔'' حیدر اُس کے راستے میں کھڑا تھا۔

''آپ کو نہیں پتا حیدر کہ کیا ہو گیا ہے۔'' زینب نے ذرا کی ذرا آنکھیں اُٹھا کر حیدر سے پوچھا۔

''کیا کہا حیدر..... تم نے مجھے حیدر کہا۔ یا خدا تم نے میرے نام کے ساتھ سے بھائی کا دُم چھلا ہٹا دیا۔ گویا تم اِس بات کو تسلیم کر چکی ہو کہ میں حیدر ہوں، تمہارا حیدر..... Oh thank`s God'' حیدر نے حسرت آمیز حیرت کے ساتھ سر جھکائے کھڑی زینب کو ذرا جھک کر دیکھتے ہوئے کہا اور زینب جو منہ سے بے دھیانی میں نکلے حیدر کے نام پر شرم سے گلابی ہو رہی تھی اور حیدر اُس کے چہرے کے رنگ دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

''تم جانتی ہو زیب یہ عید میرے لیے میری زندگی کی سب سے خوب صورت عید ہے اور تم میرے لیے اللہ میاں کی طرف سے اِس عید پر میرا انعام ہو اور تم نے جو میری محبت کو قبول کر کے میرے

اوپر احسان کیا ہے اُس احسان نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ کاش..... اے کاش میں تمہیں چھو سکتا۔'' حیدر کا لہجہ جذبات کی شدت سے بوجھل ہو رہا تھا اُدھر زینب حیدر کی دیوانگی سے گھبرا رہی تھی، ڈر رہی تھی۔

''پلیز مجھے رستہ دیں، مجھے جانے دیں۔ اماں ابا کو چائے دینی ہے۔ آج عید ہے۔ ایک آرہا ہے، ایک جا رہا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو..... پلیز ہٹیں۔'' زینب نے آگے قدم بڑھایا اور حیدر سحر زدہ سی کیفیت میں ہٹ گیا کہ اُس کے آگے تو وہ بے بس تھا۔ اُس عام سی لڑکی کو اپنی طاقت کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ حیدر..... حیدر تو اُس کے لیے تخت و تاج لٹا سکتا تھا۔ کاش وہ جان سکتی کہ اُس کی عام سی بھی بات حیدر کے لیے کیا درجہ رکھتی تھی۔

زینب چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر کی طرف چل دی اور حیدر مسکراتے چہرے کے ساتھ برآمدے میں رکھی کرسی پر بیٹھ کر بظاہر اخبار پڑھنے لگا مگر گھر کا یہ وہ حصہ تھا، جہاں وہ زینب کو دیکھتا رہتا اور زینب اُس سے لاکھ چھپنے کی کوشش بھی کرتی تو بے کار ہی رہتا۔

بعض دن زندگی کے خوب صورت دن بن جاتے ہیں اور بعض لمحے امر ہو جاتے ہیں اور زینب کی سادہ سی زندگی میں یہ عید..... واقعی عید تھی۔

☆.....☆

''یار کیا ضرورت ہے ملک سے باہر جانے کی۔ تم کو نوکری چاہیے تو میں تم کو جاب دے دیتا ہوں۔ ضروری ہے کہ تم سعودی عرب جاؤ۔'' وقاص نے جدہ کی ایک آئل کمپنی میں جاب کے لیے اپلائی کیا تھا اور وہاں سے اُس کے لیے کال آئی تھی اور حیدر جانتا تھا کہ اماں ابا کو اِس عمر میں جوان بیٹے کی شدید ضرورت ہے۔ حیدر، وقاص کو سعودی عرب جانے سے روک رہا تھا۔

''دیکھ یار، تُو تو ہے بڑا آدمی، میں ہوں غریب انسان۔ میں جانتا ہوں میرے لیے جاب، تیرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن دوست کو دوست رہنا چاہیے ''باس'' نہیں بننا چاہیے۔ میں جاب کرنا چاہتا ہوں، تم سے امداد نہیں لینا چاہتا۔ میں جانتا ہوں اگر تم مجھے اپنے پاس یا اپنے کسی جاننے والے کے پاس جاب دو گے یا دلواؤ گے تو میری قابلیت سے زیادہ مجھے تنخواہ ملے گی۔ میری غلطیوں کو نظر انداز کیا جائے گا کیونکہ تمہاری حتی الامکان کوشش ہو گی کہ ہمارے گھر میں خوش حالی آئے..... ہے نا۔'' وقاص نے حیدر سے تائید چاہی اور حیدر خاموش رہا کہ وقاص سچ ہی تو بول رہا تھا۔

''تو میرے یار میں نے بڑی مصیبت سے اماں اور ابا کو منایا ہے، اب تُو میری حوصلہ افزائی کر لیکن حیدر ایک وعدہ کر میرے بھائی۔'' وقاص کے لہجے میں مان تھا، اعتماد تھا۔ حیدر نے سر اُٹھا کر سوالیہ نظروں سے وقاص کی طرف دیکھا کہ بعض اوقات لفظوں کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

''میرے جانے کے بعد تم اماں ابا کا زینب کا بہت خیال رکھنا۔ یہاں آتے جاتے رہنا۔'' وقاص نے حیدر سے وعدہ چاہا۔

'یا اللہ! آپ کتنے مہربان ہیں۔ آپ کی رحمت کتنی وسیع ہے۔ میں جو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ وقاص کے جانے کے بعد میرا کیا جواز ہو گا کہ میں یہاں آؤں، اللہ میاں آپ نے کیسی خوب صورتی سے میرا مسئلہ حل کر دیا ہے کہ اَب تو ایک دن بھی اِس گھر میں نہ آؤں تو سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔' حیدر دل ہی دل میں اللہ سے مخاطب تھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا وقاص کہ میں اِس گھر سے اپنا تعلق ختم کر لوں گا یا کم کر لوں گا ابھی تو میں ہفتہ میں ایک دفعہ آتا ہوں لیکن

تمہارے جانے کے بعد کوشش کروں گا کہ ہفتہ کے بیچ میں بھی چکر لگاتا رہوں۔ یہاں سے تم بالکل بے فکر رہو۔'' حیدر نے وقاص کو اطمینان دلایا اور وقاص نے محبت بھرے انداز میں حیدر کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر دبایا اور پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

☆.....☆

وقاص کی فلائٹ جا چکی تھی اور زینب کھڑی مسلسل ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''بس کرو زیب کتنا روؤ گی۔ کچھ آنسو اپنی رخصتی کے لیے روک لو۔'' حیدر نے شرارتی انداز میں زینب کو بہلانا چاہا۔

''معاف کیجیے گا مسٹر رومیو۔ میں بھی یہاں موجود ہوں۔'' طیبہ نے پیچھے سے منہ نکال کر کہا اور زینب روتے روتے ہنس دی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا تم ہر خاص موقع پر نہ جانے کہاں سے نکل آتی ہو۔ طیبہ تم اپنے گھر میں کیوں نہیں رہتیں۔'' آج وقاص دو سال کے کنٹریکٹ پر جدہ گیا تھا اور زینب اور طیبہ حیدر کے ساتھ اُسے سی آف کرنے آئی تھیں اور اب وہ لوگ حیدر کی لینڈ کروزر میں واپس گھر کی طرف جا رہے تھے۔

''اچھا اگر جو میں اپنے گھر رہتی تو آپ کیا کرتے۔'' طیبہ نے جل کر کہا۔

''ہم..... ہم دونوں اچھی سی کافی پیتے، پھر بیٹھے پان کھاتے ہوئے، ہنستے مسکراتے گھر جاتے لیکن تمہاری وجہ سے ہم لوگ سیدھے گھر جا رہے ہیں۔'' حیدر نے منہ بنایا۔

''تو کیا ایک کپ کافی..... آپ مجھے نہیں پلا سکتے۔'' طیبہ نے دُکھ بھری آواز میں پوچھا۔

''کافی تو پلوا سکتا ہوں لیکن کافی پینے کے دوران جو باتیں کرنی ہیں وہ تمہارے سامنے نہیں کر سکتا۔'' حیدر ہنسا تو طیبہ بھی قہقہہ مار کر ہنس دی اور زینب دونوں کو گھورتی رہ گئی۔

☆.....☆

''تمہارے دوست وقاص کی جاب کیسی چل رہی ہے۔'' احتشام صاحب نے حیدر سے پوچھا۔

''جی ڈیڈی میری کل ہی بات ہوئی تھی۔ وہ کافی خوش ہے۔'' حیدر نے شامی کباب پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی مڈل کلاس لوگوں کے پاس بس یہی ایک چانس ہوتا ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی بدل سکیں اگر اُن کو فارن کنٹریز میں جاب مل جائے، اچھی بات ہے لیکن تم لوگ اپنی کسی مل میں جاب آفر کر سکتے تھے۔'' احتشام صاحب نے کانٹے میں مچھلی کا ٹکڑا پھنسا کر اپنی پلیٹ میں رکھا اور پھر حیدر سے پوچھا۔

''Yes Dad، میں نے آفر کی تھی لیکن وقاص نے منع کر دیا کہ وہ دوستی کو دوستی ہی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ میرے ساتھ باس اور ایمپلائی کی Relationship نہیں بنانا چاہتا۔ یُو نو ڈیڈ، اُس کو اپنی سیلف ریسپکٹ کا بہت خیال ہے۔'' حیدر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''Leave this topic آج کتنے دنوں بعد ہماری پوری فیملی ایک ساتھ ڈنر کر رہی ہے اور آپ لوگ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں لے بیٹھے ہیں۔ میں اِس وقت ایک خاص بات کرنا چاہتی ہوں کیونکہ اِس وقت آپ بھی ہیں اور آپ کا لاڈلا بھی۔'' مسز احتشام نے چہرے پر آتی ناگواری کو چھپاتے ہوئے احتشام صاحب نے کہا۔

''اوہ خیر..... بیٹا آج تمہاری ممی کو کوئی خاص بات کرنی ہے۔ کہیں جیولر کا فون تو نہیں آیا یا اٹلی میں

کوئی فیشن شو منایا جا رہا ہے یا تمہاری خالہ کی فیملی سوئٹزرلینڈ جا رہی ہے یا.....''

''یا نازیہ آئی تھی اور ممی سے میری شکایتیں کر کے گئی ہے۔'' حیدر نے باپ کی بات بیچ میں اُچکی۔

''ٹھیک ہے نہیں کرتی، بولتے رہیے آپ دونوں۔'' مسز احتشام نے غصے میں اِسپون پلیٹ پر پٹخا اور نیپکن سے منہ صاف کر کے کھڑی ہو گئیں۔

''ارے..... ارے ممی آپ تو ناراض ہو گئیں۔ میں اور ڈیڈ تو آپ سے مذاق کر رہے تھے۔ کہیے، ہم دونوں حاضر ہیں۔ کہیں تو کان پکڑ لیں۔'' حیدر نے شرارت سے کہتے ہوئے باپ کو آنکھ ماری اور وہ مسکرا دیے۔

''جی بیگم صاحبہ فرمائیے، کیا حکم ہے؟'' احتشام صاحب نے اپنی بیگم کو بہلایا۔

''میں کہہ رہی تھی کہ ماشاء اللہ ہماری دونوں بیٹیاں اپنے گھروں میں خوش ہیں۔''

''تو کیا ممی آپ کو اُن کے خوش رہنے پر اعتراض ہے۔'' حیدر نے حد درجہ معصومیت سے پوچھا۔

''حیدر۔'' احتشام صاحب نے حیدر کو گھورا۔ مسز احتشام نے ایک نظر احتشام صاحب کو اور پھر مسکراتے ہوئے حیدر کو دیکھا۔

''میں کہہ رہی تھی کہ گھر میں بہت سناٹا رہنے لگا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اب حیدر کی شادی ہو جانی چاہیے اور گھر میں ایک بہو آجانی چاہیے۔ کیوں حیدر؟'' انہوں نے ایک دم باتوں کا رُخ حیدر کی طرف موڑ دیا اور حیدر جو گلاس منہ سے لگائے پانی پی رہا تھا اُس کو زبردست اچھو لگ گیا کہ وہ لمحہ آہی گیا تھا جو ہر جملے، ہر وعدے کو پرکھے گا۔

☆.....☆

اب اِس دل میں

کوئی اور داخل نہیں ہو سکتا

کہ

تمہارے داخلے کے بعد میں نے تالا لگا کر

چابی!!

گہرے سمندروں میں پھینک دی ہے

''او ہو تو شاعری ہو رہی ہے۔'' حیدر نے پیچھے سے آکر زینب کے ہاتھ سے ڈائری اُچک لی۔

اماں اور ابا جو بڑی پھوپو کے گھر گئے ہوئے تھے اور زینب سکون سے صحن میں بچھی کرسی پر بیٹھی اپنی تازہ نظم ڈائری میں لکھ رہی تھی ایک دم چونک گئی۔

''آپ..... آپ کیسے آئے۔'' زینب نے حیرت سے حیدر سے کہا۔

''ظاہر ہے ٹانگوں سے آیا ہوں۔ میں بھوت تو ہوں نہیں کہ ہوا میں اُڑتا ہوا آگیا یا آسیب نہیں ہوں کہ دیوار پر چھپکلی بنا چپکا ہوا تھا اور ایک پیاری سی لڑکی کو بیٹھا دیکھ کر جلدی سے انسانی روپ میں آگیا۔ محترمہ آپ دروازہ بند کرنا بھول گئی تھیں شاید۔'' حیدر نے آرام سے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈائری کی ورق گردانی شروع کرتے ہوئے کہا۔

''پلیز میری ڈائری تو دے دیں۔'' زینب حیدر کے ہاتھ میں اپنی ڈائری دیکھ کر گھبرا کر بولی۔

''کیوں..... کیوں دوں! یہ شاعری تم میرے لیے ہی تو کرتی ہو۔ میں پڑھ تو لوں۔'' حیدر نے صفحہ پلٹا۔ ''ارے تم تو واقعی اچھی شاعرہ ہو۔ زینب محبت شاعری سکھا دیتی ہے۔ میری محبت نے بھی تمہیں شاعرہ بنا ہی دیا۔'' حیدر نے ایک نظم پڑھتے پڑھتے زینب کو دیکھ کر کہا۔

''خیر شاعری تو میں میٹرک سے کرتی ہوں۔'' زینب نے آہستگی سے کہا۔ ''لیکن پلیز میری ڈائری دے دیں۔'' زینب نے ہاتھ بڑھایا اور حیدر نے جلدی سے اپنا ہاتھ پرے کرتے ہوئے اونچا کر لیا۔

”پلیز......دے دیں۔“
”لے سکتی ہو تو لے لو۔“
”ہاں تو کیا لکھا ہوا ہے۔“ حیدر نے پڑھنا شروع کیا۔

میں روز تمہارا انتظار کرتی ہوں
لیکن تم
تم نہ جانے اِتنا کیوں تڑپاتے ہو......

”پلیز دیں نا۔“ زینب نے اُچک کر ڈائری چھیننے کی کوشش کی اور حیدر نے جلدی سے ڈائری دوسرے ہاتھ میں لے لی لیکن اُس کا نرم و نازک ہاتھ حیدر کی گرفت میں آگیا اور حیدر کو ایسا لگا کہ ایک گلاب جو شبنم کے قطروں سے بھیگ رہا تھا، اُس کے مضبوط مردانہ ہاتھوں میں آگیا۔

”پلیز......میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔“ زینب کا حلق خشک ہو گیا۔ اُس کو ایسا لگا جیسے وہ ابھی گر جائے گی۔ دل کے دھڑکنے کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ وہ دم بخود سی تھی اور حیدر جس نے اتفاقی طور پر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا، وہ اُس کے ہاتھ کی نرماہٹ کو محسوس کرتے ہوئے عشق کی نہ جانے کون کون سی منزلیں طے کر رہا تھا۔

”پلیز......میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔“ زینب بس اب روئی کہ تب روئی اور حیدر نے آہستگی سے اُس کا ہاتھ لبوں تک لے جا کر چھوڑ دیا اور زینب جس کا ہاتھ کسی مرد نے زندگی میں پہلی دفعہ پکڑا تھا وہ حیدر کی اِس جرأت پر حیران رہ گئی۔

اور پھر وہ خاموشی سے اندر کمرے میں چلی گئی اور حیدر خود جو اِس اتفاقی حادثے پر حیران تھا صحن میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا کہ اُس نے کیسے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ خود حیران تھا۔

وہ چپ چاپ باہر نکل گیا کہ اِس وقت نہ جانے کیوں وہ زینب کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا اور زینب جو اندر کمرے میں بیٹھی ایک ٹک اپنے ہاتھ کی پشت کو دیکھ رہی تھی اُس نے کھڑکی سے باہر جاتے حیدر کو دیکھا اور پھر جلتی ہوئی ہتھیلی کی پشت کو اور بے ساختہ اپنے لب اپنی ہتھیلی کی جلتی ہوئی پشت پر رکھ دیے اور اس کی آنکھ سے دو قطرے اِس دعا کے ساتھ نکلے، الٰہی اب یہ ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں نہ دینا۔

☆......☆

زینب جو ایک سادہ مزاج، سنجیدہ سی لڑکی تھی، وہ پور پور حیدر کی محبت میں ڈوبتی چلی گئی۔ حیدر کی محبت اُس کے چاروں طرف خوشبو کی طرح بکھر گئی۔ ایک ایسی خوشبو جس کو چھپاتے چھپاتے وہ تھکنے لگی کہ وہ جتنا چھپاتی وہ محبت اتنا ہی مہکتی۔ حیدر کی محبت نے اُس کے چاروں طرف ایک فصیل سی کھڑی کر دی تھی اور عورت جب محبت کرتی ہے تو اُس کے دل کے معاملے عجیب سے ہو جاتے ہیں۔ اُس کا دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ دل دسویں منزل سے کودنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ موت بھی زندگی لگنے لگتی ہے۔ زہر بھی امرت لگنے لگتا ہے، گرمیوں میں سردی اور سردیوں میں گرمی لگنے لگتی ہے۔ چلچلاتی دوپہروں میں بارش کی نرم پھوار محسوس ہوتی ہے۔ عورت محبت میں ہر لمحہ مرنے مٹنے کے لیے تیار رہتی ہے۔

محبت بھی کیا شے ہے۔ انسان اپنی سدھ بدھ ہی کھو دیتا ہے اور ہاں شاید ایک چیز ایسی تھی جس کو وہ ہر حال میں بہت عزیز رکھتی تھی وہ تھی اُس کی اَنا، اُس کا کردار اور اُس کی عزتِ نفس اور وہ جانتی تھی کہ ایک عورت کا کردار ہی دراصل اس کو دوسری عورت سے منفرد کرتا ہے اور اس کو اپنے ماں باپ کی تربیت اور اپنے کردار پر فخر تھا۔ محبت سب کچھ بدل دیتی ہے، زینب کی زندگی کا بھی فلسفہ بدل رہا تھا اور اُس نے ہر وہ کام کرنے کی ٹھان لی جو حیدر کو خوش کر سکے کہ عورت محبت میں بلی بن جاتی ہے اور پھر وہ اپنے

محبوب کے پیروں میں بیٹھی رہنا پسند کرتی ہے اور زینب بھی تو حیدر سے محبت کرتی تھی۔

حیدر......حیدر ٹیکسٹائل ملز اور کئی فائیو اسٹار ہوٹلز کا اکلوتا وارث، چھ فٹ سے نکلتا قد، شہابی رنگ اور اُس پر گہری براؤن آنکھیں، خوب صورت براؤن مونچھوں تلے مسکراتے گلابی تراشیدہ لب، گھنے بالوں سے ڈھکے ہاتھ اور دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں وہ روبی کی انگوٹھی۔ کوالیفائیڈ، بااخلاق، باادب سلجھا ہوا، منکسر المزاج، حیدر جو کسی بھی لڑکی کا خواب ہو سکتا تھا۔ وہ حیدر......زینب کا دیوانہ تھا۔

☆......☆

وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا۔ اُن دونوں کی محبت بہت خاموشی اور وقار کے ساتھ پنپ رہی تھی۔ زینب غیر محسوس طریقے سے حیدر کے مزاج میں ڈھلتی چلی جا رہی تھی اور حیدر......اُس کو تو ایسا لگتا تھا کہ سارے جہاں میں اُس سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں اور پھر وقاص جو جاب کے سلسلے میں جدہ میں مقیم تھا وہ چلا آیا اور پھر رفاقت علی کے خاموش گھر میں وقاص کی شادی کے خوشگوار ہنگامے کھڑے ہو گئے اور حیدر جس نے زینب کی امتحانی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے اپنا آنا جانا بہت مختصر کر دیا تھا کیونکہ یہ زینب کی خواہش تھی کہ حیدر کی موجودگی میں وہ یکسوئی کے ساتھ پڑھ نہیں پاتی اور زینب کو کوئی پریشانی ہو یا اُس کا تعلیمی ریکارڈ خراب ہو۔ حیدر برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن آج کل حیدر بھی روز ہی آ جاتا اور یہ دن زینب کی زندگی کے حسین دن تھے۔ کبھی کبھی زینب سوچتی کہ حیدر جیسے لڑکے کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی۔ آخر مجھ میں ایسا کیا ہے۔ وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سوال کرتی اور آئینہ خاموشی سے اُس کو تکتا رہتا لیکن ہاں کاتبِ تقدیر کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ بس ذرا وقت کا انتظار ہوتا ہے۔

زینب جو یونیورسٹی کی بیسٹ ڈیبیٹر تھی، شاعرہ تھی، اپنے ڈپارٹمنٹ کی صدر تھی، وہ حیدر کو دیکھتے ہی چھوئی موئی سی بن جاتی تھی اور مرد......مرد چاہے کتنا ہی ماڈرن کیوں نہ ہو، اُس کو ڈھکی چھپی، شرماتی ہوئی، باحیا، باکردار عورت بہت متاثر کرتی ہے اور حیدر جس کے چاروں طرف......ماڈرن بے باک، مالدار، لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا تھا اُس کو عام سے کپڑوں میں ایک سیدھی چوٹی باندھے گھر کے کاموں یا پڑھائی میں مصروف زینب بہت عزیز تھی۔

☆......☆

آج وقاص کی مایوں تھی۔ رفاقت علی کا چھوٹا سا گھر برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ حیدر اُن کے دائیں ہاتھ کی طرح اُن کے ساتھ ساتھ تھا اور وقاص کو اُس نے دولہا کی حیثیت دیتے ہوئے ایک طرف بٹھا دیا تھا۔

دلہن کے گھر مہندی لے کر جانا تھا۔ حیدر اندر چلا آیا تا کہ لڑکیوں کو باہر آنے کو کہے کہ گاڑیاں تیار کھڑی تھیں اور دیر ہو رہی تھی اور پھر اندر کمرے میں قدم رکھتے ہی جیسے حیدر سب کچھ بھول گیا اور اُس کی محبت چند لمحوں کے لیے اشتہار بن گئی۔ بہت ساری لڑکیوں کے جمگھٹے میں وہ بھی تھی۔

سیاہ نیٹ کے آٹھ کلیوں کے کُرتے اور کمخواب کے آڑے پاجامہ میں، لمبے سیاہ بالوں کو چوٹی کی شکل میں لپیٹے اور چوٹی کے گرد موتیا کی منہ بند کلیوں کے گجرے سجائے، کانوں میں بڑے بڑے کندن کے آویزے، ہاتھوں میں بھر بھر کے کالی مینے کی چوڑیاں، ماتھے پر خوب صورت بندیا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتی۔ یہ زینب تو نہیں تھی۔ یہ کون تھی؟ کوئی اپسرا، آسمان سے اُتری حُور......کوئی پری جو غلطی سے راستہ بھول کر زمین پر آ گئی تھی۔

وہ کیا لگ رہی تھی حیدر کو اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ لڑکیاں اُس کے دائیں بائیں سے تیزی سے نکل کر باہر کی طرف جا رہی تھیں اور زینب بڑی سی تھالی تھامے موم بتیاں جلانے کی کوشش کر رہی تھی اور چند جلی ہوئی موم بتیوں کی لرزتی ہوئی لو جب اُس کے چہرے پر اپنا عکس بکھیرتی تو زینب، حیدر کو پاگل کر دیتی۔ زینب جس کی نظریں تھالی میں جلتی بجھتی موم بتیوں پر تھی، کسی کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر پلٹی اور پھر جیسے دنیا تھم سی گئی۔ محبوب کی پُرشوق نظروں نے زینب کو گھبرا سا دیا۔ وہ دونوں ہی گم صم تھے۔ زینب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور حیدر کی نظریں پلٹنا ہی بھول گئی تھیں۔ لیکن اُس کے ساتھ ساتھ حیدر یہ بھی بھول گیا تھا کہ کسی نے بہت چونک کر اُس کی وارفتگی کو، اُس کی دیوانگی کو، اُس کی محویت کو نوٹ کیا تھا۔

کون جانتا تھا کہ اِس ایک لمحہ کی بے خودی کی قیمت کسی کو ساری زندگی ادا کرنی ہوگی۔

☆.....☆

وہ Saturday Night تھی۔ خوش باش، بے فکرے جوڑے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، لاس ویگاس کی مشہور زمانہ شاہراہ اسٹریپ پر گھوم رہے تھے۔ وہ بھی وہاں تھا۔ چند ایشیائی لوگوں میں سے ایک لیکن کیا وہ بھی خوش باش اور بے فکرا تھا؟

اُس نے اپنے اوورکوٹ کے کالر اونچے کیے اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا دنیا کے سب سے بڑے ہوٹل M.G.M کے سامنے جا کر کھڑا ہوا اور اُس کی انتہا کو دیکھنے لگا۔ اُس کو ایک عجیب سی جھرجھری آ گئی۔ نہ جانے کیوں اُس کو بلندیوں سے خوف آنے لگا تھا۔

پھر اُس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا اور اُس میں رکھا تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر پڑھنے لگا اور اُس تحریر کو پڑھ کر اُس کو اُسی طرح تکلیف ہوئی، جس طرح پہلے دن ہوئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر نم آنکھوں سے اُس تحریر کو بار بار پڑھتا رہا اور پھر اُس نے ہمیشہ کی طرح اُس کاغذ کو احتیاط سے لفافے میں رکھ کر دوبارہ جیب میں رکھ لیا اور پھر اُس نے ہمیشہ کی طرح اُس شعر کو زیرِ لب دہرایا جو وہ اِس خط کو پڑھنے کے بعد دہراتا تھا۔

کھوتے ہیں اگر جان تو کھو لینے دو
ایسے میں جو ہو جائے وہ ہو لینے دو
اک عمر پڑی ہے صبر بھی کر لیں گے
آج تو ہمیں جی بھر کے رو لینے دو

پھر ہمیشہ کی طرح اُس کے ہونٹوں پر ایک بہت دُکھی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑے لفافے میں سے چنے نکال کر آہستہ آہستہ چبانے شروع کر دیے۔

کبھی کبھی زندگی کتنی ساکت ہو جاتی ہے۔ کوئی رنگ، کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں بچتی۔ اُس نے ہاتھ پر بندھی گھڑی پر ٹائم دیکھا اور پھر فٹ پاتھ پر لگی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ آس پاس بے فکرے، ایک دوسرے میں گم تقریباً مدہوش تھے۔ وہ بلاجیو کیسینو کے سامنے بیٹھا تھا، جہاں 9:30 بجے Water Show شروع ہونے والا تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ فٹ پاتھ پر رش بڑھنے لگا تھا۔ وہ رش میں ایک نکتہ بننے جا رہا تھا کہ ایک کھلکھلاتی آواز پر چونک اُٹھا۔

"Hy, you are Pakistani?"

وہ چونکا۔ "Yes I am"

"May I Stood Here"۔ وہ

سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی نوجوان لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ وہاں کھڑے ہونے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ اُس نے رشک اور محبت سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اس جوڑے کو دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

"Oh yes why not" (ہاں کیوں نہیں)۔

اُس نے ہمیشہ کی طرح آرام سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور پھر جس Show کے لیے وہ 7:30 بجے سے انتظار کر رہا تھا، اُس کو بغیر دیکھے وہ Down town کی طرف مڑ گیا کہ زندگی میں اب کسی چیز اور کسی خواہش کی اہمیت ہی باقی نہیں رہی تھی۔

جیسے ہی وہ Down Town کے قریب پہنچا، اُس لمحے اُس کی جیب میں موبائل فون کی گھنٹی بجی، اُس نے نظر انداز کر دیا لیکن گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ اُس نے ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور پھر اپنے آپ سے کہا۔ اِس وقت..... اِس وقت کون ہو سکتا ہے؟ اور پھر جیسے نمبر دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ یہ نمبر برسوں بعد اُس کی اسکرین پر جگمگا رہا تھا اور وہ جس نے برسوں سے پاکستان سے آنے والی ہر کال کو اٹینڈ کرنا چھوڑ دیا تھا اُس نے حیرت زدہ ہو کر Answer کا بٹن پش کر دیا اور فون کان سے لگا کر "ہیلو" کہا۔

☆.....☆

پھر کیا مایوں، مہندی اور کیا بارات، ولیمہ۔ ہر فنکشن میں حیدر اُس کے ہر روپ کے آگے گھٹنے ٹیکتا چلا گیا۔ وہ حیدر کی نظروں کے حصار میں رہی اور حیدر..... ہاں حیدر بھی تو کسی کے نظرِ عتاب کے حصار میں تھا لیکن اُن دونوں کو تو خبر بھی نہ ہوئی کہ اُن کی محبت نے کسی کی راتوں کی نیند اُڑا دی ہے۔ جو فیصلہ بہت بعد میں ہونا تھا، وہ بہت جلد کر لیا گیا تھا۔

"ماشاء اللہ دونوں بچپن کے دوست ہیں۔ وقاص کا تو خیر سے گھر بس گیا ہے۔ اب آپ حیدر کی بھی شادی کر دیں۔" اماں نے سادگی سے حیدر کی ممی سے کہا، جو بلیک نیٹ کی ساڑھی پہنے گردن کو ہیرے کے نیکلس سے سجائے شانِ تفاخر سے کھڑی تھیں۔ وہ اِس محفل کی سب سے زیادہ امپریسو شخصیت تھیں۔ حیدر اور وقاص کی دیرینہ دوستی کی وجہ سے مسز احتشام لاکھ مصروفیات کے باوجود ہر تقریب میں شریک ہوئیں۔ شروع میں حیدر اُن کو بہت اصرار کر کے لایا تھا اور بعد میں انہوں نے یہ تقریبات خود ایک اہم کام کی طرح اٹینڈ کیں۔

"جی میں سمجھتی ہوں کہ اب حیدر کی شادی ہو جانی چاہیے بلکہ میرے خیال سے حیدر کی شادی ہونا بہت ضروری ہے۔" انہوں نے قریب سے گزرتی میرون شرارے سوٹ میں ملبوس زینب کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور حیدر ان کی نظروں کا زاویہ دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

'یا اللہ! یہ مائیں بھی کیسی عجیب ہوتی ہیں۔ اولاد کے دل کا حال بغیر کہے ہی جان جاتی ہیں۔ واقعی ماں اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے اور ماں چاہے زینب کی اماں جیسی سیدھی سادی گھریلو عورت ہو یا میری ممی کی طرح ایک سوشل ورکر، ماں تو بس ماں ہوتی ہے۔ آخر میری ممی تک بغیر کہے میرا یہ Msg پہنچ گیا کہ میں کیا چاہتا ہوں، حیدر نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچا کیونکہ وہ ممی کے ساتھ واپس گھر کی طرف جا رہا تھا۔

☆.....☆

"ویسے ایک بات ہے وقاص بھائی کی شادی میں بہت مزہ آیا، ہے نا۔" طیبہ نے تصویروں کا البم دیکھتے ہوئے زینب سے کہا۔

"ہاں واقعی۔" زینب نے ایک تصویر البم سے نکال کر اُس کی جگہ دوسری تصویر لگاتے ہوئے کہا۔

"حیدر بھائی پوری شادی میں بہت ہی زبردست بلکہ زبردست ترین لگ رہے تھے۔ یقین کرو زینب مجھے تو بہت ہی افسوس ہوا کہ کاش میری منگنی عباس سے نہ ہوئی ہوتی تو کم از کم میں ٹرائی ضرور کرتی۔" طیبہ نے ایک حسرت بھرے انداز میں کہتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اور وہ تو اُدھر تھے ہی تم لائن مارتیں اور وہ تمہارے پیچھے چلنا شروع کر دیتے۔" زینب نے ماتھے پر بل ڈال کر اُس کی بات کو انجوائے کیا۔

"اوہو......وہ...... پہلے وہ بھائی سے حیدر ہوئے اور اب "وہ" ہو چکے ہیں۔ زینب تمہاری رفتار کچھ زیادہ تیز نہیں ہے؟" طیبہ ہنسی تو زینب بھی ہنس دی۔

"ویسے یار ایک بات ہے۔ حیدر بھائی کی ممی بڑی برگر قسم کی عورت ہیں۔ وہ کوئی پنگا کھڑا نہ کردیں۔" طیبہ نے اپنے دل میں جڑ پکڑتے ایک وسوسے کا اظہار کیا۔

"نہیں نہیں وہ تو بہت اچھی ہیں۔ مجھ سے تو بہت پیار کرتی ہیں۔" زینب نے اُس کی بات کی نفی کی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" طیبہ نے صدقِ دل سے کہا اور زینب کے دل کے ساتھ روئیں، روئیں نے کہا "آمین ثمہ آمین۔"

☆......☆

"Hello! every body" آج وقاص کی شادی کی خوشی میں، حیدر کے گھر رفاقت علی کے گھر والے کھانے پر مدعو تھے اور اِس وقت وہ سب کھانا کھانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ہنستی مسکراتی نازیہ چلی آئی۔

"نازیہ تم پھر آگئیں۔" حیدر نے ہمیشہ کی طرح اُس کو چھیڑا۔

"نازیہ کو میں نے بلایا ہے حیدر۔" مسز ا... نے حیدر کو آنکھیں دکھائیں اور حیدر کے ساتھ نازیہ بھی مسکرا دی۔

"ارے آنٹی رہنے دیجیے۔ مجھے عادت... اِس کے ایسے جملوں کی اور جو کبھی اِس نے اِس... میرا استقبال نہ کیا تو میں پریشان ہو جاؤں..." نازیہ کہتے ہوئے زینب کی طرف بڑھی۔

"السلام علیکم۔" زینب نے کھڑے ہو کر... سے ہاتھ ملایا۔

"السلام علیکم۔" نازیہ نے سر سے پیر تک... کو دیکھا۔ "یا اللہ! آپ اِس زمانے میں بھی... کرتی ہیں۔" نازیہ واقعی حیران تھی۔

"میرے خیال سے زمانے کے ساتھ... تبدیل نہیں ہوتا۔ مس نازیہ احمد بیگ۔" حیدر ڈ... کی طرح زینب کے سامنے تھا اور زینب جو ناز... شخصیت سے کافی مرعوب ہو گئی تھی۔ حیدر کے ا... سہارے پر اُس کی آنکھیں تشکر سے جھک گ... کیونکہ وہ لاکھ بولڈ سہی، پُراعتماد اور ذہین سہی... فطرتاً وہ تیز طرار لڑکی نہیں تھی اور یہ بات حیدر... طرح جانتا تھا۔

"ماشاء اللہ بہت ہی پیاری بھانجی ہے آ... کی۔" اماں نے حیدر کی ممی سے نازیہ کے بار... میں کہا کہ جس کے آتے ہی لگتا تھا کہ محفل جوان ہو گئی ہے۔ قہقہے، چٹکلے، باتوں کا ایک ذخیرہ تھا اُ... کے پاس۔

"جی یہ بچپن ہی سے ایسی ہی شوخ و شریر ہے۔ میری اکلوتی نند کی اکلوتی بیٹی ہے۔ امریکہ سے M.B.A کر کے آئی ہے اور مجھے تو یہ بچپن ہی سے حیدر کے لیے پسند ہے۔ بس آپ جلد ہی حیدر... شادی میں شرکت کریں گی۔" مسز احتشام... ترچھی نظروں سے زینب کو دیکھتے ہوئے لفظوں...

...باری کی۔ مسز احتشام کے لفظ تھے یا پھر زینب تو ...ار ہو رہی تھی لیکن حیدر کو بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے ساتوں آسمان ایک ایک کر کے دھڑ دھڑ اُس کے سر پر آگرے ہوں۔

نازیہ نے تو سنا ہی نہیں کہ وہ تو وقاص کی نئی نویلی دلہن کے ساتھ باتوں میں مشغول تھی اور مسز احتشام آنکھوں میں فخر، بے حسی اور سفا کی لیے مسکرا رہی تھیں کہ وقاص کی شادی میں اُن کی شرکت اس لیے بھی لازمی ہو گئی تھی کہ اُن کی نظریں صرف حیدر پر تھیں اور حیدر جو زینب کا دیوانہ بنا پھر رہا تھا اور یوں انہوں نے سوچا کہ فیصلہ جلد ہی ہونا چاہیے اور آج انہوں نے فیصلہ سنا ہی دیا۔

☆......☆

"آپ لوگوں نے کب اور کیسے میری اور نازیہ کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔" مہمانوں کے جاتے ہی حیدر نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"حیدر تمیز سے بات کرو۔" احتشام صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔

"ڈیڈی میں بدتمیزی نہیں کر رہا لیکن پوچھنے کا حق تو رکھتا ہوں۔" حیدر نے اپنی آواز اور لہجے کو قابو میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کسی سے بھی شادی کرو۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ نازیہ سے تمہاری شادی کا فیصلہ تمہاری ماں اور بہن کا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اُن ہی سے پوچھو لیکن یاد رکھو کہ اپنی حدود کا خیال رکھنا۔" احتشام حسن نے سنجیدگی سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیے کہ گھر کے معاملات سے اُن کا اتنا ہی تعلق رہتا تھا۔ اُن کو اپنے بزنس کے معاملات سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ دوسری باتوں کے بارے میں سوچتے اور یہی وجہ تھی کہ اُن کی بیگم گھر کے ہر معاملے میں مطلق العنان حکمران تھیں۔

"ممی آپ کہاں چل دیں۔" اُس نے ماں کو پکارا جو احتشام صاحب کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی تھیں۔ "ممی میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔" اُسے نظر انداز کرتے ہوئے جاتی ہوئی ماں کو دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"جو بات میں کبھی نہیں سنوں گی نا مانوں گی اُسے کہہ کر اپنا اور میرا وقت ضائع مت کرو۔" اُن کے لہجے میں پتھروں جیسی سختی تھی۔

"کیوں ممی! کیوں۔ آپ کیوں میری بات نہیں سنیں گی۔ آپ کو سننا ہو گی اور یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں کہ میں نہیں مانوں گی۔ آپ کو کیا پتا میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور جو بات میں نے ابھی تک کہی نہیں اُس کو سننے اور ماننے سے آپ کیسے انکار کر سکتی ہیں۔" حیدر کی آواز اونچی تھی۔ وہ اپنی ماں کے آگے کھڑا ہو گیا۔

"جب بیٹے اِس طرح سینہ تان کر ماں سے اونچی آواز میں بات کرتے ہیں تو ماں جان جاتی ہے کہ اُن کے اور بیٹے کے درمیان ایک دوسری عورت آگئی ہے۔ بیٹوں کی زندگی میں دوسری عورت کا وجود ماں کو برداشت کرنا ہی ہوتا ہے اور وہ دوسری عورت کم از کم تمہارے دوست وقاص کی بہن کبھی بھی نہیں ہو سکتی، انڈر اسٹینڈ۔" مسز احتشام نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہارا بھاگ بھاگ کر وقاص کے گھر جانا مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔ غریبوں پر رحم کیا جاتا ہے، اُن سے ہمدردی کی جاتی ہے، اُن کا خیال رکھا جاتا ہے، اُن سے رشتہ داری تھوڑی کی جاتی ہے۔ تم تو اُن لوگوں کو میرا رشتہ دار بنانا چاہتے ہو۔ مجھے شک تو کبھی کبھی گزرتا تھا لیکن میں سوچتی تھی کہ میرا اتنا قابل بیٹا، میرا لاڈوں سے پالا بیٹا، جس نے کبھی معمولی جوتا

تک نہیں پہنا، جس کا Face wash ہانگ کانگ سے اور شیونگ کریم دبئی سے آتی ہے۔ جس کے باتھ روم میں صابن بھی Ruth کا رکھا جاتا ہے۔ جون گلاسز (رے بن) کے لگاتا ہے اور جوتے Pallys کے پہنتا ہے۔ جس کے سوٹ اٹلی میں سلتے ہیں اور جس نے پیدائش سے لے کر آج تک پانی بھی منرل پیا۔ میرا وہ بیٹا، تنگ محلوں میں رہنے والی عام سی لڑکی کو شادی کے لیے منتخب کرے گا۔ شٹ حیدر۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ تمہارا معیار اتنا گر جائے گا۔ میں یہ تو سنتی تھی کہ یہ مڈل کلاس شریف زادیاں، جادوگرنیاں ہوتی ہیں لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایک جادوگرنی میرے ہی بیٹے کو.....''

''پلیز ممی، ایک لفظ آگے مت کہیے گا۔'' حیدر نے تیزی سے مسز احتشام کو روکا کہ زینب کے لیے وہ ایک لفظ بھی غلط سننے کا روادار نہیں تھا۔

آپ نے صحیح کہا ممی میں 'رے بن' کے گلاسز اور Pallys کے شوز پسند کرتا ہوں لیکن آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ زینب کوئی چشمہ، جوتا یا سوٹ نہیں ہے۔ زینب ایک جیتی جاگتی باکردار، باحیا، تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جو کسی بھی مرد کا آئیڈیل ہو سکتی ہے۔ ایک مکان کو جو عورت گھر بنا سکتی ہے، وہ ایک ایسی ہی لڑکی ہے۔ ممی آپ اُس کے بارے میں بغیر جانے کیسے فیصلہ کر سکتی ہیں۔ آپ اُس کے بارے میں جانتی ہی کیا ہیں؟'' حیدر اُن کی اس قدر مخالفت دیکھ کر بہت حیران ہو رہا تھا۔

''ہاں ہاں تم نے صحیح کہا، یقیناً وہ کسی بھی مرد کا آئیڈیل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ مرد اُس کی کلاس کا ہو۔ وہ آئیڈیل ہو سکتی ہے۔ کسی دکاندار کا، کسی گریڈ سولہ کے آفیسر کا۔ وہ تمہارا آئیڈیل کیسے ہو سکتی ہے؟ مسٹر حیدر احتشام حسن تم شاید بھول گئے کہ تم حیدر

کلاس کی یونگ کیا ہوتی ہے اوہ مائی گاڈ مجھے یقین نہیں آرہا۔ میں تو اُس شادی میں تم کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ تم ویٹرز کی طرح لوگوں کو سرو کر رہے تھے اور اُس لڑکی کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔'' مسز احتشام کا تکبر آسمانوں کو لرزا رہا تھا۔ وہ بھول گئی تھیں کہ تکبر، اللہ کی چادر ہے اور جو اللہ کی چادر چھیننے کی کوشش کرتا ہے، وہ نامراد ہی رہتا ہے اور حیدر، وہ تو گم صم گرجتی برستی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ آہستہ آہستہ بات کرنے والی غریب اور ہاردار لڑکیوں کی فلاح کے لیے سرگرم این جی اوز کی صدر، اُس کی ماں کا یہ کون سا روپ تھا۔ حیدر نے اپنے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

☆.....☆

''Excuse me Madam۔'' وہ جو کالج کے پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کر کے لاک کر رہی تھی، آواز پر پلٹی۔

''اوہ آپ..... خیریت۔'' اُس نے اتنی ہی سنجیدگی سے پوچھا جو اُس کے مزاج کا خاصا تھی۔

''میڈم! آپ مجھ سے ناراض ہیں نا؟ میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔'' وہ خوب صورت سی پیاری سی ناظمہ آنکھوں میں آنسو لیے کھڑی تھی۔ اُس کی نم ہتھیلیاں، سینے سے لگی فائل کو بھی گیلا کر رہی تھیں۔

''معافی..... لیکن کس لیے؟'' میڈم علی نے سر سے پیر تک ناظمہ کو دیکھا اور آگے چلنا شروع ہو گئیں۔ ناظمہ اُن کے پیچھے پیچھے اُن کے آفس میں چلی آئی۔

''میڈم اُس دن میری فائل میں سے میرے منگیتر کے خط۔''

''اوہ۔'' میڈم علی کے ماتھے کے بل گہرے ہو گئے اور لب ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

''Sitdown'' میڈم علی نے سنجیدگی سے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اِس عمر کی جذباتی محبت سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ یہ محبتیں دکھ دینے کے علاوہ کچھ نہیں کرتیں۔ میں جانتی ہوں ہم محبتوں کے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن ہر دور میں محبتوں کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ ہم ماں کی گود سے گور تک محبتیں کرتے اور وصول کرتے ہیں لیکن بعض محبتیں ناسور بن جاتی ہیں۔ اُن کے زہر ہمارے جسم کو زخمی کر دیتے ہیں۔ ہم نہ مرتے ہیں اور نہ ہی جی پاتے ہیں اور شادی سے پہلے کی محبت بھی ایک ایسی ہی محبت ہوتی ہے۔ ہمیں اِن محبتوں کی قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ اپنی زندگی کی ہر ہر خوشی قربان کر کے اور بعض دفعہ یہ محبتیں تاوان میں ساری زندگی لے لیتی ہیں۔'' میڈم علی نے نوٹس کو فائل اپ کرتے ہوئے سنجیدگی سے اپنا نکتہ نظر واضح کیا تھا۔

''لیکن میڈم کاشف تو میرے منگیتر ہیں۔'' ناظمہ نے ایک ٹوٹی پھوٹی وضاحت کی۔

''منگیتر کیا ہوتا ہے؟'' میڈم علی نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو ناظمہ خاموش رہی۔ ''کہاں ہے تمہارا منگیتر؟''

''میڈم وہ اسٹڈی کے سلسلے میں امریکہ میں ہیں۔'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

''اور آپ کے ہاتھوں میں بہت سارے وعدے تھما کر چلے گئے ہوں گے وہ محترم۔ اُن کی قسمیں آپ کے پیروں سے لپٹی رہتی ہوں گی، ہے نا؟'' میڈم علی نے پوچھا۔ ناظمہ خاموشی سے نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

''دیکھیے منگنی، منگیتر یہ سب آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میرا اِس بات سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ میری ایک اچھی اسٹوڈنٹ ہیں، آپ کو بہت آگے جانا ہے۔ آپ کو دیکھ کر یہ بھی

انداز ہوتا ہے کہ آپ کا ایک ویل آف فیملی سے تعلق ہوگا۔ آپ بچی ہیں، آپ نہیں جانتیں یہ مرد لڑکیوں کے دامن میں امیدیں، آرزوئیں اور خواہشیں ڈال کر اِس دنیا کی رنگینی میں کہیں گم ہو جاتے ہیں اور لڑکیاں اُن آرزوؤں، قسموں اور وعدوں کی حفاظت کرتے کرتے اپنا آپ بھی بھول جاتی ہیں۔'' میں نہیں چاہتی یہ محبت زہر بن کر آپ کی رگوں میں دوڑنے لگے اور پھر اُس زہر کی کڑواہٹ ہر ذائقہ ختم کردے۔ میں چاہتی ہوں آپ اپنی زندگی جیئیں اِن فضول باتوں کے لیے آپ کا گھر کافی ہوگا۔ مجھے آپ سے کہنا ہے کہ اِس بات کا خیال رکھیے گا کہ آئندہ لفظ محبت میرے سامنے نہ آئے۔ And now you may go۔'' میڈم علی نے فائل کھول کر رُکھائی سے خاموش بیٹھی ناظمہ سے کہا۔

اور ناظمہ خاموشی سے اُن کے کمرے سے باہر آگئی۔ 'میری سمجھ میں نہیں آتا، اتنی پیاری، اتنی قابل، میڈم علی کو محبت سے نفرت کیوں ہے؟ کاش میں معلوم کرسکوں کاش۔' کاریڈور میں ستون سے ٹیک لگائے ناظمہ نے اپنے آپ سے کہا۔ کاش وہ جان سکتی کہ میڈم علی نے زندگی میں لفظ محبت کے نام پر کیا کیا کچھ سہا ہے۔

☆......☆

''نازیہ تو بچپن ہی سے حیدر کے لیے مجھے پسند ہے۔'' مسز احتشام کے لفظ زینب کو سونے نہیں دے رہے تھے، اُس کو ڈر لگ رہا تھا۔ دوسری طرف حیدر کی محبتیں، اُس کا دامن تھام کر کہہ رہی تھیں۔ 'میں تمہارا ہوا، زینب میں بس تمہارا ہوں۔'

''آپ کی فیملی کو میں پسند نہیں آئی نا۔'' زینب نے اُس دن گھر آئے ہوئے حیدر سے افسردگی سے پوچھا تھا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' حیدر نے اُس کو ٹالنا چاہا۔

''دیکھیے حیدر، مجھ سے غلط بات مت کریں میں جانتی ہوں آپ کی ممی کو میں بالکل پسند نہیں آئی اور میں نے پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ آپ کے اور ہمارے لیونگ اسٹیٹس میں بہت فرق ہے لیکن آپ نے اِس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔'' زینب کی آنکھیں نم تھیں کہ زندگی میں پہلا خواب ٹوٹ رہا تھا۔ حیدر کے دل کو کچھ ہوا، اُس کو زینب سے شدید محبت تھی۔ زینب کے آنسو اُس کا دل چاہا اپنے لبوں سے چُن لے اور اُس کو اپنے سینے میں چھپا کر کہیں دور لے جائے کہ بعض اوقات ہمارے رشتے، ہمارے راستے میں آ کھڑے ہوتے ہیں اور حیدر بھی بے بس تھا۔

''ارے یار تم تو معصوم سی چڑیا کی طرح گھبرا گئی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ زینب محبتوں میں مشکلات تو آتی ہی ہیں اور قیمتی چیزیں آسانی سے نہیں ملا کرتیں۔ کبھی ہیرے پتھروں کی طرح سڑکوں پر پڑے ملتے ہیں، نہیں نا؟ ہیروں کو ڈھونڈنے کے لیے ہمیں کس قدر محنت کرنی پڑتی ہے۔ سونا ہم تجوریوں میں رکھتے ہیں۔ پیتل کی طرح مٹکے بنا کر تھوڑا ہی سجاتے ہیں اور میری جان تم بھی بہت قیمتی ہو، نایاب ہو۔ تمہیں پانے کے لیے مجھے جدوجہد تو کرنی ہی پڑے گی۔ تم آسانی سے تھوڑی ملو گی، لہٰذا فکر مت کرو، بس چاندرات انجوائے کرو۔

آج چاندرات تھی اور چاندرات ہمیشہ سے زینب کو عید سے زیادہ اٹریکٹ کرتی تھی اور پھر چاند رات زینب کی زندگی میں ایک اہم حیثیت بھی تو رکھتی تھی کہ اقرارِ محبت چاندرات ہی کو تو ہوا تھا، زینب اور حیدر نے اُن لمحوں کو جب محبت کا اقرار ہوا تھا، یاد کیا تھا اور آج بھی چاندرات ہی تو تھی۔

حیدر حسبِ معمول اپنے گھر کا فنکشن چھوڑ کر

اُس چھوٹے سے گھر میں بیٹھا تھا۔ وقاص اپنی بیگم کو لے کر جدہ واپس جا چکا تھا اور اماں شیر خورمہ کا سامان خریدنے بازار گئی ہوئی تھیں اور زینب افسردہ سی بیٹھی ابا کے کرتے پر بٹن ٹانک رہی تھی۔ حیدر نے ایک نظر زینب پر ڈالی افسردہ...... خاموش...... اُداس زینب حیدر کے دل کو کچھ ہوا۔

کون اِس لڑکی کو معمولی کہتا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ دولت انسان کو خاص بناتی ہے اگر ایسا ہے تو فرعون ملعون کیوں ٹھہرا؟ کیا حُسن انسان کو خاص بناتا ہے اگر ایسا ہے تو قلوپطرہ نے زہر کیوں کھایا، لیکن ہاں کردار انسان کو خاص بناتا ہے اور زینب کا کردار بہت خاص تھا۔ زینب معمولی لڑکی نہیں تھی، وہ بہت خاص تھی۔ وہ حیدر کی جان تھی۔ جس طرح جن کی جان کہانیوں میں طوطے میں ہوتی تھی، بالکل اِس طرح حیدر کی جان زینب میں تھی۔ زینب کی ہنسی میں تھی۔

''تم نے مہندی نہیں لگوائی۔'' حیدر نے اُس کے سادے ہاتھوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ طیبہ لگاتی تھی، اُس کی شادی ہوگئی۔ اب کس سے لگواؤں۔'' زینب کے لہجے میں تنہائی بول رہی تھی۔

''اور چوڑیاں...... چوڑیاں کیوں نہیں پہنیں؟''

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' آخر زینب کو سچ کہنا ہی پڑا۔

''زینب میں بہت تھکا ہوا، اُلجھا ہوا اور پریشان ہوں۔ تمہارے لفظ، تمہارا افسردہ لہجہ مجھے مار دے گا۔ میں جانتا ہوں مخالفتوں کا ایک طوفان میرے سامنے ہے اور یہ کس نے کہہ دیا کہ تمہارے گھر والے بھی مان ہی جائیں گے، لیکن تمہاری افسردگی مجھے مار دے گی۔'' حیدر صرف سوچ کر رہ گیا۔

''ارے یار چلو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اماں آگئی ہیں۔ چلو میں تم کو مینا بازار لے کر چلوں۔ وہاں سے مہندی بھی لگوانا اور چوڑیاں بھی پہننا۔'' حیدر نے لہجہ کو خوشگوار کرتے ہوئے کہا۔

''اماں آپ کے ساتھ اکیلا تھوڑا ہی بھیجیں گی۔'' زینب نے ابا کا کرتا استری کر کے ہینگر کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ افسردہ سی شہزادی، اماں کو منانا بنانا، بہلانا میرا کام ہے۔ میں چلا کچن کی طرف جہاں ابھی ابھی اماں کی انٹری ہوئی ہے اور تم جلدی سے چادر اُوڑھو۔'' حیدر کہتا ہوا باہر صحن کی طرف چلا اور لفظ انٹری پر زینب بے ساختہ ہنس دی۔

☆......☆

''اِس سال زینب سولہ جماعتیں پڑھ لے گی۔ میں چاہتی ہوں اب اِس کو بھی اِس کے گھر کا کردوں۔ کوئی اچھا سا رشتہ ہو تو بتانا۔'' اماں نے آج خاص طور پر رشتہ کروانے والی کو بلا کر بات کی۔

''تو خالہ ماشاءاللہ آپ کا اتنا بڑا خاندان ہے۔ آپ کے خاندان میں کوئی جوڑ کا نہیں ہے۔'' رشتے والی خالہ بتول نے اماں کو کریدا۔

''ارے بہن اگر کوئی خاندان میں ہوتا تو تم کو تھوڑا ہی بلواتی۔ اَب میری بچی اتنی پڑھی لکھی ہے۔ ہمارے خاندان میں لڑکے زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ دس بارہ جماعتیں پڑھیں اور کام پر لگ گئے یا اپنی دکانوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں چاہتی ہوں ذرا پڑھا لکھا داماد ہو۔'' اماں نے تفصیلاً کہا۔

''ویسے ایک بات ہے خالہ، بُرا مت ماننا۔ تمہارے گھر وہ جو ایک لڑکا آتا ہے، شکل ہی سے پڑھا لکھا اور پیسے والا لگتا ہے۔ تم اُس کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں۔'' خالہ بتول نے اماں کی سوچ کا رُخ بدلا۔

''کون...... حیدر؟'' اماں کا انداز ہ سوالیہ تھا۔

''اب نام وام تو میں نہیں جانتی لیکن ہاں دیکھا ضرور ہے۔'' خالہ بتول نے کہا۔

''توبہ کرو، وہ تو میرے بیٹوں کی طرح ہے۔ اِس نظر سے تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔'' اماں نے اُن کو بری طرح جھڑک دیا۔

''خیر خالہ تمہاری مرضی۔ میرے تو دِل میں ایک بات آئی تھی، میں نے کہہ دی، چلتی ہوں۔'' خالہ بتول نے کھڑی ہو کر چپل پہنتے ہوئے کہا۔ ''ویسے میں دیکھتی ہوں۔ ہیں ایک دو گھر میری نظر میں، دعا کرو خالہ۔ میں بات کرتی ہوں۔'' خالہ بتول نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''اللہ میری بچی کا نیک نصیب کھولے۔'' اماں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'ویسے حیدر ہے بہت اچھا لڑکا'۔ اماں کے اندر سے کوئی بولا لیکن اماں نے سُنی اَن سُنی کردی۔

☆......☆

ایک جنگ تھی جس کو حیدر لڑ رہا تھا۔ اُس کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اُس کی فیملی اُس کی محبت کی اِس قدر مخالفت کرے گی۔ حیدر سمجھتا تھا کہ وہ اکلوتا ہے اور آج تک اُس کی کسی خواہش کو رد نہیں کیا گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا بات خواہش کی نہیں بات اُس کی پاکیزہ محبت کی نہیں، بات اَنا کی تھی۔ اُس کی ماں اور بہنوں کی اَنا کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ جب انہوں نے اپنے شہزادے جیسے بھائی کو زینب کی مہندی کی تھالی تھامے کھڑا دیکھا تھا اور اُس لمحے زینب فون پر بات کر رہی تھی اور حیدر جیسے اُس کے آگے ایک غلام کی طرح کھڑا تھا اور وہ لمحہ جس نے اُن دونوں کی محبت کو اَمر کیا تھا، جس لمحہ میں حیدر اپنا سب کچھ زینب پر وارنے کے لیے تیار تھا، جس لمحہ میں زینب کو اپنی زندگی پر فخر محسوس ہوا تھا وہ لمحہ اُس کی ماں کی نظر عتاب میں آ گیا تھا۔

''ممی آپ نے بالکل ٹھیک کیا، حیدر تو پاگل ہو گیا ہے۔ کہاں حیدر اور کہاں وہ لڑکی۔ کس قدر معمولی صورت کی لڑکی ہے۔ ممی ماشاء اللہ ہمارا بھائی تو اس قدر خوب صورت ہے کہ اُس کے ساتھ باربی ڈول جیسی نازیہ ہی اچھی لگے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہماری پھوپی کی اکلوتی بیٹی ہے۔ جو امریکن سٹیزن ہونے کے ساتھ ساتھ جہیز میں دو فائیو اسٹار ہوٹل بھی لے کر آئے گی۔'' شمائلہ نے ماں کی بات سُن کر کہ انہوں نے کس طرح حیدر کو کھری کھری سنائی تھیں۔ اُن کی حوصلہ افزائی کی۔

''تم تو اپنے ڈیڈی کو جانتی ہی ہو۔ میری بات سُن کر کہنے لگے کہ بھئی اِس قدر مخالفت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر حیدر اُس لڑکی کو پسند کرتا ہے تو لے آئیے۔ وہ ہمارے گھر آئے گی تو ہمارے ماحول میں ڈھل ہی جائے گی۔'' مسز احتشام نے بیٹی کو بتایا۔

''واقعی ممی...... ڈیڈی نے اِس طرح کہا۔'' شمائلہ حیران تھی۔

''اور کیا، کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ میں نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ آپ اِس معاملے میں نہیں بولیں، میں خود ہینڈل کرلوں گی۔ مجھے اِن جیسے لوگوں کو ہینڈل کرنا آتا ہے۔ بہت ہی بُرے لوگ ہیں۔ تو رات دن نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں اور بیٹیوں کو مالدار لڑکوں کی دولت ہتھیانے کے لیے چارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔'' مسز احتشام بہتان تراشی میں حد سے تجاوز کر رہی تھیں۔ ''حیدر مر بھی جائے تو بھی میں نہ تو اُس دہلیز پر جاؤں گی اور نہ ہی حیدر کی شادی اُس لڑکی سے کروں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' مسز احتشام تکبر کی حدود کو کراس کر گئیں۔ یہ

سوچے سمجھے بغیر انسان کتنا بھی طاقتور ہو، اُس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہم سب تو کٹھ پتلیاں ہیں، جن کی ڈوریاں آسمانوں پر سے ہلائی جاتی ہیں۔ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

☆......☆

زینب نے نظر اُٹھا کر دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھا۔ آج پھر حیدر کے آنے کا مخصوص وقت گزر گیا۔ کتنے ہی دن ہوئے حیدر نہیں آیا تھا۔ زینب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور روٹی پکانے کے لیے آٹا گوندھنے بیٹھ گئی اور نہ جانے کیوں آج اماں نے اُس کی بدلتی کیفیت کو محسوس کیا۔

ماؤں کے اندر الارم لگے ہوتے ہیں۔ جو اولاد کی ذرا سی تکلیف پر بج اُٹھتے ہیں اور آج اماں کے اندر لگا ہوا، الارم ایک عجیب سے انداز میں بجا اور وہ چونک اُٹھیں۔

☆......☆

''آپ کچھ تو کہتے، اُن کو سمجھاتے۔'' زینب نے خاموشی کھڑے حیدر سے آس اور امید سے کہا۔

''کیا کچھ نہ کہا۔ آج کل میں جتنا بول رہا ہوں شاید زندگی میں کبھی نہیں بولا ہوں۔ سب کے سامنے، اپنا ایک ایک جذبہ بیان کیا۔ اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ تم میرا خواب ہو۔ میری زندگی، میری خواہش ہو، میری زندگی کی اولین تمنا اور آخری آرزو ہو۔ تمہارے بغیر میں کچھ نہیں ہوں۔ تمہارا وجود ہی میرے لیے خوشی ہے۔ تم میری زندگی کی واحد خوشی ہو۔ میں نے ہاتھ تک جوڑے، خوشامدیں کیں، منتیں کیں۔ پھر...... پھر بھی نہیں مانے وہ لوگ۔''

زینب حیران تھی اور حیدر شکست خوردہ۔

☆......☆

''یااللہ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے اِس قدر شدید طریقے سے ریجیکٹ کیوں کیا گیا ہے۔ تم خود ہی بتاؤ طیبہ کیا میں خوب صورت نہیں، تعلیم یافتہ نہیں۔ شریف بااخلاق اور باشعور نہیں! کیا میرے حسب نسب میں کوئی کھوٹ ہے؟ تم ہی بتاؤ طیبہ مجھے اِس قدر ذلیل کیوں کیا جا رہا ہے۔ میری یہی خطا ہے نا کہ میں نے حیدر سے محبت کی، بے انتہا، بے پناہ، بے تحاشا محبت۔ میں نے حیدر کی محبت میں اپنے اندر ہر وہ بات پیدا کرنے کی کوشش کی جو حیدر کو پسند ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو اور تم ہی کیا یہ بات تو حیدر بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے خاندان میں لڑکیاں میٹرک انٹر سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کرتیں لیکن میں یونیورسٹی تک جا پہنچی۔'' زینب رو رہی تھی، سوال کر رہی تھی، گلہ کر رہی تھی اور طیبہ خاموش بیٹھی سُن رہی تھی کہ اُس کو زینب سے بہت محبت تھی اور زینب کی تکلیف اُس کو بے حد تکلیف دے رہی تھی اور وقاص کی شادی میں ہی اُس کو آنے والے اِن لمحات کا ادراک ہو گیا تھا اور طیبہ اُس دن سے ہی اِس دن کے نہ آنے کی دُعا کر رہی تھی لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر دعا قبول ہو۔

زینب تو ایک حقیقت پسند لڑکی تھی لیکن وہ بھی محبت کے ریشمی دھاگوں میں اُلجھ گئی اور اُس نے بھی خواب دیکھنے شروع کر دیے اور جب لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں تو پھر تعبیر...... تعبیر بعض اوقات اُن کے دائرہ سوچ سے باہر نکل جاتی ہے۔

☆......☆

آج کل شمائلہ اور مسز احتشام کا نازیہ کے گھر آنا جانا بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ دونوں طرف تیاریاں عروج پر تھیں۔ نازیہ کے بہت لاڈ اُٹھائے جا رہے تھے اور ابھی ابھی ایک معروف ڈیزائنر انیلا انجمی کے ہاں سے اُن کا تیار کیا ہوا انگیجمنٹ ڈریس آیا تھا کہ حیدر چلا آیا۔

''ممی یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' حیدر نے چاروں

طرف بکھرے کپڑوں اور کمرے میں ایک عجیب سی چہل پہل محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''آؤ..... آؤ حیدر دیکھو، نازیہ کا انگیجمنٹ ڈریس۔ کتنا خوب صورت ہے۔'' مسز احتشام نے شاکنگ پنک اور گرے کنٹراس کا لہنگا اُٹھا کر حیدر کو دکھاتے ہوئے کہا۔

''انگیجمنٹ ڈریس!'' حیدر نے زیرلب بڑبڑایا۔ ''کیا کہہ رہی ہیں ممی آپ۔'' جب لفظ اُس کی سمجھ میں آئے تو وہ چیخ پڑا۔

''چیخ کیوں رہے ہو۔ یہ نازیہ کا سوٹ ہے اور تمہارا آنے والا ہے۔ کمنگ فرائیڈے تم دونوں کی منگنی کا فنکشن ہے۔'' مسز احتشام کے لفظ تھے یا پتھر وہ تمیز نہیں کر سکا۔

''ممی آپ نے معاملہ اتنا آگے تک کیسے پہنچا دیا۔ میں نے آپ کو منع کیا تھا نا مگر آپ نے بات آگے کیسے بڑھائی اور کیوں؟'' حیدر چیخ رہا تھا سوال کر رہا تھا۔

''مجھے تم سے پوچھنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اور احتشام نے برسوں پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا لیکن تمہارے تھرڈ کلاس عشق نے جلدی اعلان کرنے پر مجبور کر دیا۔ آئی سمجھ میں۔'' مسز احتشام کے لہجے میں سفاکی تھی۔

''ممی، آپ، ڈیڈی اور سب کان کھول کر سُن لیں۔ میں زینب کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر آپ لوگوں نے میرے ساتھ زبردستی کی، تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' حیدر کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''اچھا تو نوبت یہاں تک آ چکی ہے کہ تم اُس لڑکی کے لیے، اُس دو ٹکے کی لڑکی کے لیے ہمیں چھوڑ دو گے۔'' مسز احتشام نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بالکل، بہتر ہوگا آپ اِس فنکشن کو کینسل کر دیں۔'' حیدر نے مفاہمت والے انداز میں کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ فنکشن کینسل ہو۔ انوی ٹیشن کارڈز تقسیم ہو چکے ہیں۔ ہوٹل کی بکنگ ہوگئی ہے اور یاد رکھو تم نے کسی قسم کی کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں.....'' مسز احتشام ایک لمحے کو رُکیں، پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر وہ حیدر کے مقابل جا کر کھڑی ہوئیں۔ اُن کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ آئی اور پھر انہوں نے کہا.....

اُن کے لفظ تھے یا آرے۔ حیدر دم بخود دیکھتا رہ گیا اور پھر وہ ڈھ جانے والے انداز میں صوفے پر گرتا چلا گیا۔

☆.....☆

سیڑھیوں پر سر جھکائے زینب بیٹھی تھی اور اُس کے قریب ہی حیدر۔

''روؤ نہیں زیب۔ تمہارے آنسو مجھے کمزور کر رہے ہیں۔''

''میں آپ سے ایک بات کہوں؟'' زینب نے ذرا کی ذرا پلکیں اُٹھا کر اُس شہزادے جیسے شخص کو دیکھا جو اُس کا تھا لیکن اُس کی دسترس میں نہیں تھا۔ حیدر نے سوالیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

''میں آپ کا انتظار ساری زندگی کر سکتی ہوں کیونکہ میں منافق نہیں ہوں، ایسا نہیں ہو سکتا میں شادی کسی اور سے کرلوں اور محبت آپ سے کرتی رہوں کیونکہ میں محبت صرف آپ سے کرتی ہوں اور یہ بھی میرا مزاج ہے کہ میں محبت میں بٹوارہ برداشت نہیں کر سکتی، تو میں آپ کو کسی اور لڑکی کے ساتھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ دیکھیے آپ پلیز اگر مجھ سے شادی نہیں کر سکتے تو کسی اور سے بھی نہیں کیجیے گا کہ جس دن میں نے آپ کو کسی اور کے ساتھ دیکھا تو میں مر جاؤں گی..... اور.....'' پھر کہتے کہتے زینب نے

ٹھنوں میں سر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور حیدر اُس کے لرزتے وجود کو کرب سے دیکھتا رہا۔

☆.....☆

''اماں آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' زینب نے حیدر کے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا۔

''خیریت کیا بات!'' حیدر چونکا کہ آج کل ہر لمحہ اُس پر آگہی کا نیا در کھول رہا تھا۔

''پتا نہیں، رات سے کئی دفعہ کہہ چکی ہیں اور آپ تو جانتے ہیں جب سے ابا کا انتقال ہوا ہے اماں تو جیسے دنیا سے لاتعلق سی ہو چکی ہیں لیکن آج صبح سے بہت خاموش سی ہیں۔'' زینب نے اُس کے متفکر چہرے کو دیکھ کر کہا۔

''اچھا۔'' حیدر نے پُرسوچ انداز میں کہا اور ان کے کمرے میں چلا گیا۔

''السلام علیکم! کیسی طبیعت ہے آپ کی۔'' حیدر نے بہت خلوص سے اُن کا ہاتھ تھام کر پوچھا جو غیر معمولی حد تک سرد ہو رہا تھا۔

''بس بیٹا اللہ کا شکر ہے، احسان ہے۔'' اُن لہجہ بہت بجھا ہوا تھا جو حیدر کو چونکا گیا۔ ''جاؤ زینب تم جا کر پڑھو۔'' انہوں نے زینب کو ٹالا جو سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر زینب چلی گئی کہ وہ اپنی ماں کو جانتی تھی۔ وہ جانتی تھی اُن کو جو بھی بات کرنی ہے اگر انہوں نے سوچ لیا ہے کہ اُس کے سامنے نہیں کرنی تو وہ نہیں کریں گی۔

''حیدر میرے بچے تم میرے لیے وقاص ہی کی طرح ہو۔ ہماری زندگی کے تجربات و مشاہدات تم سے زیادہ ہیں۔ یہ بال ہم نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ میں زینب میں تمہاری دلچسپی سمجھتی ہوں۔ ایک دفعہ اِن کے ابا مرحوم نے مجھ سے کہا تھا کہ حیدر کا پیغام اگر زینب کے لیے آیا تو میں ایک لمحہ بھی نہیں سوچوں گا اور اقرار کر دوں گا لیکن حالات کیا چل رہے ہیں، اِس کا اندازہ ہمیں بھی ہے اور تم کو بھی۔ میں بیٹی کی ماں ہوں اور بیٹی کی عزت کانچ کا گلاس ہوتی ہے اور گلاس کو ٹوٹنے سے پہلے بچانا ہوتا ہے۔ کیونکہ ٹوٹ گیا تو لاکھ جوڑو، بال پڑ ہی جاتا ہے اور پھر اُس گلاس کو کوئی نہیں تھامتا، ہم عزت دار لوگ ہیں۔ ہم مالدار نہیں ہیں۔ ہم بہت غریب لوگ ہیں ہم نے زندگی میں عزت بنائی اور صرف عزت ہی کمائی ہے اور عزت کے معاملے میں کوئی سمجھوتا ہم نہیں کریں گے اور شادیاں..... شادیاں تو میرے بچے نصیبوں کا کھیل ہیں۔ جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں۔ ہم جیسے ہیں ہمارے جیسوں میں ہماری بیٹی کی بھی شادی ہو جائے گی۔ آج تمہاری امی کا فون آیا تھا۔ وہ بہت برہم تھیں۔ انہوں نے وہ کچھ کہا جو شاید کوئی بھی ماں سننا نہیں چاہے گی لیکن میں نے سُنا، میں نے برداشت کیا۔ انہوں نے جو کچھ میری پاک دامن اور معصوم بچی کو کہا، کل وہ کسی اور سے بھی کہہ سکتی ہیں۔ میں کس کس کو جواب دوں گی۔ میں کس کس کے منہ پر ہاتھ رکھوں گی۔ میری بیٹی کانوں کانوں میں بدنام بھی ہو جائے گی اور اُس کو صفائی کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ یہ پیٹھ پیچھے کہتی ہے، سامنے کہے تو میں صفائی پیش کر دوں۔'' اماں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اُن کا لہجہ حیدر کو پاتال میں گرا رہا تھا اور دروازے کی آڑ میں کھڑی زینب کے آنسو اُس کے دل میں گر رہے تھے۔

''اماں آپ پریشان نہ ہوں۔ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں سب کو منا لوں گا۔'' حیدر نے اُن کو تسلی دی۔

''نہیں بیٹا رہنے دو۔ بس تم مجھ غریب بیوہ پر ایک احسان کر دو، جہاں تمہارے گھر والے کہہ رہے ہیں شادی کر لو۔ بخدا تمہارے لیے ہمارے دلوں

میں محبت کبھی ختم نہیں ہوگی کہ ہم نے تمہیں کسی لالچ کی وجہ سے اپنا بیٹا نہیں مانا، تم ہمارے بیٹے ہی ہو۔ میرے بچے تم مجھ کو بہت عزیز ہو لیکن اب کبھی ہمارے گھر نہیں آنا۔ میری بچی کے راستے میں نہ آنا۔'' اماں نے ایک ایک لفظ آنسو بھرے لہجے میں حیدر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''اماں جی پلیز ایسا فیصلہ نہ کریں۔ میں زینب سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں سب کو منالوں گا۔ پلیز مجھے موقع تو دیں۔'' حیدر نے اُن کے گھٹنے پکڑ کر کہا۔

''اچھا تم اپنے دِل کی ہر بات نکال لو۔'' زینب کی ماں حیدر کی محبتوں پر جیسے ہار مان کر بولیں۔

''سنیے حیدر۔'' زینب نے سر جھکائے باہر جاتے حیدر کو پیچھے سے آواز دی۔

''بولو۔'' حیدر کا لہجہ دھیما تھا۔

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں حیدر کہ مجھے اپنی اور اپنے باپ کی عزت اپنی محبت اور خوشیوں سے زیادہ عزیز ہے اگر مجھے محبت اور عزت میں سے کسی ایک کو چننا پڑے تو میں عزت کا انتخاب کروں گی۔ کیونکہ مجھے اپنی اَنا، اپنے خاندان کی عزت، اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اگر آپ کی بھی خوشی آئیں تو سر آنکھوں پر ورنہ..... نہیں..... قطعی نہیں۔''

بعض اوقات اِنکار کتنا مشکل ہوتا ہے اور خاص کر عورت کا محبت سے اِنکار۔ عورت اپنی روح کو کانٹوں پر گھسیٹتی ہے، قطرہ قطرہ لہو بہاتی ہے، آنکھوں میں آیا پانی زہر کی طرح پیتی ہے تو کہتی ہے..... نہیں..... بالکل نہیں۔

''کیوں میری مشکلات میں اضافہ کر رہی ہو۔ تم اتنی اچھی ہو زینب۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنی سمجھداری اور اعلیٰ اخلاق سے سب ٹھیک کر لو گی۔ پلیز اِس وقت میرا ساتھ دو۔'' حیدر اُس کے لہجے کی مضبوطی سے گھبرا گیا۔

''میں نے آپ سے کہا نا حیدر کہ اگر وہ خوشی خوشی آئیں تو آپ کا ساتھ میری زندگی ہے لیکن اگر وہ چاہیں کہ مجھے ٹھوکر پر لے کر جائیں یا میرے لیے میری ماں ان کی کڑوی کسیلی باتیں سنے، اُن کے ماتھے کا بل برداشت کرے تو نہیں..... میں اپنی ماں کی محبت کو آزمائش میں نہیں ڈالوں گی۔ میرے ماں باپ نے مجھے بہت محبتوں سے پالا ہے۔ میری ہر خواہش کا احترام کیا ہے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ میرے لاڈ اٹھائے اور آج..... آج میں اُن کے لیے پشیمانی کا باعث بن جاؤں۔ اپنا پسندیدہ کھلونا پانے کے لیے ان کا سر جھکا دوں۔ کبھی نہیں۔ آج میرا وقت ہے، اُن کا مان رکھنے کا اور بیٹیاں مان ہی تو ہوتی ہیں، فخر ہوتی ہیں، اللہ کا انعام ہوتی ہیں، عزت ہوتی ہیں اور میں اُن کی عزت کے لیے اپنی زندگی بھی قربان کر سکتی ہوں۔ تو یہ دل کیا چیز ہے۔''

زینب کا لہجہ مضبوط تھا اور حیدر شکست خوردہ انداز میں صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ گیا۔ اُس سے اُسے زندگی ریشم کی طرح ہاتھوں سے پھسلتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ بدگمان کھڑی زینب کو کیسے سمجھاتا کہ محبتوں میں امتحان بھی آتے ہیں اور ہر مرد بے وفا نہیں ہوتا۔

''ٹھیک ہے زینب میں اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش کرتا ہوں اور اگر وہ نہیں مانے تو میں گھر چھوڑ دوں گا لیکن میں تم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ میری زندگی میں ہر چیز ثانوی ہے، اگر کوئی چیز اہم ہے، لازمی ہے، تو وہ صرف زینب ہے۔'' حیدر نے کھڑے ہو کر زینب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پُرعزم لہجے میں کہا۔

''نہیں حیدر..... پلیز نہیں۔ ایسا کچھ مت کیجیے

گا۔ آپ میرے لیے اپنے والدین کی نافرمانی کریں، نہیں کبھی نہیں۔ آپ اُن کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ اُن کی بھی بہت ساری خوشیاں آپ کی ذات سے وابستہ ہوں گی۔ گھر دعاؤں کی بنیاد پر بسائے جاتے ہیں، جن گھروں کی بنیادوں میں بددعائیں، آہیں، نفرتیں ہوں، وہ گھر کبھی نہیں بس سکتے۔ میں آپ کے ساتھ ایک گھر میں رہنا چاہتی ہوں، مکان میں نہیں۔ میں آپ کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ آپ نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ میں اپنی آخری سانس تک آپ کا انتظار کروں گی۔ آپ خوشی خوشی اپنے والدین کے ساتھ آئیں گے تو میں اِس دہلیز پر آپ کو آپ کی منتظر ملوں گی۔ میں اُس دن کا انتظار کروں گی لیکن آپ اس سے پہلے ہمارے گھر مت آیئے گا کہ آپ کا آنا میرے ارادے کو کمزور کر دے گا۔ میں روز جی اور مر نہیں سکتی۔ پلیز میرے صبر کو مت آزمائیں۔ حیدر مجھے میری محبتوں کی اتنی سزا نہ دیں کہ میرے لیے جینا مشکل ہو جائے۔'' یہ کہہ کر زینب رُکی نہیں، تیزی سے اندر چلی گئی اور حیدر تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔

☆.....☆

'مجھے معاف کر دیجیے گا حیدر لیکن میں کیا کروں؟ شریف عورت اور طوائف میں واحد فرق عزت کا ہی تو ہوتا ہے اور میں نے تو بچپن میں کبھی وہ کھیل نہیں کھیلا جس میں کوئی مجھے شرمندہ کر سکے تو زندگی کے اِس موڑ پر میں اپنے گھر والوں کے لیے شرمندگی کا باعث کیسے بن جاؤں۔ میرا وہ بھائی جو سات سمندر پار ہر جمعہ کو میرے لیے اور اپنے ماں باپ کے لیے عمرہ ادا کرتا ہے، جو آج بھی وہاں سے میرے لیے چاکلیٹ بھیجتا ہے۔ میں اُس کو بتاؤں کہ میں بڑی ہو گئی ہوں اور بڑی بھی اتنی کہ اُس کو سر جھکانا پڑے گا۔ میں نے ساری زندگی صرف اِس بات کا خیال رکھا کہ میں خوش رہوں یا نہ رہوں، مجھ سے وابستہ لوگ خوش رہیں، شاد رہیں، آباد رہیں اور آج بھی میرا امتحان ہے۔ میں جانتی ہوں میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی اور یہ تکلیف خاموشی سے میں اپنے دل پر سہہ لوں گی۔ اِس امید کے ساتھ کہ ایک دن آپ آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔'

زینب نے تکیے پر سر رکھ کر دل ہی دل میں حیدر سے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں اور دائیں آنکھ سے بہتے تواتر سے آنسو اُس کا چہرہ اور تکیہ بھگوتے رہے۔

یہ تکیے بھی ہمارے کتنے بڑے راز دار ہوتے ہیں۔ ہمارے کیسے کیسے غم یہ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور کیسے کیسے دُکھ اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور پھر ایسے ہو جاتے ہیں کہ جیسے کچھ جانتے نہیں اور پھر ہم جب بھی دکھی ہوتے ہیں اور ہمارے وہ دکھ جو ہم کسی سے بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ سننے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور آج زینب کا تکیہ بھی اُداس تھا۔

☆.....☆

''کیا مطلب تم نے حیدر کو بلوایا ہے۔'' زینب نے اندر آتی طیبہ سے برہمی سے پوچھا۔ آج طیبہ نے صبح ہی گاڑی بھیج کر زینب کو بلوا بھیجا تھا اور اماں نے بھی یہ سوچ کر کہ زینب آج کل بہت اُداس ہے۔ اُس کا دل بہل جائے گا اُس کو زبردستی طیبہ کے گھر بھیج دیا تھا۔

''ماں۔'' طیبہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

''لیکن کیوں..... طیبہ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر ایسا کیوں کیا؟ اگر کسی کو پتا چل گیا تو وہ یہی سمجھے گا نا کہ میں تمہارے گھر آ کر حیدر سے ملاقاتیں کرتی ہوں۔ تم تو میرا مزاج سمجھتی ہو، اِس کا مطلب ہے کہ میں آئندہ تم پر کبھی بھروسہ نہیں کروں۔'' زینب نے برہم لہجے میں طیبہ سے کہا جو اُس کا موڈ دیکھ کر چپ سی ہو گئی تھی۔

''اچھا چلو، آج ایک بار مل لو۔ حیدر بھائی بہت پریشان ہیں۔ نہ تو تم اُن کا فون اُٹھا رہی ہو اور گھر پر آنے سے بھی تم نے اُن کو منع کر دیا ہے۔ وہ بے چارے تم سے ملنا چاہتے تھے، بات کرنا چاہتے تھے، تم کو فقط ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔ بس میں اُن کی ریکوئسٹ رد نہیں کر سکی۔'' طیبہ نے مضبوط لفظوں میں اپنا دفاع کیا۔

''نہیں..... میں جا رہی ہوں۔'' زینب نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''زینب میری بہن، حیدر بھائی ٹوٹ رہے ہیں۔ اُن کے گھر والے کسی طور پر اُن کی بات نہیں مان رہے۔ وہ تم سے مل کر اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ اتنی کٹھور تو نہ بنو۔''

''وہ مرد ہو کر ٹوٹ رہے ہیں۔ گھر والوں کا دباؤ فیس نہیں کر پا رہے، تو میں تو ایک عورت ہوں۔ پلیز طیبہ اگر تم چاہتی ہو میں تم سے دوستی ختم نہ کروں تو اُن سے جا کر کہو کہ میں اُن ہی کی ہوں لیکن پلیز میری پاکیزہ محبت کو پاکیزہ ہی رہنے دیں۔ اللہ کے واسطے میری زندگی کو اتنا مشکل نہ کریں کہ آئندہ کوئی بھی لڑکی لفظ محبت سے ڈرنے لگے۔'' زینب کہتے کہتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور طیبہ تاسف سے بیٹھی اُس کو دیکھتی رہ گئی۔

☆.....☆

آج جب زینب نے حیدر کو سر جھکائے طیبہ کے گھر سے جاتے دیکھا تو اُسے ایسا لگا کہ کسی نے اُس کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ 'حیدر میں کیا کروں؟ میں آپ کو شکست خوردہ نہیں دیکھ سکتی۔ شاید میں اپنے اصولوں کو توڑ دیتی، میں اپنی اَنا کو سُلا دیتی اگر اُس دن میں وہ باتیں نہ سُن لیتی جو آپ کی ممی نے میری بیوہ ماں کو سنائیں۔ کاش میں وہ جملے نہ سنتی، کاش میں وہ حقارت بھری صلواتیں نہ سُنتی۔ میری بیوہ ماں کا کیا قصور تھا؟ صرف غربت اور ایک بیٹی کی ماں ہونا! میں محبت کی ہر آزمائش کے لیے تیار ہوں لیکن اگر آپ میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنے گھر میں میرے لیے باعزت جگہ بنا سکیں تو میں فقط آپ کا دل بہلانے کے لیے اپنی شخصیت، عزت اور وقار کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔' سوچتے سوچتے اُس نے خدا کے حضور ہاتھ اُٹھا دیے۔

''یا میرے مالک! میرے اللہ! میری مدد فرما، مجھے ثابت قدم رکھ۔ میرے دل کی، میری محبت کی ڈور صرف تیرے ہاتھ میں ہے۔ اے کاتبِ تقدیر میرے حق میں بہتر فیصلہ کر۔''

اور پھر فیصلہ ہو گیا۔

☆.....☆

'حیدر تم بھی آخر ہار گئے۔ محبتوں میں ہار کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے، آج احساس ہوا۔ مرد اور وفا، ہونہہ، میں بھی کن خیالوں میں گم تھی۔ تم تو انتظار بھی نہ کر سکے۔ تمہارے وعدے، تمہاری قسمیں، تمہاری محبتیں سب جھوٹ تھا۔ بس ایک ظلم بہت ہوا کہ میرا محبتوں پر سے اعتبار اُٹھ گیا۔'

آج حیدر کی منگنی تھی اور اماں حیدر کی منگنی میں حیدر کی ممی کے بے حد اصرار پر گئی تھیں اور زینب کا تکیہ زینب کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ آج زینب کا محبتوں پر سے ہمیشہ کے لیے اعتبار اُٹھ گیا تھا۔

☆.....☆

''میڈم یہ میں آپ کے لیے لائی تھی۔'' آج ویلنٹائن ڈے تھا اور میڈم علی کی پسندیدہ اسٹوڈنٹ فاطمہ، اُن کے لیے سرخ گلاب لیے نہ جانے کب سے اُن کا انتظار کر رہی تھی۔

''کیوں؟'' میڈم علی کے چہرے کے تاثر بگڑے۔

''میڈم! آج ویلنٹائن ڈے ہے نا اور آپ مجھے اچھی لگتی ہیں بلکہ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں، اِس لیے میں آپ کے لیے لائی تھی۔'' فاطمہ نے معصومیت سے کہا۔

''میں آپ کو اچھی لگتی ہوں۔'' میڈم علی نے حیرت سے پوچھا۔

''Yes Madam'' معصومانہ سا جواب آیا۔

''مجھ میں اچھی لگنے والی کیا بات ہے۔''

''میڈم میں ہی کیا پوری کلاس آپ کی دیوانی ہے۔ آپ سے محبت کرتی ہے، پلیز یہ لے لیں۔'' فاطمہ نے پھول اُن کی طرف بڑھائے۔

''برسوں ہوئے میرا محبت پر سے اعتبار اُٹھ گیا تھا کیونکہ آپ مجھ سے محبت کا دعویٰ کر رہی ہیں۔ اِس لیے میرا آپ پر سے بھی اعتبار اُٹھ گیا۔ آئی ایم سوری، میں یہ نہیں لے سکتی۔'' میڈم زینب رفاقت علی نے سرد لہجے میں کہا اور ناظمہ کو ہکا بکا چھوڑ کر آگے بڑھ گئیں۔

ناظمہ جیسی معصوم لڑکی کیا جانتی تھی کہ بے اعتباری اور ٹھکرائے جانے کا دُکھ انسان کو کس طرح زخمی کرتا ہے۔ یہ کوئی زینب سے پوچھتا۔

☆.....☆

''رات کا فنکشن زبردست تھا۔ تقریباً تمام نیوز پیپرز اور چینل پر لائیو کوریج کی گئی۔ وزیر اعلیٰ صاحب کی آمد سے تو چار چاند لگ گئے تھے۔'' مسز احتشام نے ناشتہ کی ٹیبل پر احتشام حسن سے کہا۔

''کوئی معمولی بات تو نہیں تھی، احتشام حسن کے اکلوتے بیٹے کی منگنی تھی۔'' احتشام صاحب نے دلیہ باؤل میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ صاحبزادے کہاں ہیں؟ ابھی تک سو رہے ہیں کیا؟'' اچانک اُن کو احساس ہوا کہ حیدر ناشتہ کے لیے نہیں آیا۔

''تھک گیا ہوگا، میں بلواتی ہوں، آپ ناشتہ کریں۔'' مسز احتشام نے میاں سے کہتے ہوئے ملازم کو اشارہ کیا کہ حیدر کو بلا کر لائے۔

''جی، حیدر صاحب کمرے میں نہیں ہیں۔'' احمد علی نے آ کر باادب انداز میں کہا۔

''کمرے میں نہیں ہے تو کہاں ہے؟'' مسز احتشام نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''بیگم صاحب، صبح چھوٹے صاب جاتے ہوئے یہ لفافہ دے کر گئے تھے کہ آپ کو دے دوں۔'' باہر سے چوکیدار نے آ کر ایک لفافہ مسز احتشام کی طرف بڑھایا۔

''حیدر لفافہ دے کر گیا ہے!'' مسز احتشام بڑبڑائیں اور احتشام حسن نے جلدی سے لفافہ میں سے پرچہ نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔

''کیا لکھا ہے، مجھے بھی تو بتائیے۔'' مسز احتشام نے گھبرا کر کھڑے ہوتے ہوئے میاں سے کہا۔

''ڈرائیور گاڑی نکالو..... جلدی کرو۔'' احتشام حسن نے ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے پرچہ اُن کی طرف بڑھا دیا اور خود تیزی سے باہر کی طرف لے گئے۔

☆.....☆

''یار کب تک اِس طرح رہے گا۔ کتنا عرصہ ہو گیا تجھے پاکستان سے آئے ہوئے۔ وہاں نہیں جاتا تو یہیں شادی کر لے۔'' رضا نے کافی پیتے ہوئے گلاس ونڈو کے پاس خاموش بیٹھے حیدر سے کہا۔

''کتنا عرصہ ہو گیا، میں نے حساب لگانا چھوڑ دیا ہے۔'' حیدر سوچ کر رہ گیا۔

''ویسے میں نے سنا ہے انکل اور آنٹی آئے ہوئے ہیں۔ کتنی دفعہ وہ لوگ آ چکے لیکن تُو اُن سے ملتا کیوں نہیں؟'' رضا اپنے پسندیدہ موضوع پر آ چکا تھا۔

''تم نے اُن کو میرے بارے میں بتایا تو نہیں

کہ میں یہاں ہوں؟'' حیدر نے جلدی سے پوچھا۔

''آج تک بتایا ہے جواب بتاؤں گا۔ اَب تو اُن لوگوں نے پوچھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ آنٹی بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ تجھے پتا ہے؟'' رضا نے جذباتی بلیک میلنگ شروع کی۔

''ممی ایک مضبوط اور طاقت ور عورت ہیں۔ وہ کبھی کمزور نہیں پڑتیں۔ میں نے ممی کو محاذوں پر ڈٹے ہوئے دیکھا ہے۔'' حیدر کے لہجے میں ماضی کی تلخی تھی۔

''ویسے سُنا ہے اب تو نازیہ کے بھی دو بچے ہوگئے ہیں۔'' رضا ہنسا۔

''چلو سمجھدار رہی۔ میرے آتے ہی منگنی کی انگوٹھی پھینک کر شادی کرلی، جس کے بارے میں میرے گھر والوں کا خیال تھا کہ اگر میں اُس کو نہ ملا تو وہ مرجائے گی اور میری اکلوتی پھوپی بھی زہر کھالیں گی۔ اَب میں تو اُسے ملا نہیں، نہ وہ مری اور نہ اُس کی والدہ۔ میں زندہ درگور ہوگیا اور.....'' حیدر کی آنکھوں میں ایک خوب صورت چہرہ لہرایا۔

'ہوسکتا ہے وہ بھی کسی کے ساتھ ہنستی مسکراتی زندگی گزار رہی ہو۔' حیدر سوچ کر رہ گیا۔

''ویسے یار ایک بات تو بتا۔ اگر تجھے نازیہ سے شادی ہی نہیں کرنی تھی تو تُو نے منگنی کیوں کی تھی۔'' رضا نے پوچھا۔

''میں نے منگنی کیوں کی۔ رضا کا سوال حیدر کو برسوں پیچھے لے گیا۔

''ممی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں زینب کے علاوہ کسی اور سے شادی کروں۔ نازیہ زہر کھاتی ہے تو کھائے، ڈیڈی مجھے عاق کرنا چاہتے ہیں، I don't care لیکن نازیہ سے یا کسی بھی لڑکی سے شادی! سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' حیدر نے قطعیت سے کہا۔

''سوچ لو حیدر، اگر تم ضد کرو گے تو میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ میں اُس لڑکی کو نہیں چھوڑوں گی، جس نے تم کو ہمارے مقابل کھڑا کردیا۔ یہ غریب لوگ عزتوں پر بہت مرتے ہیں۔ ان کے پاس ہوتا کیا ہے، عزت کے علاوہ۔ میں اُس کی اور تمہاری محبت کو میڈیا پر اُچھالوں گی۔ میں اُس کے پورے خاندان کو خودکشی پر مجبور کردوں گی سُنا تم نے۔ میں اس لڑکی کو، اُس کے خاندان کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گی۔'' اور پھر مسز احتشام نے ایک D.V.D لگا کر دی، جس میں کسی غیر ذمہ دار چینل نے جھوٹی فلم بنائی تھی۔

''Oh my God! ممی یہ آپ کیا کرنے جارہی ہیں۔'' حیدر دم بخود تھا۔

''کرنے جا نہیں رہی، تاش کے پتے تیار کررہی ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو استعمال کروں گی اور نہ ضرورت پڑی تو پھینک دوں گی۔ اب یہ تم فیصلہ کرو کہ اِس D.V.D کا کرنا کیا ہے؟'' مسز احتشام، اُس کی اپنی ماں ایک بلیک میلر بھی تھیں۔ یہ انکشاف حیدر پر پہلی دفعہ ہوا اور وہ خاموش بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا کہ جس لڑکی کے دوپٹے پر نماز پڑھنے کو دل مچلتا ہو، وہ ٹی وی اسکرین پر رسوا ہو۔ یا اللہ لوگ سائنس کی ترقی کا کس طرح استعمال کررہے ہیں۔ حیدر مرد ہوکر رو رہا تھا۔

''کیا ہوا حیدر، رو کیوں رہے ہو۔'' رضا گھبرا کر حیدر کے پاس آکر اُس کا شانہ ہلا کر بولا اور حیدر جیسے حال میں واپس آگیا۔

'میں رو رہا ہوں، تجھے آج نظر آرہا ہے کہ میں رو رہا ہوں، میں تو روز روتا ہوں، ہر پل روتا ہوں۔' حیدر نے خاموش نظروں سے حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا اور آنسو پونچھتا ہوا کھڑا ہوگیا اور رضا خاموشی سے اندر جاتے ہوئے حیدر کو دیکھتے

ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

☆.....☆

''ممی میں جارہا ہوں۔ آپ سے، آپ کے گھر سے، آپ کی دنیا سے بہت دور۔ آپ کی شرط تھی منگنی کرلو، میں نے منگنی کرلی۔ شادی کرنے کا کوئی ایگریمنٹ ہمارے درمیان نہیں ہوا تھا۔ آپ کا بیٹا ہونے کے باوجود میں نے اپنا وعدہ نبھا دیا۔ میں کہاں جارہا ہوں، فی الحال تو میں خود بھی نہیں جانتا، ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر آپ نے زینب یا اُس کے گھر والوں کو کسی بھی قسم کی تکلیف دینے کی کوشش کی تو جس طرح آج میں نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا، اِسی طرح دنیا چھوڑ دوں گا اور آپ اچھی طرح جانتی ہیں، میں ایسا ہی کروں گا۔ آپ جب چاہیں آزمالیں۔

آپ کبھی بھی محبت کی اُس گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی ہیں جو میں نے زینب سے کی۔ کیونکہ آپ نے کبھی محبت کی ہی نہیں۔ آپ نے، ڈیڈی نے، شائلہ نے، آپ سب نے تجارت کی ہے۔ ممی تجارت اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ آپ کہتی ہیں میں نے زینب سے محبت کرتے ہوئے کچھ نہیں سوچا؟ ہاں میں نے کچھ نہیں سوچا کیونکہ محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی جو سوچ سمجھ کی جاتی ہے وہ تجارت ہوتی ہے اور میں نے محبت کی ہے۔ آج کے بعد زینب بھی مجھے بے وفا ہی سمجھے گی، اچھا ہے سمجھ لے! اِس طرح کم از کم وہ مجھ جیسے بُزدل کا انتظار تو نہیں کرے گی نا لیکن اَب جب میری زندگی میں زینب نہیں تو پھر کوئی امید، آس، کوئی خوشی کچھ نہیں۔ مجھے زینب کی شکل وصورت، گھر سے محبت تھوڑا ہی تھی، مجھے زینب کے کردار سے محبت ہے۔ مجھے زینب کی پاکیزگی سے محبت ہے۔ مجھے وضو کے لیے اُس کے ڈھلے ہوئے چہرے سے محبت ہے۔ بڑی سی چادر میں چھپے اُس کے وجود سے محبت ہے۔ اُس کے اعلیٰ اخلاق و کردار سے محبت ہے لیکن آپ کیا جانیں کہ پاکیزہ لڑکیاں کیا ہوتی ہیں۔ مصنوعی لوگوں کے درمیان، مصنوعی گفتگو کرنے والی لڑکیاں ہی آپ جیسے لوگوں کو بھا سکتی ہیں۔

آپ نے مجھ سے میری محبت ہی نہیں چھینی، آپ نے مجھ سے میری زندگی بھی چھین لی ہے۔ آج مجھے سانس لینے میں تکلیف محسوس ہورہی ہے۔ زینب تو میرے لیے آکسیجن تھی۔ آپ سے شکایتیں تو بہت ہیں۔ کہنا بھی بہت کچھ ہے لیکن رہنے دیں پتھروں پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی دولت کی طاقت کو آزما لیجیے گا، میں اپنی محبت کو آزماؤں گا۔''

مسز احتشام نے نم آنکھوں سے حیدر کا لکھا ہوا وہ پرچہ پڑھا، جو وہ وقت اُن کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ آٹھ سالوں سے روزانہ مسز احتشام اِس تحریر کو کئی کئی دفعہ پڑھتیں۔ جوان بیٹے کی جدائی نے اُن کو توڑ دیا تھا۔ دنیا کا کون سا کونا تھا جہاں انہوں نے خود جاکر حیدر کو تلاش نہ کیا ہو۔ لیکن حیدر تو اچھے نصیب کی طرح روٹھ گیا تھا۔ وہ کئی دفعہ زینب کے گھر بھی گئیں لیکن وہ لوگ وہاں سے شفٹ ہوگئے تھے اور اِن آٹھ سالوں میں مسز احتشام کو سیکڑوں دفعہ محبت کی طاقت کا اندازہ ہوا تھا۔

''مجھے معاف کردو، میں اور تمہارے ڈیڈی، ہم دونوں تمہارے لیے بے قرار ہیں۔ ہمیں معاف کردو۔ واپس آجاؤ میرے بچے پلیز۔'' مسز احتشام پرچہ مٹھی میں بھینچ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں کہ یہ روز کا معمول تھا اور خدا تو نم آنکھوں سے مانگی گئی توبہ ضرور قبول کرتا ہے۔

☆.....☆

'زینب کیسی ہوگی؟ کیا کررہی ہوگی؟' حیدر اکثر سوچتا لیکن اُس کا کوئی رابطہ نہیں تھا لیکن وہ اتنا ضرور

جانتا تھا کہ زینب جہاں بھی ہوگی خیریت سے ہوگی کہ پچھلے آٹھ سالوں میں اُس نے اللہ سے صرف زینب کی خوشیاں ہی تو مانگی تھیں۔

زندگی ہے ہی حادثات کا مجموعہ اور بعض حادثات ہمارے ساتھ، ہمارے پیاروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور پھر ہمارے غم، ہمارے پیارے، ہم سے زیادہ اپنے دلوں پر سہتے ہیں۔ زینب کی خاموشی اور افسردگی نے بھی اماں کو بستر پر لگا دیا تھا اور کسی کو تکلیف دینا تو زینب کی سرشت ہی میں نہیں تھا، سو اماں کے لیے اُن کی تسلی اور اطمینان کے لیے زینب نے اپنے اوپر ایک خول چڑھا لیا۔ وہ خول جو سمجھوتے اور برداشت کی چادر سے تیار ہوتا ہے وہ تو چیونٹی تک کو نہیں مار سکتی تھی، سو اپنے گھر والوں کو کیسے دُکھی کر سکتی تھی۔

اور پھر جیسے اُس نے اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ جو محبت کی پہلی آزمائش میں ہار گیا، جو اپنا آشیانہ بنانے جا رہا ہے، اُس کے لیے میں اپنے آپ کو تباہ اور اپنے پیاروں کو دُکھی نہیں کروں گی۔

وہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ محبت کے قابل تھی وہ وقت گزاری کی چیز نہیں تھی۔ وہ راہ کا معمولی پتھر نہیں تھی کہ جس کا جب دل چاہے ٹھوکر مار دے۔ اُس کو حیدر سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک دن حیدر کو پچھتاوا ضرور ہو۔ حیدر اور اُس کا جب بھی سامنا ہو، پچھتاوا حیدر کا مقدر بن جائے۔

اُس نے اپنے آپ کو گروم کیا۔ اعلیٰ تعلیم اور بہترین شخصیت، مضبوط کردار نے اُس کو آسمان پر بٹھا دیا۔ بڑے بڑے خاندانوں سے اُس کے لیے رشتے آنے لگے لیکن وہ کہیں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ لاکھ غصہ سہی، شکایتیں سہی، محبت تو وہ آج بھی حیدر ہی سے کرتی تھی۔ پھر کچھ قدرت نے بھی اُس کا ساتھ دیا کہ اماں کہیں بات چلاتیں بھی تو بات طے نہیں ہو پاتی۔ اَب یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ کاتبِ تقدیر نے کیا لکھ رکھا ہے۔

زینب شہر کے ایک نامور کالج میں زولوجی کی اسسٹنٹ پروفیسر تعینات ہوئی اور ساتھ ساتھ وہ پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھنے لگی اور انہی دنوں اماں اُس کی شادی کا ارمان دل میں لیے، منوں مٹی تلے جا سوئیں اور وقاص اپنے بیوی بچوں کے ساتھ واپس پاکستان آ گیا۔ زندگی بدل گئی، حالات بدل گئے اور گھر بھی بدل لیا گیا تھا۔

اور یوں وہ واحد اُمید کہ کاش کبھی حیدر آئے..... بھی ختم ہوئی اور پھر زینب میڈم علی کی حیثیت سے پہچانی جانے لگی۔

☆.....☆

میڈم علی جو ایک بہترین اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ ترین رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ہر اسٹوڈنٹ کی آئیڈیل تھیں، جو ہر ایک دل میں دھڑکتی تھیں لیکن اُن کے دل میں..... اُن کے دل میں کون دھڑکتا تھا۔ برسوں ہوئے، زینب رفاقت علی اپنے دل کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھا کر آنسو بہا چکی تھی اور جو چیز دفنا دی جائے اُس کے لیے آنسو تو بہائے جا سکتے ہیں لیکن ملنے کی اُمید رکھنا حماقت ہی تو ہوتی ہے اور ایسی کوئی حماقت کم از کم زینب نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن اگر ہم زندوں پر فاتحہ پڑھ لیں تو اُن سے تو ملنے کی امید ہوتی ہے نا!

☆.....☆

وقاص نے موبائل فون پر جگمگاتے Unknown نمبر پر جواب کے لیے فون Yes کیا۔

''کیا میں وقاص رفاقت علی صاحب سے ہی بات کر رہا ہوں۔'' ٹیلی فون میں آواز اُبھری۔

''Yes۔'' وقاص حیران تھا۔

''میں رضا بات کر رہا ہوں۔'' اجنبی نے تعارف کرایا۔

''کون رضا؟'' وقاص کے لیے وہ اب تک اجنبی ہی تھا۔

''آپ مجھ کو نہیں جانتے لیکن میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہت مشکل سے آپ کا نمبر حاصل کیا ہے۔ میں امریکہ سے پاکستان صرف اور صرف آپ کو ڈھونڈنے اور آپ سے ملنے آیا تھا۔ کیا آپ مجھے ملنے کا تھوڑا ٹائم دیں گے۔'' رضا نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''میں تو آپ کو جانتا تک نہیں ہوں اور آپ مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا اور ایسے میں کیسے کسی اجنبی کی کال پر ملنے جا سکتا ہوں؟'' وقاص نے نرمی سے کہا کہ شہر کے حالات نے سب ہی کو ہراساں اور خوفزدہ کر دیا تھا۔

''بالکل، بالکل آپ کی ہچکچاہٹ سر آنکھوں پر۔ آپ مجھے نہیں جانتے کوئی بات نہیں لیکن کیا آپ حیدر کو تو جانتے ہیں نا۔'' رضا نے پوچھا۔

''حیدر..... حیدر کہاں ہے؟'' وقاص کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''بس میرے بھائی مجھے آپ سے حیدر کے بارے میں ہی بات کرنی ہے۔ میں آپ کے گھر کے باہر کھڑا ہوں؟ کیا آپ مجھے اپنے گھر میں بٹھا کر چائے نہیں پلوائیں گے۔'' رضا کے لہجے میں اپنائیت ہی اپنائیت تھی۔

''Off course میں آتا ہوں۔'' حیدر نے جلدی سے موبائل آف کیا۔

''ملاحت، ذرا اچھی سی چائے تو بناؤ، میرے ایک دوست آئے ہیں۔'' وقاص نے تیزی سے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''آپ آرام کیجیے بھابی، میں بنا دیتی ہوں۔'' زینب نے بہت شوق سے صوفے میں دھنسی ناول پڑھتی ملاحت سے کہا۔

''تھینکس ڈیئر..... میں بھی پیوں گی۔'' ملاحت اور چائے نہ پیے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''اور اِس وقت اِتنا شدید سر درد ہو رہا ہے کہ آپ ہی نہیں میں بھی پیوں گی۔'' زینب مسکرائی۔

''زینب تم ہنستی کیوں نہیں ہو؟'' ملاحت نے کہا۔

''ہنستی تو ہوں بھابی۔''

''ہنسی اور مسکراہٹ میں بہت فرق ہوتا ہے میری جان! تم مسکراتی ہو کنجوس۔'' ملاحت نے کہا اور زینب بے ساختہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی اور اُس لمحے وقاص رضا کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

'اگر یہی زینب ہے تو حیدر میرے یار تیرا جوگ صحیح ہے اور اب آزمائش ہے میری دوستی کی کہ تجھے تیری زینب سے پھر سے ملوا دوں۔' حیدر نے اپنے آپ سے عہد کیا۔

اور جب کسی کام کے ہونے کا وقت آتا ہے تو سارے عہد خود بخود پورے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تو کیا ملن کی گھڑی قریب تھی؟ بعض اوقات ہاتھوں سے ہاتھ بھی تو چھوٹ جاتے ہیں.....!

☆.....☆

ایک وفا کو پانے کی کوشش میں
زخمی ہوتی ہیں وفائیں کتنی
کتنا معصوم سا لگتا ہے لفظ محبت
اور اِس لفظ سے ملتی ہیں سزائیں کتنی

تو حیدر صاحب لاکھ دعوؤں، قسموں اور وعدوں کے باوجود آج آپ پرائے ہوئے۔ بات تو کچھ بھی نہ تھی لیکن آپ کی وجہ سے محبتوں پر سے اعتبار اُٹھ گیا۔ مجھ بہت خاص سی لڑکی کو آپ نے بہت عام کر دیا۔ آپ نے محبت کی ہی نہیں، تو نبھائی بھی نہیں۔ شکایت کیسی۔ میں نے محبت کی ہے تو نبھاؤں گی بھی۔ آپ نے مجھے بہت دُکھ دیے،

تکلیف دی لیکن میں تو آپ کو بددُعا بھی نہیں دے سکتی کہ میں نے آپ کو بہت چاہا ہے اور شریف عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ ہاں میری اپنے اللہ سے یہ دُعا ہے کہ اب آپ کا اور میرا کبھی سامنا نہ ہو کہ میں آپ کو معاف کرنا نہیں چاہتی اور جو آپ میرے سامنے آگئے تو میں آپ سے ناراض بھی نہیں رہ سکتی۔ آپ نے ایک ہنستی مسکراتی زینب کو مار دیا۔ آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔

زینب رفاقت علی

حیدر کے ہاتھ میں زینب کا لکھا وہ خط جس کو پچھلے کئی سالوں سے وہ روز پڑھ پڑھ کر روتا تھا، بھیگ رہا تھا اور کان......!

☆......☆

''حیدر میں وقاص بات کر رہا ہو۔ تم سُن رہے ہو نا۔''

''وقاص۔'' ٹھنڈے یخ موسم میں حیدر پسینہ پسینہ تھا۔

''ہاں یار! کہاں چلا گیا۔ ایسا روٹھا کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔'' حیدر کے کانوں میں وقاص کی اپنائیت بھری آواز اُبھر اور ڈوب رہی تھی اور حیدر کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز۔ کسی نے سچ کہا کہ زندگی میں اگر ایک بھی مخلص دوست مل جائے تو انسان کبھی مفلس نہیں ہو سکتا اور حیدر کی زندگی میں تو دو بہت مخلص دوست تھے جو سات سمندر پار سر جوڑے اُس کی دائمی خوشیوں کی پلاننگ کر رہے تھے۔

کہتے ہیں خدا کے گھر دیر ہے، اندھیر نہیں، جب رات زیادہ کالی ہو جائے تو جان لو کہ صبح قریب ہے اور حیدر کی زندگی میں صبح آنے والی تھی لیکن زینب......زینب اب وہ زینب تو نہ رہی تھی۔ زینب اب میڈم زینب رفاقت علی تھی۔

☆......☆

''تمہیں پتا ہے ناظمہ تم نے کتنا بڑا مسئلہ حل کر ہے۔'' رضا نے محبت سے ناظمہ سے کہا۔ ناظمہ جو اُس کی بھتیجی ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کی دوست بھی تھی۔ اُس نے ویلنٹائن ڈے پر امریکہ فون کر کے بڑے نم لہجے میں اپنے چاچو کو اپنی میڈم کی باتیں بتائی تھیں کہ کس طرح انہوں نے اُس کے فلاور لینے سے انکار کر دیا اور نہ جانے کیوں وہ محبت سے چڑتی ہیں اور پھر رضا کی چھٹی حس نے کہا کہ ہو نہ ہو، میڈم علی ہی حیدر کی زینب ہے اور پھر اُس نے ناظمہ کو زینب کے پیچھے لگا دیا اور پھر کچھ ہی دنوں بعد ناظمہ کی دی ہوئی اطلاعات پر یقین رکھتے ہوئے رضا پاکستان چلا آیا۔

☆......☆

اطلاعی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ پتا نہیں سب لوگ کہاں چلے گئے۔ 'صبح سے تو اِس قدر بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی، جیسے زندگی کی پہلی چاندرات ہو یا کوئی پرائم منسٹر آ رہا ہے اور اَب کوئی دروازہ کھولنے کے لیے بھی نہیں ہے۔' سوچتے ہوئے زینب نے دروازہ کھول دیا اور بے ساختہ غیر ارادی طور پر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

کملائی ہوئی رنگت، آنکھوں میں بے پناہ تھکن اور چہرے پر اُمید اور خوف لیے حیدر کھڑا تھا۔ حیدر جس کو اِس زندگی میں دوبارہ دیکھنے کی اُمید وہ ختم کر چکی تھی اور حیدر کے پیچھے ایک کمزور اور بوڑھی عورت...... وہ گردن اکڑائے کھڑی مسز احتشام تو نہیں تھیں۔ وہ تو کوئی کمزور......شکستہ......تھکی ہوئی ماں تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے زینب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے اور پھر یونہی دروازہ چھوڑ کر وہ تیز قدموں سے واپس اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئی اور خاموشی سے کرسی پر جا بیٹھی کہ برسوں سے دبا ہوا

غصہ، شکایت اور ناراضگی، وہ تو ایک لفظ بھی نہیں بول سکی لیکن ہاں آنسو، آنسو اُس کے چہرے پر سے ہوتے ہوئے اُس کے گریبان میں جذب ہوتے رہے۔ مسز احتشام باہر لاؤنج میں رُک گئیں اور حیدر اندر چلا آیا۔

زینب آج بھی اُس کا پسندیدہ بلیک کلر پہنی ہوئی تھی، اور اس کے سر پر وہی نماز کا ململ کا دوپٹہ تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں اُسی طرح کانچ کی چوڑیاں تھیں لیکن ہاں زینب ہنسنا بھول گئی تھی۔ حیدر کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

''زینب۔'' حیدر نے زمین پر دوزانو بیٹھ کر اُس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے پکارا اور زینب کو ایسا لگا جیسے کسی بچھو نے اُس کو ڈنک مارا ہو۔ وہ بَل کھا کر دور جا کھڑی ہوئی۔

''زیب صرف ایک بار میری بات سُن لو۔ مجھے صفائی کا موقع تو دو۔ دیکھو تم نے کہا تھا کہ جب تک میرے گھر والے خوشی خوشی نہ آئیں گے، تم راضی نہیں ہو گی۔ آج تمہارے دروازے پر مسز احتشام احسن نہیں ایک ماں آئی ہیں۔ تم اُس ماں کو تو معاف کر دو گی نا، جو برسوں بیٹے کی شکل اور آواز کو ترسی ہو جو روز یہ سوچ کر روئی ہو کہ اُس کا بیٹا زندہ بھی ہے یا نہیں۔''

اور پھر حیدر ورق ورق زندگی پلٹتا رہا اور زینب خاموشی سے سنتی رہی۔ سارے گلے، شکوے اور بدگمانیاں اُس لمحے ہمیشہ کے لیے ختم ہوئے جب حیدر کی بات ختم ہونے کے بعد مسز احتشام نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کر اُس سے اپنے بیٹے کی خوشیاں مانگیں۔

''خواتین و حضرات اگر آپ سب کے ایک دوسرے سے گلے، شکوے، شکایتیں اور ناراضگیاں ختم ہو گئیں ہوں تو تشریف لے آئیے کیونکہ روزہ کھلنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔'' ملاحت اور ناظمہ نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا اور زینب برسوں بعد بے ساختہ ہنسی۔ اُس لمحہ اُس کو ناظمہ پر بے پناہ پیار آیا، جس نے اُس کو محبتوں پر اعتبار واپس دلایا تھا۔

''جلدی جلدی روزہ افطار کریں کیونکہ آج چاندرات ہے اور آج......'' ملاحت نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ''آج چاند ہونے کے بعد، حیدر بھائی کے بے حد اصرار پر محترمہ زینب صاحبہ کا اُن سے عقدِ مسنونہ ہے اور رخصتی خوب دھوم دھڑکے سے عید کے چوتھے دن۔''

''کیا کہہ رہی ہیں آپ۔'' کھجور زینب کے حلق میں اٹک سی گئی۔

''بس زینب! ایک چاندرات کو تم نے اِقرار کیا تھا، یاد ہے نا۔'' حیدر نے سرگوشی کی۔ زینب کے اندر سے میڈم زینب رفاقت علی تو پھر سے غائب ہو گئیں اور باقی رہ گئی زینب......تو زینب نے شرما کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو اِس چاندرات کو بھی امر بنانے دو۔'' حیدر کی آنکھوں میں التجا تھی۔

ہر طرف قہقہے تھے، خوشیاں تھیں، مسکراہٹیں تھیں اور اُن سب کے درمیان چاندرات کو دلہن بنی زینب سوچ رہی تھی۔ زندگی کتنی حسین ہے اور سب سے مبارک بادیں وصول کرتا حیدر سوچ رہا تھا کہ یا اللہ تیرا شکر تو نے مجھے میری محبت میں معتبر ٹھہرایا۔ زندگی کتنی حسین ہے اور یہ چاندرات......

چاروں طرف خوشگوار شور نے حیدر کو کچھ سوچنے نہیں دیا اور حیدر اب کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

☆☆......

ناولٹ

نسرین نکہت سبزواری

دیارِ وفا میں

جب رمضان کا مہینہ آیا تو عینی کو یاد آیا کہ اُسے اپنوں سے بچھڑے ایک سال سے زیادہ ہوگیا ہے۔ ہوسٹل کے کمرے میں اس کے علاوہ کوئی مسلمان لڑکی نہیں تھی۔ عینی خاموشی سے جوس کے ساتھ برگر وغیرہ کھا کر روزہ رکھ لیتی اور......

ذہن کے در وا کرتا، عید نمبر کا خصوصی ناولٹ

ہر روز کی طرح آج بھی اُس کی آنکھ برتنوں کو اٹھا کر پٹخنے اور ٹوٹنے کی آوازوں سے کھلی تھی اور پس منظر میں اس کی سوتیلی ماں اور پاپا کے درمیان تیز و تند جملوں کا طوفان بھی تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کے پاپا اور سوتیلی ماں کے درمیان یہ لڑائی جھگڑے روز کا معمول تھے۔ وجہ اُسے آج تک معلوم نہیں ہو سکی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔

سوتیلی ماں کے نزدیک آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا بلکہ وہ تو اپنے پاپا سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں تھی۔ دراصل ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے قریب آتے، اس کی تنہائی کے درد کو جانتے اور اُس کے گوناگوں مسائل کو سمجھ سکتے۔ عینی نے بھی بالغ ہونے کے بعد باپ پر بوجھ بننا گوارہ نہیں کیا تھا۔ وہ شکاگو کی ایک یونیورسٹی میں ماس کمیونیکیشن میں ایم ایس سی کر رہی تھی۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر وہ وقت اور ماحول کی مناسبت سے مختلف کام کر لیتی تھی۔ اسے کام کی نوعیت کی بھی فکر نہیں ہوتی تھی، بس پیسے سے دلچسپی ہوتی تھی چونکہ اسے تعلیم کے اخراجات کے علاوہ اپنے دوسرے مشاغل کے لیے بھی پیسے کی ضرورت ہوتی تھی۔

اس کی بہت سی گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز تھے اور اس دوستی کو برقرار رکھنے کے لیے اسے کافی رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔ حالانکہ اسے والدین کی طرف سے کسی قسم کی پابندی کا سامنا نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے کبھی اسے مذہب اور اخلاقیات پر لیکچر دینے کی کوشش کی تھی۔ انہیں تو اس کی مصروفیات اور مشاغل سے بھی قطعی سروکار نہیں تھا لیکن عینی نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اپنے لیے خود ہی کچھ اصول وضع کر رکھے تھے۔

وہ رات کو زیادہ دیر تک باہر نہیں رہتی تھی۔ کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ اکیلی زیادہ رات تک گھومتی پھرتی نہیں تھی اور نہ ہی کسی لڑکے کو اتنی لفٹ کراتی تھی کہ وہ آپے سے باہر ہو جائے۔ شراب سے تو اُسے ویسے ہی نفرت تھی۔ شراب کے نشے میں اُس کے ماں باپ جب آپس میں لڑتے تھے تو اُسے اُن کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ اُسے ڈسکو کلبز سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ خاص خاص موقعوں پر مثلاً نیو ایئر نائٹ وغیرہ پر وہ سب دوست مل جل کر ہلا گلا کر لیتے تھے۔

عینی کی سوتیلی ماں ایک عیسائی عورت تھی اور پاپا بس نام کے مسلمان تھے۔ اُس کی ہفتوں پاپا سے بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اکثر سو رہی ہوتی تھی کہ وہ دونوں اپنی اپنی جاب پر نکل جاتے تھے۔ رات کو جب وہ لوگ آتے تو اُس کی آنکھ ضرور کھل جاتی تھی کیونکہ وہ دونوں اکثر لڑتے جھگڑتے گھر میں داخل ہوتے تھے۔

صبح کو جب اُن کے شور و غل سے اُس کی آنکھ کھلتی تو وہ دونوں تکیوں سے سر چھپا کر اُس ہنگامے کو اپنے کانوں تک نہ پہنچنے کی کوشش میں دوبارہ سو جاتی تھی۔

اُس کب اُٹھنا ہے، کہاں جانا ہے، جانے سے پہلے کیا کھانا ہے اور جب وہ رات کو واپس آئے گی تو اُس کے لیے کچن میں کھانے پینے کو کچھ ہوگا یا نہیں، اس بات کی فکر کسی کو نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود ہی اپنے لیے کچھ نہ کچھ انتظام کر لیتی تھی۔ اُس کے ذہن میں اگلے دن کے لیے اتنی مصروفیات ہوتی تھیں کہ اس کے پاس والدین کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی دل کے کسی کونے میں ایک معصوم سی خواہش سر ابھارتی تھی کہ کاش کبھی پاپا اُس

کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ کر اُسے ایک اچھے دن کے لیے وش ہی کر دیں۔ سوتیلی ماں سے اسے نہ رغبت تھی اور نہ ہی وہ اُس سے کوئی واسطہ رکھتی تھی، اس لیے تصادم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

وہ ایک گھر کے نہیں ایک سرائے یا ہوٹل کے مکین تھے جنہیں ایک دوسرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

☆.....☆

عینی کو اپنی سگی ماں بھی بس تھوڑی بہت یاد تھی۔ حالانکہ وہ اُس وقت آٹھ سال کی تھی جب اُس کی ماں ایک حادثے میں فوت ہو گئی تھی۔

اُسے اپنی سگی اور سوتیلی ماؤں میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی اپنی ماں کے پاس بھی اُس کے لیے کبھی وقت نہیں رہا تھا۔

جب اُسے اپنی ماں کے آخری دیدار کے لیے اُس کے تابوت کے پاس لایا گیا تو عینی نے محسوس کیا تھا کہ آج وہ پہلی بار اپنی ماں کو غور سے دیکھ سکی تھی، ورنہ وہ اتنی مصروف رہتی تھی کہ اسے اچھی طرح دیکھنے کا اُسے موقع ہی نہیں ملتا تھا، ہاں کبھی کبھار اُس کی ماں انتہائی عجلت میں اُسے بوسہ دیا کرتی تھی۔ ماں کے جانے سے پہلے اُس کی ''میڈ'' آجاتی۔ وہ عینی کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھتی اور دن میں کئی بار یوں اُسے سینے سے چمٹا لیا کرتی تھی کہ عینی کی محبت کے لیے پیاسی روح اندر تک سیراب ہو جاتی۔ موٹے موٹے ہونٹوں پر پیار بھری مسکراہٹ سجائے اُسے وہ حبشن آیا اپنی حسین و جمیل ماں سے کہیں زیادہ خوب صورت لگتی تھی کہ کم از کم اُس کے لمس میں پیار کا اظہار تو ہوتا تھا، جب کہ اُس کی ماں کا انداز تو مشینی ہوتا تھا۔

اسکول سے آکر ہوم ورک کرنے کے شوق میں جب عینی کھانا کھانے سے انکار کر دیتی تو وہ اُسے اپنے ہاتھوں سے کھلاتی۔ ''اچھا بابا! تم کام کرو ام تم کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلائے گا۔ اب خوش۔ ہمارا بے بی بھوکا رہے، یہ بات اُم کو بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

میڈ کو نہ اردو ٹھیک سے بولنی آتی تھی اور نہ انگریزی مگر عینی اُس کی محبت کی زبان سمجھ لیتی تھی۔ رات کے نو بجے وہ اُسے بستر پر لٹا کر اور الوداعی پیار دے کر رخصت ہو جاتی تھی اور اُسی لمحے سے عینی کے اندر کا خوف اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیتا۔

ماں باپ کی واپسی رات گئے ہوتی تھی۔ اُس دیواروں پر بھوت ناچتے نظر آتے اور وہ ڈری سہمی اپنے بستر میں دبکی رہتی۔

☆.....☆

اُسے کسی نے نہ نماز سکھائی تھی اور نہ ہی قرآن شریف پڑھایا تھا۔ وہ ایک بہت مشہور امریکن اسکول میں پڑھتی تھی۔ اُسے اسمبلی میں جو دعائیں پڑھوائی جاتی تھیں، وہ انہیں دہراتے دہراتے نیند کی وادی میں اُتر جاتی تھی۔ صبح کو اُس کی میڈ ہی آکر اُسے اُٹھاتی تھی اور روز کا معمول شروع ہو جاتا تھا۔

ممی پاپا کے آپس میں کیسے تعلقات تھے یہ اُسے معلوم ہی نہیں تھا، بس گھر میں ایک پراسرار خاموشی اور سرد مہری کا احساس چھایا رہتا تھا۔

ایک دن اسکول سے واپسی پر اُسے معلوم ہوا کہ ممی اُسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ اُن کے جانے سے اُسے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ پہلے بھی میڈ ہی اُس کے سارے کام کرتی تھی، اب بھی کر رہی تھی۔ پاپا کا گھر میں ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ بس وہ مہینے کی پہلی تاریخ کو گھر کا خرچہ میڈ کے ہاتھ پر اور فیس اور جیب خرچ کی رقم عینی کے ہاتھ پر رکھ دیا کرتے تھے۔

جب اُس نے او لیول میں تمام مضامین میں

اے گریڈ لیے تو اُس نے یہ خبر صرف اپنی میڈ کو سنائی تھی اور میڈ نے یہ بات پاپا کو بتا دی۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے اخبار سے نظریں ہٹا کر اُسے دیکھا تھا اور ''گڈ گرل'' کہہ کر دوبارہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

اُس کی سالگرہ کا دن نہ پاپا کے لیے اہم تھا، نہ اُس کے لیے۔ ہاں اُس کے دوست اسے ٹریٹ دینے پر مجبور کرتے تھے تاکہ اُن کے تحفے جائز ہو سکیں اور ٹریٹ کا خرچ وہ تمام مہینہ بچت کر کے اپنی جیب خرچ سے ہی نکالا کرتی تھی۔

اس نے کبھی ممی پاپا سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ گھر میں اُس کا ہر رشتہ بس میڈ سے منسوب تھا۔

میڈ کے جانے پر وہ تڑپ تڑپ کر روئی تھی، جیسے اُس کی ماں آج مری ہو مگر اسے کو جانا تھا۔ سو وہ چلی گئی۔ اُس دن عینی کو احساس ہوا کہ وہ دنیا میں بالکل تنہا ہے۔

☆.....☆

چند دن بعد پاپا ایک اور عورت کو گھر لے آئے۔ پھر وہ عورت گھر میں رہنے لگی تو عینی کو گھر سے بھی نفرت ہو گئی۔ اب وہ اتنی سمجھدار ہو گئی تھی کہ پاپا اور اُس عورت کے تعلقات کی نوعیت کو سمجھ سکتی۔

زیادہ سے زیادہ باہر وقت گزارنے کے لیے اُس نے شام کے وقت ایک بوتیک میں نوکری کر لی۔ پھر بھی جو وقت بچ جاتا وہ لائبریری میں گزار دیتی کیونکہ گھر پر اُس کا انتظار کرنے والا کون تھا۔

ایک دن لائبریری میں اُس کی نظر اسلامی کتابوں کے سیکشن پر پڑی اور اُس نے ایک کتاب نکال لی۔ مذہب سے اُس کی آگاہی صرف اُس حد تک تھی کہ وہ ایک مسلمان ہے، کیونکہ اسکول و کالج کے رجسٹر میں اُس کا نام مسلمانوں کے خانے میں درج تھا۔ اُسے چند ابتدائی باتوں کا پتا تھا جو اُسے قاری صاحب نے بتائی تھی اور وہ بھی چند دن بعد غائب ہو گئے تھے۔

انہوں نے اُسے بتایا تھا کہ اگر سر پر دوپٹہ نہ اوڑھا تو اُسے جہنم کی آگ میں جلنا پڑے گا اور نماز نہ پڑھی تو اُس پر انگارے برسائے جائیں گے۔ انہوں نے اُس کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کا تصور بہت خوفناک بنا دیا تھا، جس کے مطابق اُن کا کام صرف خوفناک سزائیں دینا تھا۔

پھر ایک دن اُسے معلوم ہوا کہ اُس کی دوسری نئی ماں بھی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

اُس نے اُس کے آنے کی وجہ کب معلوم کی تھی جو جانے کی دریافت کرتی۔ وہ فطرتاً ایک خاموش طبع اور نرم خو لڑکی تھی جو شروع سے زندگی سے سمجھوتے کرتی آئی تھی۔ اب وہ اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل ہو گئی تھی لیکن کسی کو دلچسپی ہی نہیں تھی کہ اُس کے فیصلوں پر اعتراض کرتا یا انہیں سراہتا۔

جیب خرچ لینے سے بھی اُس نے اُس دن انکار کر دیا تھا جب اُسے پہلی تنخواہ ملی تھی اور پاپا نے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اُس نے نوکری کہاں کی تھی۔ البتہ اُس نے بتانا ضروری سمجھا تھا۔ سوتیلی ماں کے چلے جانے کے بعد اتنا ضرور ہوا تھا کہ گھر کی فضا میں سکون کا احساس ہوا تھا۔ اُس نے اُسی دن سے بڑی خاموشی کے ساتھ پاپا کا ناشتہ بنانے کی ذمہ داری لے لی تھی اور خود بھی اُن کے ساتھ بیٹھ جایا کرتی تھی۔ پھر غیر محسوس طریقے سے اُن کے درمیان ہلکی پھلکی بات چیت شروع ہو گئی اور وہ انہیں رخصت کرنے دروازے تک جانے لگی۔

وہ دن اُس کی زندگی کا مسرور ترین دن تھا جب پاپا نے خدا حافظ کے جواب میں اُس کے سر

پر ہولے سے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ عینی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ یہ کیسا لمس تھا کہ وہ سرشار ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پاپا سے لپٹ کر رو دے مگر وہ جا چکے تھے۔

☆.....☆

وہ اتوار کا دن تھا۔ عینی ایک کوکنگ میگزین خرید کر لائی تھی اور اُس نے پاپا سے وعدہ لیا تھا کہ وہ آج ڈنر گھر پر کریں گے۔ وہ پہلی دفعہ کوئی ڈش بنا رہی تھی اور اُس کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے کہ اگر پاپا کو پسند نہ آئی تو؟

پھر شام کو پاپا کہیں سے واپس آئے تو اُن کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے۔ عینی انہیں دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ بالکل پاپا کے ہم شکل تھے۔ ویسے ہی ہینڈسم اور شاندار، لیکن اِن کے چہرے پر خوب صورت سی خشخشی داڑھی انہیں اور زیادہ بردبار بنا رہی تھی۔

''یہ تمہارے تایا ابو ہیں عینی۔'' پاپا نے اُسے بتایا اور وہ سن ہو کر رہ گئی۔

اُس نے کبھی کسی رشتے کا نام ہی نہیں سنا تھا اور نہ ہی دیکھا تھا اور جو واحد رشتہ اُس کے پاس تھا وہ بھی چند دن پہلے ہی اُس کے ذرا نزدیک آیا تھا۔ عینی تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی انہوں نے خود ہی آگے بڑھ کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ وہ آبدیدہ ہو گئے تھے اور عینی نے بڑی مشکل سے دھاڑیں مار مار کے رونے کی خواہش پر قابو پایا تھا۔

وہ بہت دیر تک اُس سے باتیں کرتے رہے اور عینی سوچتی رہ گئی کہ پاکستان میں رہنے والے اتنی اچھی انگریزی بول سکتے ہیں تو امریکہ میں بسنے والے پاکستانی امریکہ آ کر اردو بولنا کیوں بھول جاتے ہیں۔

نہ جانے کھانا کیسا بنا تھا۔ عینی کی تو ہمت ہی نہ ہوئی کہ وہ چکھ کر دیکھ لیتی مگر پاپا نے اور خاص طور سے تایا ابا نے اتنی تعریف کی کہ وہ دنگ رہ گئی۔ پھر جب اُس نے ڈرتے ڈرتے ذرا سا کھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کھانا خاصا بدمزہ تھا۔ اُس نے چپکے سے ٹرے میں کافی کی پیالیوں کے ساتھ چند رولز رکھے اور اِن دونوں کے سامنے رکھ آئی خود اُس نے بھی اسی طرح پیٹ بھرا تھا۔

☆.....☆

تایا جان کے جانے کے چند دن بعد عینی پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، جب پاپا نے اُسے بتایا کہ وہ دونوں تایا جان کے سب سے بڑے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان جا رہے ہیں۔

عینی نے تو کبھی اپنے ددھیال والوں کو دیکھا ہی نہیں تھا، نہ ہی اُن کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ البتہ وہ لوگ اُس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ اُسے پاپا کی پرانی چیزوں میں سے ایک البم ملا تھا۔ اس نے اندازے لگانے کی کوشش تو کی تھی مگر اُس کے اندازے، اندازے ہی تھے۔ ظاہر ہے وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہوں گی۔

عینی کو پاکستان کے بارے میں بھی بس اتنا ہی معلوم تھا جتنا اُس نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ اُسے اِس اجنبی ملک سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی مگر وہ اپنے رشتے داروں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس نے ہمیشہ اتنی تنہا زندگی گزاری تھی کہ اس لیے اپنوں سے ملنے کا تصور ہی بہت دلفریب تھا۔ عینی خود ہی اپنے جذبات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اُسے خوشی بھی تھی اور دل میں عجیب سا خوف بھی کہ نہ جانے وہ لوگ ایک اجنبی اور انجان لڑکی کو کس انداز میں قبول کریں گے۔ کریں گے بھی کہ نہیں لیکن انہیں دیکھنے اور اُن سے ملنے کا

اشتیاق بہت شدید تھا۔

اُس کے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی تھا کہ اُسے اردو بہت کم بولنی آتی تھی لیکن پاپا نے اُسے بتایا تھا کہ اُن کے گھر والے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور انگریزی زبان پاکستان میں رہنے والوں کے لیے کوئی اجنبی زبان نہیں ہے۔

پاپا نے اُسے بتایا تھا کہ وہ پچیس سال بعد پاکستان جارہے تھے۔ یعنی وہ پچیس سالوں سے اپنے گھر والوں سے دور تھے۔

یہ سب سن کر اُس کے ذہن میں بہت سے سوال اُٹھ رہے تھے لیکن اُسے پاپا سے پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ ہاں اُسے پاپا اور تایا جان کی گفتگو کے دوران یہ معلوم ہوگیا تھا کہ دادی جان بہت بیمار تھیں اور تایا جان خاص طور سے پاپا کو بلانے کے لیے اتنی دور کا سفر طے کر کے آئے تھے۔ اُسے پاپا سے گلہ بھی ہوا تھا کہ وہ اتنے سخت دل کیسے ہوگئے تھے کہ پچیس سال تک اپنی ماں کو شکل نہیں دکھائی تھی لیکن وہ پاپا سے اتنی بے تکلف کہاں تھی کہ یہ سب پوچھ سکتی، سالہا سال کی عادتیں چند دن تو میں نہیں بدل جاتیں۔

☆.....☆

جب وہ لاہور کے نئے علامہ اقبال ایئرپورٹ پر اُتری تو اُسے پاکستان امریکہ سے زیادہ مختلف نہ لگا۔ اتنا خوب صورت، جدید اور صاف ستھرا ایئرپورٹ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں زیادہ تر لوگ پاکستانی تھے اور چند لوگ شلوار قمیض میں بھی نظر آرہے تھے۔ ابھی وہ سامان کلیئر کروا کے باہر نکلے ہی تھے کہ دو اسمارٹ اور خوبرو نوجوان تیز تیز قدموں سے اُن کی طرف بڑھے۔

''معاف کیجیے گا۔ آپ سمیع الدولہ صاحب ہیں نا۔'' انگریزی لہجہ بہت شستہ اور خوب صورت تھا۔

''اور تم دونوں یقیناً شہرام اور غفران ہو گے۔'' پاپا نے اردو میں کہا اور اگلے ہی لمحے وہ اِن سے باری باری بغل گیر ہوگئے۔

''اور آپ عینی ہیں۔'' ایک نے اُسے دیکھ کر کہا تھا۔

''ہاں میں عینی ہوں۔ آپ کی کزن۔'' عینی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ دونوں تایا جان کے بیٹے ہوں گے کیونکہ شکل بہت مل رہی تھی۔ اُس کا لہجہ امریکن تھا لیکن اُن دونوں نے اُسے خوب سراہا کہ وہ امریکہ کی پیدائش ہونے کے باوجود اردو بول سکتی ہے۔

''زیادہ تعریف نہ کرو، اس کی اردو بس دو چار جملوں میں ختم ہو جائے گی۔'' پاپا نے ہنستے ہوئے کہا تھا لیکن عینی واقعی اُن دونوں کا منہ دیکھ رہی تھی کہ اگلا جملہ کیا بولے۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اردو اتنی آسان زبان ہے کہ آپ چند دن میں فرفر بولنے لگیں گی۔'' شہرام نے اُس کی خجالت مٹانے کی کوشش کی اور عینی مسکرادی۔

ہوائی اڈے سے حویلی تک کے راستے میں وہ بس باہر ہی دیکھتی رہی۔ اُسے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اُس کے بعض پاکستانی دوست بھی پاکستان کا مذاق یوں اڑاتے تھے کہ اُس کے ذہن میں پاکستان کا تصور کچھ اچھا نہیں تھا لیکن اُسے تو یہ شہر بہت اچھا لگ رہا تھا۔

☆.....☆

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ اس عظیم الشان حویلی کے صدر دروازے پر موجود تھے۔

وردی میں ملبوس دربان نے دوڑ کر گیٹ کھولا اور دونوں کاریں اندر داخل ہوگئیں۔ چاروں طرف سے وسیع سبزہ زاروں سے گھری ہوئی حویلی اُسے

اپنے تصور سے زیادہ حسین لگی۔

ابھی کار ڈرائیوے پر ہی تھی کہ برآمدے میں حویلی کا پرانی طرز کا بڑا سا دروازہ کھلا اور بے شمار لوگ اُن کے استقبال کو باہر نکل آئے۔ لڑکیوں اور عورتوں نے عینی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور سمیع الدولہ مردوں میں گھر گئے۔

عینی عورتوں سے فارغ ہوئی تو اُسے دونوں چاچیوں نے گلے لگا لیا۔ تایا جان آخر میں آگے بڑھے اور عینی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ''سمیع چلو اب سب سے پہلے امی جان سے مل لو۔ وہ تمہیں دیکھنے کے لیے بہت بے قرار ہیں۔'' سمیع اور عینی اُس ہجوم کے جھرمٹ میں امی حضور کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

وہ بیڈ پر دراز تھیں اور اُن کی آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں دروازے پر ہی لگی تھیں۔ سمیع ایک لمحے کے لیے انہیں دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئے۔ کہاں یہ لاغر وجود اور کہاں وہ امی حضور جو اپنے مخصوص لباس غرارے میں کسی ملکہ کی طرح شاندار لگا کرتی تھیں۔

وہ لپک کر آگے بڑھے اور ان کے سامنے دوزانو ہوگئے۔ وہ اُٹھنے کی کوشش میں ہلکان ہونے لگیں تو سمیع نے انہیں اپنی آغوش میں تھام لیا۔

''امی حضور! یہ آپ کو کیا ہوگیا۔'' وہ رونے والے ہو رہے تھے۔

''بیٹا پچیس سال تھوڑے تو نہیں ہوتے۔ شکر ہے پروردگار کا کہ مرنے سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھ لیا۔ ورنہ تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ رو رو کر ہماری آنکھیں اندھی کیوں نہ ہوگئیں۔''

سمیع کے علاوہ اور سب بھی رونے لگے تھے۔ ماحول بہت بوجھل ہوگیا تھا۔ عینی خود ہی آگے بڑھی اور اُن کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

''یہ میری بیٹی ہے امی حضور۔'' سمیع نے عینی کا تعارف کروایا۔

''عینی بیٹا۔'' انہوں نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔ ''تم نہیں جانتیں بیٹا تمہاری بدنصیب دادی نے مرنے سے پہلے تمہیں دیکھنے کے لیے کتنی دعائیں مانگی ہیں۔''

وہ بار بار اُس کی پیشانی چوم رہی تھیں اور عینی سوچ رہی تھی کہ پاپا آپ نے مجھے اتنے پیارے پیارے رشتوں سے محروم رکھا اور میں تمام عمر تنہائی کے عذاب میں مبتلا رہی۔ میں آپ کو کبھی معاف نہ کرتی اگر آپ مجھے پاکستان نہ لے آئے ہوتے۔

☆.....☆

جس راہداری سے گزر کر وہ سب دادا حضور کے کمرے تک پہنچے، اس کے دونوں اطراف میں دیواروں پر دادا حضور کے آباؤ اجداد کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔ فرش پر سرخ قالین بچھا تھا اور مناسب جگہوں پر بڑے بڑے گلدانوں میں پھول سجے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ بڑے بڑے شمع دان بھی رکھے ہوئے تھے۔

''سمیع! بابا حضور ہم سب سے زیادہ تم سے ملنے کو بے تاب ہیں لیکن وہ تم سے بہت ناراض ہیں۔ تمہیں بہت تحمل سے اور پیار سے انہیں منانا ہوگا۔'' تایا جان آہستہ آہستہ سرگوشی کر رہے تھے۔

دادا حضور کے کمرے کے اندر سمیع الدولہ اور عینی کو اکیلے جانا پڑا۔ باقی سب لوگ باہر ہی رک گئے تھے۔ کمرے کے اندر دادا حضور کو دیکھ کر عینی ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گئی۔ وہ اس شاندار کمرے میں اپنے عظیم الشان بیڈ پر نیم دراز تھے اور تسبیح کے دانے تیزی سے گرا رہے تھے۔ انگلیوں میں ہلکا سا ارتعاش اُن کی ذہنی کیفیت کی غمازی کر رہا

تھا۔ سفید براق لباس، سفید داڑھی اور سفید بال، سرخ و سفید رنگ، سوچ میں ڈوبی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں اور چہرے پر جاہ و جلال۔ وہ تو کسی شہنشاہ کی طرح ذی شان اور ذی وقار لگ رہے تھے۔ آہٹ پر انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ سمیع دوڑ کر ان کے قدموں سے لپٹ گئے۔

"بابا حضور! خدا کے واسطے اپنے اِس نالائق بیٹے کو معاف کردیجیے۔ اگر آپ نے میری طرف نہیں دیکھا تو میں دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دے دوں گا۔" بالآخر انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور ان کی نظر سب سے پہلے عینی پر پڑی۔

"سمیع الدولہ! آپ یہ صرف زبان سے کہہ رہے ہیں، ایسا کر نہیں سکتے کیونکہ اگر آپ کو ہم سے اور اپنی والدہ سے اتنا پیار ہوتا تو آپ پچیس سال تک اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو ہم سے دور نہ رکھتے..... خیر۔ یہ سمجھ لیجیے کہ ہم نے اس بچی کے صدقے آپ کو معاف کردیا کیونکہ یہ معصوم بچی بہرحال بے قصور ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے سمیع کی بجائے عینی کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیے۔ عینی دوڑ کر ان کی بانہوں میں سما گئی اور پھر دوسرے ہاتھ سے انہوں نے سمیع الدولہ کو بھی اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

☆.....☆

زرتاج حویلی عینی کے دادا وجیہہ الدولہ کے والد کے وقت سے اس خاندان کی پناہ گاہ چلی آرہی تھی۔ انہوں نے یہ حویلی اپنی بیگم کے لیے بنوائی تھی اور اسے ان کے نام سے منسوب کردیا تھا۔ یہ حویلی ایک بہت وسیع رقبے پر محیط تھی۔ وقت اور ضرورت کے ساتھ اس کی مکانیت میں اضافہ ہوتا گیا لیکن اس کی شان و شوکت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

وجیہہ الدولہ کے ہاں تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ہر بیٹے اور بیٹی کے لیے الگ پورشن مخصوص تھا۔ بیٹیوں کے پورشن نسبتاً مختصر تھے۔ کیونکہ وہ تو چھٹیوں میں یا کسی شادی بیاہ کے موقعوں پر ہی آتی تھیں۔ حویلی کی نسبت یہ پورشن جدید انداز میں بنے ہوئے تھے لیکن حویلی کا حسن اپنی جگہ تھا۔ پچھلی طرف ایک وسیع و عریض صحن تھا اور حویلی کی تینوں اطراف میں کشادہ سبزہ زار تھے، جہاں پھل دار اور پھول دار انواع و اقسام کے پودوں اور پھولوں کی بہتات تھی۔ بلاشبہ اتنے گنجان شہر سے صرف تیس کلومیٹر کے فاصلے پر یہ جنت نما حویلی ایک عجوبہ نظر آتی تھی۔

عینی کے تایا حضور یعنی رفیع الدولہ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی شہرینہ تھی۔ تینوں بیٹے ذی شان، غفران اور شہرام تھے۔ ذی شان باپ کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ شہرام باہر سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر کے آیا تھا اور پاکستان میں جاب کر رہا تھا۔ غفران ابھی میڈیکل کے بعد ہاؤس جاب کر رہا تھا۔

سمیع الدولہ سے چھوٹے بھائی فصیح الدولہ کے ہاں تین بیٹیاں عاصمہ، زہرا اور بتول تھیں۔

دونوں بیٹیوں کی اولادیں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ ان میں سے زیب النساء اور قمر النساء لاہور میں رہتی تھیں کیونکہ ان کے میاں ملک سے باہر کاروبار کرتے تھے لیکن وہ بچوں کی تعلیم کی وجہ سے پاکستان آگئی تھیں۔

شمس الدولہ، نواب شوکت الدولہ یعنی عینی کے دادا حضور کے اکلوتے بھائی کی اکلوتی اولاد تھے اور اسی حویلی میں رہتے تھے۔ اِن کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ انتہائی خوش مزاج، بذلہ سنج اور سب سے چھوٹے چچا ہونے کی حیثیت سے نوجوان نسل کے چچا کم اور دوست زیادہ تھے۔ ان کی بیگم جہاں آراء

ایک سنجیدہ مزاج خاتون تھیں لیکن بچوں پر انتہائی مہربان تھیں اور اپنے میاں کی چونچال طبیعت پر کبھی اعتراض نہیں کرتی تھیں۔

☆.....☆

جس دن عینی اور اُس کے پاپا لاہور پہنچے اس سے اگلے دن مایوں کی رسم تھی۔ اب تک دور پار اور نزدیک کے وہ تمام رشتہ دار جو لاہور سے باہر رہتے تھے پہنچ گئے تھے۔ اُن میں دولہا اور دلہن کے ننھیالی رشتے دار بھی شامل تھے۔ شادیاں زیادہ تر خاندان میں ہی ہوتی تھیں۔

دولہا اور دلہن بھی آپس میں کزنز تھے۔ یعنی دولہا شہرام کا بڑا بھائی اور دلہن فصیح الدولہ کی بیٹی عاصمہ تھی۔

مایوں کی رسم کا پورا اہتمام دولہا کی خالہ نے دولہا کی طرف سے اور بڑی پھوپی مہرالنساء نے دلہن کی طرف سے کیا تھا۔

شام کے پانچ بجے دونوں پیلے پھولوں سے سجے ہوئے ٹوکروں، مٹھائی کے تھال اور ابٹن کے سامان کے ساتھ پہنچ گئی تھیں۔ دلہن اور دلہن کی تمام کزنز اور سہیلیوں کے لیے زرد رنگ کے گوٹہ کناری والے جوڑے بھی بڑے بڑے تھالوں میں سجے ہوئے تھے۔ دولہا اور دلہن کی ماؤں کے لیے زرد ساڑیاں، دولہا اور اس کے والد کے لیے آف وائٹ سلکی شلوار قمیض اور دولہا کے لیے عنابی اور والد کے لیے سیاہ واسکٹ تھی۔ باقی پورے خاندان اور ملازموں کے لیے بھی جوڑوں کا اہتمام تھا۔ دولہا دلہن کے لیے تحائف الگ تھے۔ تایا جان، دونوں چچاؤں اور پھوپھیوں کی طرف سے بھی جوڑوں کا اہتمام تھا۔ ساتھ ہی دولہا دلہن کے لیے تحفے بھی تھے۔ ایک پورے کمرے میں یہ تمام سامان سلیقے

غزل

راتوں کے مسافر ہو اندھیروں میں رہو گے
جگنو کی طرح دن میں جلو گے نہ بجھو گے

سب لوگ یہ کہتے ہیں کہ تم لوٹ گئے ہو
تم ساتھ تھے، تم ساتھ ہو، تم ساتھ رہو گے

کیا اُن کہی غزلوں کی کتابیں ہیں وہ آنکھیں
جب پڑھ نہیں سکتے ہو تو کیا خاک لکھو گے

خوشبو کی حویلی ہے مرے دل کی زمیں پر
وعدہ کرو اک روز مرے ساتھ چلو گے

دلی ہو کہ لاہور، کوئی فرق نہیں ہے
سچ بول کے ہر شہر میں ایسے ہی رہو گے

بشیر بدر

سے سجادیا گیا تھا۔
سمیع کو شاید اپنے خاندان کی یہ رسمیں یاد نہیں رہی تھیں۔ عینی اس بات پر بہت پریشان تھی۔ اس کے یاددلانے پر سمیع نے اپنی بہن کے ذریعے ریڈی میڈ جوڑے منگوائے تو اسے اطمینان ہوا۔ دولہا اور دلہن کو وہ کیش دینا چاہتے تھے۔ عینی باوجود کوشش کے ابھی ٹھیک طرح اردو بولنا نہیں سیکھی تھی لیکن سب کو ہی اس کا امریکن انگریزی زدہ لہجہ بہت اچھا لگتا تھا۔ اس لیے اب اسے اپنے لہجے پر شرمندگی نہیں ہوتی تھی۔

مایوں کی رسم تک بھی لڑکیوں کے شادی کے لیے تمام جوڑے تیار نہیں ہوسکے تھے لیکن اب صرف درزیوں کا کام باقی تھا جو تیزی سے اپنا کام کررہے تھے۔ تمام دن پچھلے برآمدے میں سلائی مشینوں کی کھٹا کھٹ موسیقی کا ساسماں پیدا کردیتی تھی۔

عینی نے اپنے حساب سے تین چار ریڈی میڈ سوٹ خرید لیے تھے، جن میں سے ایک میکسی تھی، ایک اسکرٹ اور بلاؤز اور ایک شلوار قمیض کا سوٹ بھی تھا۔ عام پہننے کے لیے تو اس کے پاس جینز اور ٹی شرٹس ہی تھیں اور انہی کپڑوں میں اسے آرام ملتا تھا کیونکہ اب تک وہ یہی لباس پہنتی آئی تھی لیکن یہاں اسے یہ کپڑے پہننا عجیب سا لگتا تھا اس لیے وہ شلوار قمیض پہننے کی عادت ڈال رہی تھی۔

جب مہندی کے جوڑے تیار ہوکر آئے تو عینی انہیں دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ گو اس کے تمام سوٹ بہت بڑھیا تھے لیکن ان زرق برق لہنگوں کے سامنے تو بالکل پھیکے لگ رہے تھے۔ عینی نے دوبارہ جاکر اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا اور مایوس ہوکر ایک کونے میں رونے بیٹھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ ہر لڑکی نے مہندی کے لیے اپنے جوڑے پر سلمہ ستارے یا گوٹہ کناری کا کام خود کیا ہے۔ اس لیے یہ لہنگے دو تین مہینوں میں تیار ہوئے تھے کیونکہ ہر لڑکی کو پڑھنا بھی ہوتا تھا اور ساتھ ساتھ کچن میں جاکر ایک آدھ ڈش بھی باری باری تیار کرنا ہوتی تھی اور شام کی چائے اور اس پر جو بھی اہتمام ہوتا تھا وہ مکمل طور پر لڑکیوں کی ذمہ داری تھی۔ بھلا اب مہندی میں دن ہی کتنے باقی تھے کہ اس کا مہندی کا جوڑا تیار ہوسکتا۔

فائزہ کسی کام سے کمرے میں آئی تو اسے دھواں دھار روتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گئی۔ پوچھنے پر عینی نے روتے روتے اٹھ کر اپنی میکسی دکھائی اور دوبارہ زور و شور سے رونے بیٹھ گئی۔

خاندان کی تمام لڑکیوں کے ہر مسئلے کا حل تائی جان کے پاس ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر میں تائی جان مسکراتی ہوئی آئیں ان کے پیچھے تمام لڑکیوں کا غول تھا۔ تائی جان نے گہرے فیروزی رنگ کا لہنگا سوٹ عینی کے سامنے پھیلا دیا۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ سب کے لیے جوڑے تیار ہوں اور عینی محروم رہ جائے۔ یہ سرپرائز انہوں نے اسی دن کے لیے رکھا ہوا تھا۔

رنگت تو سب ہی لڑکیوں کی سرخ وسفید تھی لیکن عینی میں اس کی امریکن ماں کا عکس نمایاں تھا۔ گہری نیلی آنکھیں اور سنہرے بال اسے دوسری لڑکیوں سے ممتاز کرتے تھے اور سب ہی لڑکیوں کا خیال تھا کہ فیروزی رنگ بس عینی کے لیے بنایا گیا ہے۔

اب ایک مسئلہ اور تھا۔ عینی کو لہنگا پہن کر چلنا نہیں آرہا تھا۔ علینہ اور شائلہ کے ذمے یہ کام لگایا گیا اور عینی شام تک پریکٹس کرکر کے ہلکان ہوگئی مگر بہرحال لہنگا تو پہننا ہی تھا۔

☆......☆

شام کو مایوں کی رسم تھی۔ حالانکہ دلہن اور دولہا دونوں کا تعلق اسی حویلی سے تھا لیکن خاندان کی ریت کے مطابق رسم الگ الگ ادا ہونی تھی۔ بڑی مشکلوں سے بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد آخرکار سب لڑکیاں اپنے زرد جوڑے پہن کر تیار ہوگئیں۔
رواج کے مطابق پہلے لڑکی کی مایوں کی رسم ادا ہوئی۔ دلہن کے بیٹھنے کے لیے ایک مخصوص نشست کا اہتمام کیا گیا تھا جو پیلے پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ پورے ہال کو بھی پیلے گلاب کے پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جگہ جگہ بڑے بڑے گلدانوں میں پیلے گلاب، چمپا اور گیندے کے پھول مسکرا رہے تھے۔
سب سے پہلے دادی حضور نے دلہن کے ہاتھ پر ابٹن رکھا، مٹھائی کھلائی اور دلہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر بہت سی دعائیں دیں اور صدقے کی رقم چاندی کی تھالی میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئیں لیکن نقاہت کی وجہ سے زیادہ دیر نہ بیٹھ سکیں۔ چند لڑکیاں انہیں سہارا دے کر اُن کے کمرے میں لے گئیں۔

اُس کے بعد سب سے پہلے تائی جان نے اور پھر خاندان کی تمام عورتوں نے ابٹن کی رسم ادا کی۔

جیسے ہی رسم ادا ہوجانے کے بعد دلہن کو اٹھایا گیا تو اچانک کسی نے عینی کو دھکا دے کر دلہن کی جگہ پر بٹھادیا۔ عینی پوری طرح محو ہوکر تمام کارروائی دیکھ رہی تھی کیونکہ یہ اُس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ چونکہ بے خبر تھی لہٰذا دھکا کھاتے ہی دھم سے دلہن کی جگہ بیٹھ گئی اور تمام لڑکیوں نے زوردار تالیاں بجائیں۔ عینی جو پہلے ہی زرد رنگ کے بڑے سے فراک اور بھاری دوپٹے والی پشواز میں عجیب سا محسوس کررہی تھی، بری طرح بوکھلا گئی۔

اُس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر فائزہ نے اسے بتایا کہ ہر کنواری لڑکی کو مایوں کی رسم کے بعد دلہن کی جگہ بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور جو لڑکی قابو آجائے سمجھا جاتا ہے کہ اُس کی شادی جلد ہوجائے گی اور ایسا ہی لڑکے کی مایوں کی رسم ادا کرنے کے بعد کیا جاتا ہے۔

عینی صرف مسکرا کر رہ گئی، لیکن اُس کے حلق تک تلخ حقیقت کی کڑواہٹ اُتر گئی تھی۔ اُس نے سوچا ہوا تھا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔ اس نے اپنے والدین کی شادی شدہ زندگی دیکھی ہوئی تھی، بھلا ایسی شادی کا فائدہ ہی کیا کہ تمام زندگی میاں بیوی ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے رہیں اور پھر علیحدہ ہوکر اپنی اولاد کو تنہائی کا عذاب سہنے کے لیے چھوڑ کر اپنی اپنی راہ لیں۔ امریکہ میں تو اس نے اکثر شادیوں کا یہی انجام دیکھا تھا۔

اس موقع پر عینی کے دل میں نہ کوئی خوشی کا جذبہ بیدار ہوا، نہ ہی کوئی امنگ جاگی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

کچھ ہی دیر بعد ذی شان کو رسم کے لیے لایا گیا۔ دلہن کی طرح اسے بھی پیلے زرتار دوپٹے کے سائے میں کرسی تک لایا گیا۔ اسے خاندان کے لڑکوں نے گھیرا ہوا تھا۔ اس تقریب میں صرف خاندان والے ہی شریک تھے۔

جیسے ہی آخری خاتون رسم ادا کرکے اٹھیں، ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ذی شان نے بہت سا اُبٹن اُس لڑکے کے منہ پر مل دیا تھا، جسے لڑکوں نے دھکا دے کر ذی شان کی جگہ بٹھایا تھا اور وہ لڑکا شہرام تھا۔

شہرام نے اپنا بدلہ کسی اور سے لیا اور یوں ایک قیامت برپا ہوگئی۔ تمام مرد عورتیں اور لڑکے لڑکیاں آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ ہر شخص کی کوشش تھی کہ وہ کسی نہ کسی کے چہرے پر زیادہ سے زیادہ اُبٹن مل دے۔ چیخیں بلند ہورہی تھیں۔ قہقہے لگائے جارہے

تھے اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

عینی کے چہرے پر کسی نے اتنی بری طرح اُبٹن ملا تھا کہ اُسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ غصے میں بلبلا کر آگے بڑھی اور اپنے ہی چہرے سے بہت سا اُبٹن اُتار کر اپنی دسترس میں آنے والے شخص کے منہ پر تھوپ دیا۔ یہ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شہرام تھا، بس وہ ایک منٹ کے لیے ٹھٹکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس پر دوسرا حملہ ہوا تھا اور وہ دوبارہ انتقام کے لیے تیار ہوگئی تھی۔

اسے غصہ تو اس بات کا تھا کہ اس کا اتنا پیارا پشواز سوٹ خراب ہوگیا تھا لیکن لطف بھی بہت آیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے خاندان کی کسی تقریب میں شریک ہوئی تھی اور تمام خاندان والوں نے اسے یوں قبول کرلیا تھا، جیسے وہ ہمیشہ ان کے درمیان رہتی آئی ہو۔ اس کے بعد سمیع الدولہ سے بھی کسی گلے شکوے کی نوبت نہیں آئی تھی اور وہ بھی بھول چکے تھے کہ وہ اتنی طویل مدت بعد خاندان کی خوب صورت رسموں میں شریک ہوئے تھے۔

☆......☆

ساری لڑکیاں سب کام نمٹا کر ڈھولکی سنبھال کر بیٹھ جاتیں اور پھر مغرب تک گانے بجانے کا سلسلہ جاری رہتا۔ عینی کو شادی کے گانے سمجھ میں نہیں آتے تھے وہ بس بیٹھ کر تالیاں بجاتی رہتی تھی۔ ایک دن جویریہ نے اسے گھیر لیا۔

"عینی تمہاری آواز بولنے میں اتنی خوب صورت ہے تو تمہیں گانا بھی ضرور آتا ہوگا۔ آج تم بھی کوئی گیت سناؤ۔"

"مجھے گانا، گانا نہیں آتا اور ویسے بھی میں تو واپس......" ابھی اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ لڑکیاں چلائیں۔

"تم پاکستان سے نہیں جاؤ گی ورنہ ہم بھوک ہڑتال کردیں گے۔" سب لڑکیوں نے ایک آواز میں کہا۔

"لیکن پاپا تو ایک مہینے کے لیے پاکستان آئے ہیں اور اب جانے میں بس بیس دن رہ گئے ہیں۔" عینی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے دوبارہ امریکہ جا کر تنہائی کا دکھ سہنے کا تصور ہی ناگوار لگتا تھا۔

"ہم سب چچا جان سے کہیں گے کہ وہ تمہیں یہیں چھوڑ جائیں اور اپنا کاروبار وائنڈ اپ کرکے واپس آجائیں لیکن تم کہیں نہ جانا۔ تمہیں ہم سب کی قسم۔" اس ہنگامے میں کسی کو بھی خبر نہ ہوسکی کہ شہرام جو کسی کام سے وہاں آیا تھا وہ نہ جانے کب سے کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔

☆......☆

مہندی کا دن بہت خوب صورت تھا۔ پوری حویلی کو پیلے پھولوں اور سرخ گلاب کی کلیوں سے سجایا گیا تھا۔ پوری حویلی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی اور روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ بڑے ہال میں نشست کا انتظام تھا۔ آج اسٹیج کے سامنے پردے کا بھی انتظام تھا۔ جسے گرانے اور اٹھانے کے لیے بابا کی دو بچیوں کو وہاں سرخ لباس میں بٹھا دیا گیا تھا۔ خدا خدا کرکے ان کی تیاری مکمل ہوئی۔ مہمانوں کے آنے کا وقت بھی ہوگیا تھا۔ سب لڑکیاں اپنی اپنی پھولوں کی پتیوں کی ٹوکریاں لے کر صدر دروازے کی طرف لپکیں اور دو رویہ قطاروں میں ترتیب سے کھڑی ہوگئیں۔

آخر کار مہمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ جب مہمانوں نے آکر نشستیں سنبھال لیں تو دلہن کو لاکر اسٹیج پر بٹھا دیا گیا اور مہندی کی رسم شروع ہوئی۔ لڑکیوں نے ڈھولکی سنبھال لی تھی اور دلکش گیتوں کے پس منظر میں مہندی کی رسم ادا کی جارہی تھی۔ آج بھی رسم کا آغاز دادی حضور نے کیا۔ رسم کے بعد پرتکلف کھانا پیش کیا گیا رات گئے گانے بجانے کا پروگرام دوبارہ شروع ہوگیا۔

☆......☆

شادی کے لیے حویلی کے وسیع سبزہ زاروں پر شامیانے لگائے گئے تھے۔ شامیانوں کو سرخ پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ پوری سجاوٹ میں سرخ اور سفید رنگ کا امتزاج تھا۔

آج سب لڑکیوں نے غرارے پہنے ہوئے تھے۔ ہر طرف رنگ و نور کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ بارات کا استقبال روایتی انداز میں ہوا۔ خواتین اور حضرات نے اپنی اپنی صنف کو ہار پہنائے۔

مہمان اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو دولہا اسٹیج کی طرف بڑھا۔ دولہا نے کمخواب کی عنابی شیروانی، سفید آڑے پاجامے کے ساتھ پہنی ہوئی تھی۔ سر پر سنہری کلاہ تھا اور شیروانی سے میچ کرتے ہوئے سلیم شاہی جوتے۔ دولہا کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے سہرا باندھنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ بقول غفران کے سہرا باندھ کر تو اچھا خاصا دولہا جھومتا ہوا ہاتھی لگنے لگتا ہے۔ البتہ گلے میں بیلے کی سفید کلیوں اور سرخ گلاب کی نوخیز غنچوں سے گندھا ہوا ہار ضرور پہنایا گیا تھا۔ دولہا کے دونوں اطراف میں اس کے دونوں بھائی شہرام اور غفران تھے جنہوں نے آف وائٹ شیروانیاں پہنی ہوئی تھیں اور تینوں ہی مغلیہ شہزادے لگ رہے تھے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان نازاں و فرحاں دولہا اسٹیج پر آکر بیٹھ گیا اور دونوں بھائی اسی شاہانہ انداز میں واپس پلٹ گئے۔ مہمانوں کو یہ انداز اتنا بھایا کہ بے اختیار تالیاں بج اٹھیں۔

دولہا کے علاوہ عینی کو اس کے دونوں ہی بھائی بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اس دن اسے بار بار اپنے چہرے پر حدت کا احساس ہورہا تھا اور جب بھی اس نے نگاہ اٹھائی شہرام کو اپنی طرف دیکھتے پایا۔

نکاح کے بعد جب دلہن کو اسٹیج پر لایا گیا تو دولہا اس کے احترام میں کھڑا ہوگیا۔ دلہن کو اس کی دونوں بہنوں نے ایک طرف سے اور دوسری طرف سے بڑی پھوپو کی نئی نویلی بہو اور عینی نے تھاما ہوا تھا۔ جب وہ آف وائٹ غرارہ سوٹ میں ملبوس پرل کا نازک سا سیٹ پہنے سج سج کر قدم اٹھاتی ہوئی سرخ قالین پر دلہن کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھ رہی تھی تو شہرام اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مغربی تہذیب کی پروردہ اس لڑکی نے کتنی جلدی اور خوبی کے ساتھ مشرقی اقدار کو اپنالیا تھا۔

دلہن کو اسی حویلی میں رہنا تھا لیکن رخصتی کے وقت وہ خود بھی روئی اور دوسروں کو بھی رلایا۔ رخصتی کے بعد دولہا کی بہن کے علاوہ تمام لڑکیاں دلہن کے استقبال کی تیاری کے لیے دولہا والے پورشن کی طرف چلی گئی تھیں۔

جیسے ہی دلہن کار سے اتری اور دولہا کے پہلو میں خراماں خراماں چلنے لگی تو لڑکیوں نے دونوں اطراف سے اس پر پھولوں کی بارش کردی۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ایک موٹا سا کالا بکرا دلہن کے قریب لایا گیا۔ دلہن نے ڈرتے ڈرتے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے فوراً ہی صدقہ دینے کے لیے قصاب کے حوالے کردیا گیا۔ دلہن کو ہال میں لے جایا گیا جو روایتی انداز میں پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ آرسی مصحف کی رسم ہوئی اور جب دلہن کو اس کے کمرے تک لے جایا جانے لگا تو ایک بار پھر ہنگامہ شروع ہوگیا۔

دلہن کے اندر جانے کے بعد لڑکیوں نے دروازے کے آگے دوپٹوں کی رسی کے ذریعے دولہا کے لیے اندر آنے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ آخرکار دولہا کو ایک بار پھر اپنی جیب خالی کرنا پڑی۔ آخر خدا خدا کر کے دولہا کو اندر جانے کی اجازت ملی اور شادی کی تقریب کا اختتام ہوا۔

☆......☆

ولیمے کی تقریب زیادہ شاندار اور زیادہ پروقار لیکن نسبتاً سادہ تھی کیونکہ اب کوئی رسم باقی نہیں رہی تھی۔ سب لڑکے لڑکیاں سکون سے بیٹھے تھے اور مووی بنانے والوں کو کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔ آج آرائش میں سفید اور نیلے رنگ کا امتزاج تھا۔

لڑکیاں آج ساڑیوں میں ملبوس تھیں اور اسی لیے سکون سے بیٹھی تھیں کہ ساڑیوں میں چلنا پھرنا مشکل لگ رہا تھا۔ آج مہمانوں کو استقبال کے وقت سفید گلاب کے ہار پیش کیے گئے تھے۔

☆......☆

چوتھی کی رسم کے بعد تقریباً باہر سے آئے ہوئے سب مہمان رخصت ہو گئے۔ دولہا دلہن بھی ہنی مون کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

سب لڑکیاں کالج اسکول جانے لگی تھیں۔ عینی کو شروع شروع میں گھر میں خالی پن کا احساس ہوا لیکن اب وہ خاندان کی خواتین سے بھی خاصی بے تکلیف ہو گئی تھی اور اب تو وہ اردو بھی اچھی خاصی بول لیتی تھی لیکن وہ سب گھر کے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ عینی یا تو تھوڑا بہت ان کا ہاتھ بٹا دیتی یا پھر دادا حضور اور دادی حضور کی خدمت میں لگی رہتی۔

☆......☆

ذی شان کی شادی رجب کی ابتدائی تاریخوں میں ہوئی تھی۔ جب دولہا دلہن ہنی مون سے واپس آئے تو حویلی میں پھر ہنگامے جاگ اٹھے۔ دعو... کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

اسی دوران شب معراج کی آمد ہو گئی۔ ت... حویلی کی ایک بار پھر تفصیلی صفائی ہوئی اور ستا... رجب کو پوری حویلی کو ایک بار پھر سفید پھولوں س... دیا گیا۔ رات کو چراغاں کا بھی اہتمام تھا۔ پچھلے... میں دیگیں تیار ہو رہی تھیں اور پکوان بنائے جار... تھے۔ پوری رات عبادت اور رت جگے کا پروگر... تھا۔ ساری رات کے لیے چائے، کافی اور مختلف... کے ٹھنڈے مشروبات کا انتظام تھا اور ساتھ سا... انواع و اقسام کے پکوان بھی بڑے ہال میں ایک... کونے میں بڑی میز پر چن دیے گئے تھے۔ ہال م... اجتماعی عبادت کا انتظام تھا۔ بیچ میں ایک پردہ تان... گیا تھا تاکہ مرد اور عورتیں الگ الگ عبادت... سکیں۔ سب عورتوں اور لڑکیوں نے بڑے بڑ... دوپٹوں والے سفید لباس پہن لیے تھے۔

عینی نے یہ سب کچھ بھی اپنی زندگی میں پہلی... دیکھا تھا اور اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کیسے لوگ تھے جو ہر پل خوشیوں کی تلاش میں ر... تھے اور خوشی کا ایک ایک لمحہ یادگار بنا لیتے تھے۔ ... سب کو روزہ بھی رکھنا تھا اس لیے سحری کا اہتمام... کیا گیا تھا۔

عینی نے زندگی میں پہلی بار روزہ رکھا تھا۔ شا... تک تو اس کی نقاہت سے حالت خراب ہو گئی لیک... اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

شب معراج کے بعد شب برأت آئی اور... رمضان کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ سبزیوں کو دھو... اور کاٹ کر فریز کیا جا رہا تھا۔ طرح طرح کی چٹنیا... بنا کر بوتلوں میں بھری جا رہی تھیں۔ مشروب... ہو رہے تھے۔ ڈھیر سارے کباب، کوفتے، رو...

ہوئے بنا کر فریزر میں رکھے جا رہے تھے۔
بھی نکیاں اور نمک پارے بنا بنا کر جار بھرے
رہے تھے۔
ینی یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتی تھی۔
کے گھر میں تو رمضان آ کر خاموشی سے گزر جاتا
سی کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے معمول میں
فرق نہیں آتا تھا۔ وہی بے کیف دن اور بے
راتیں اور یہاں تو شادی سے بھی زیادہ
مصروفیت تھی۔
سے تو کبھی عید تک کے لیے کپڑوں کی تیاری کا
خیال نہیں آیا تھا اور یہاں تو رمضان کی پہلی تاریخ
سے ہی عید کے جوڑوں کی سلائی شروع ہوگئی تھی۔
یک بار پھر اندر برآمدے میں درزی آ کر بیٹھ گئے
تھے اور دھڑا دھڑ کام میں مصروف تھے۔
سب لڑکیوں کے لیے دادی حضور نے تین تین
جوڑے بنوائے تھے البتہ لڑکوں کو پیسے دے دیے گئے
تھے کہ اپنی مرضی سے خریداری کرلیں۔
دادی حضور نے عینی کے لیے خاص طور سے عید
کے دن پہننے کے لیے سرخ رنگ کا کامدار کرتا، آڑا
پاجامہ اور بڑا سا کامدانی سے بھرا ہوا شیفون کا دوپٹہ
بنوایا تھا اور عینی کو بے چینی ہو رہی تھی کہ کب عید آئے
اور وہ یہ خوب صورت جوڑا پہنے۔ اپنے گھر میں تو وہ
سارا دن سو کر گزارا کرتی تھی کیونکہ وہ چھٹی کا دن ہوتا
تھا اور شام کو کوئی بھی جینز اور ٹی شرٹ پہن کر اپنے
دوستوں کے ساتھ کسی کلب یا ریسٹورنٹ میں ہلہ گلہ مچا
رہی تھی اور رات کا کھانا باہر ہی کھا کر رات گئے
گھر واپس آجاتی تھی۔

☆......☆

انتیس شعبان کو تقریباً پورا خاندان حویلی کی
چھت پر جمع تھا اور ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ اسے
رمضان کا چاند سب سے پہلے نظر آجائے۔ آخر شمائلہ
کو سب سے پہلے چاند نظر آیا اس نے ایک زبردست
چیخ کے ساتھ چاند نظر آنے کا اعلان کیا اور سب
خواتین اور لڑکیاں سروں پر دوپٹے اوڑھ کر دعا مانگنے
میں مصروف ہوگئیں۔ عینی نے بھی دیکھا دیکھی اپنا چنا
ہوا دوپٹہ سر پر ڈال لیا اور دونوں ہاتھ دعا کے لیے
پھیلا دیے لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ کیا دعا مانگے۔ اس
کی دعائیں پہلے کون سی قبول ہوئی تھیں کہ وہ مزید دعا
مانگ کر شرمندہ ہوتی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے
دعا مانگی ہی کب تھی۔ وہ تو بس کوشش کیا کرتی تھی۔
دعا مانگنا تو اسے آتا ہی نہ تھا، نہ اسے دعا پر یقین تھا۔
وہ چاند پر نظریں جمائے یہی سوچ رہی تھی کہ
اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔ ”دعا بھی تو مانگیے۔
آپ نے تو بس ہاتھ پھیلا رکھے ہیں کب تک اللہ
میاں کو انتظار کروائیں گی کہ آپ کچھ مانگیں اور وہ
عطا کرے۔“ عینی چونک کر مڑی۔ شہرام اول تو گھر
میں نظر ہی بہت کم آتا تھا اور عینی سے تو اب تک اس
نے بہت کم بات کی تھی۔
وہ بری طرح بوکھلا گئی۔ اس نے ہڑبڑا کر سر پر
دوپٹہ ٹھیک کیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کیا دعا مانگے
وہ سوچ رہی تھی اسی لمحے اس کی نظر چاند پر پڑی۔
چاند کے پاس شہرام کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے گھبرا
کر پھر آنکھیں بند کرلیں لیکن شہرام کا چہرہ اب بھی
نظروں کے سامنے تھا۔ اس نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا
کہ کہیں اس کی چوری پکڑی نہ گئی ہو لیکن شہرام جا چکا
تھا۔
مغرب کی نماز کے بعد سب نے سورۂ فتح
کی تلاوت کی اور بے چینی سے سحری کا انتظار
کرنے لگیں۔
نماز تو حویلی میں سب ہی پانچوں وقت پڑھتے

تھے لیکن رمضان میں خاص طور سے مغرب، عشاء اور فجر کا اہتمام ہال میں باجماعت کیا جاتا تھا۔

سحری کے وقت بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ دادی حضور کا حکم تھا کہ سحری اور افطاری پورا خاندان مل کر کیا کرے۔ ہال میں ایک طویل دسترخوان پر سب لوگ جمع تھے۔ کھانا سادہ لیکن بے حد لذیذ تھا۔ عینی کو دودھ جلیبیاں کھانا بہت مشکل لگا لیکن دادی حضور کی نظریں اس پر خاص طور سے جمی ہوئی تھیں لہٰذا اسے کھانا پڑیں۔ کھانے سے پہلے سب نے تہجد کی نماز بھی پڑھی تھی۔

مرد حضرات تو نمازِ فجر کے لیے مسجد روانہ ہو گئے۔ عورتوں نے ہال میں نماز ادا کی، قرآن شریف کی تلاوت کی اور پھر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ افطاری کے وقت پھر ایک ہنگامہ بپا تھا۔ ملازمین کا باورچی خانے میں صرف اتنا کام تھا کہ وہ سبزیاں کاٹ دیں یا مسالہ پیس دیں۔ باقی افطاری اور رات کے کھانے کا اہتمام بہوؤں اور لڑکیوں کے ذمے تھا۔ خواتین انہیں صرف ہدایات دیا کرتی تھیں۔ سب لڑکیاں شور مچاتی اور تیز تیز باتیں کرتی کام میں مصروف تھیں۔ عینی کو صرف چائے بنانا آتی تھی۔ اس لیے اس نے یہ کام سنبھال لیا تھا۔

اس مصروفیت اور شور شرابے میں روزے اتنی تیزی سے گزرے کہ پتا ہی نہ چلا۔ اب لڑکیوں کو اپنے کپڑوں کی تیاری کی فکر ستانے لگی تھی۔ ابھی بھی کوئی نہ کوئی کام باقی تھا۔ کسی کے دوپٹے پر بیل نہیں لگی تھی، تو کسی کے آنچل پر ستاروں کا کام ادھورا تھا۔ غرض یہ کہ جوں جوں عید نزدیک آرہی تھی لڑکیوں کی بوکھلاہٹیں بڑھتی جارہی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ خواتین کی ڈانٹ ڈپٹ بھی جاری تھی۔ عینی کا جوڑا تیار ہو چکا تھا لیکن ایک مسئلہ اب بھی باقی تھا۔ یعنی میچنگ سینڈل اور جیولری اور پھر سب نے ایک دار نعرہ لگایا۔ ''چوڑیاں!'' وہ تو اب تک کسی کو نہیں تھیں۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح سارے کام ہو گئے اور چوڑیوں کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ رات کو خریدی جائیں۔ بھلا جب تک چاند رات بازار جا کر بازار کی رونق نہ دیکھی جائے عید کا کیا آئے گا۔ لڑکیوں نے پیشگی شور مچایا کہ چاند رات کے رش میں لڑکیوں کا بازار جانا انتہائی احمقانہ خیال ہے لیکن عینی کو بھی تو چاند رات کی گہما گہمی دکھانی تھی۔

☆.....☆

آخر چاند رات کی آمد متوقع ہوئی۔ ایک بار پورا خاندان حویلی کی چھت پر جمع ہوا لیکن چاند نہیں آیا۔ اگلی شام پھر چھت پر وہی شور شرابا تھا۔ ذی شان بھی اپنی دلہن کے ساتھ موجود تھا۔ باوجود اس یقین کے کہ آج تو چاند نظر آ ہی جائے گا سب کی نظریں بے قراری کے ساتھ چاند کو کھوج رہی تھیں اور ڈر تھا کہ مغرب سے اٹھنے والی گھٹا کہیں چاند چھپا نہ دے۔ ذی شان نے اپنی دلہن کے کان میں سرگوشی کی۔

''بھئی میں تو نیچے جارہا ہوں۔ کیونکہ مجھے چاند کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اب چاند تلاش کرنے کی باری شہرام بھیا کی ہے۔ عاصمہ نے شوہر کی نظروں کی تاب نہ لا کر بات بدلنی چاہی۔''

''ہاں بھئی شہرام، کیا ارادہ ہے۔'' چچا جس بچوں کے چچا کم اور دوست زیادہ تھے، شہرام کی طرف مڑے۔ شہرام نے دور کھڑی عینی کو ایک نظر دیکھا اور مسکرا دیا۔

''پہلے چاند کی مرضی معلوم کرلوں، پھر بتاؤں گا۔'' اب نوجوان پارٹی نے یہ سن کر ''ہُرّے'' کا زوردار نعرہ لگایا اور شہرام کو گھیرنے والے تھے کہ وہ ان کے نرغے سے نکل کر غائب ہو گیا۔

نماز کے بعد ایک بار پھر سورۂ فتح کی تلاوت کی گئی۔ سب نے قرآن شریف تو شبِ قدر تک ختم کرلیا تھا اور شبِ قدر کا اہتمام بھی شبِ معراج اور شبِ برأت کی طرح کیا گیا تھا۔ اس کے بعد تائی حضور نے مختلف کام، مختلف لڑکیوں کے ذمے لگائے۔ جب سے دادی حضور بیمار ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنی جانشینی تائی حضور کے سپرد کردی تھی اور کسی کو اس پر اعتراض بھی نہیں ہوا تھا۔

اگر کسی کو اندرونِ خانہ یہ بات پسند بھی نہیں تھی تو اس کا اظہار کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ پورے خاندان میں بہت زیادہ اتفاق تھا۔ اب شیر خورمہ تائی حضور خود تیار کیا کرتی تھیں اور یہ بھی ایک روایت تھی کہ شیر خورمہ کے لیے میوہ چاند رات کو ہی کاٹا جاتا تھا۔ شیر خورمہ بنتا بھی خاصی بڑی مقدار میں تھا۔ ایک تو خاندان خاصا بڑا تھا پھر یہ بھی رواج تھا کہ شیر خورمہ آس پاس کے گھروں میں بانٹا جائے۔ وہ لوگ اس لذیذ شیرینی کے لیے پورا سال انتظار کرتے تھے۔

بڑی چچی، چھوٹی چچی اور کچھ خادمائیں میوہ کاٹ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ چائے پی جارہی تھی۔ لڑکیوں کو ہدایت تھی کہ وہ مہندی لگانے کے وقت سے پہلے پہلے اپنے حصے کے کام نمٹا لیں ورنہ مہندی لگانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ صبح کے لیے شیر خورمہ، دہی بڑے، چنوں کی چاٹ، کباب اور شاہی جامن تیار ہونی تھیں۔

عید کے دن دوپہر کو بڑا کھانا ہوتا تھا۔ سب رشتے دار اور دوست احباب اس کھانے میں شریک

غزل

محوِ سفر ہے خاموشی فریاد کی طرف
میں جارہا ہوں عشق کی بنیاد کی طرف

آیا تیرا خیال تو زنجیر پاؤں کی
اُڑ کر گئی ہے لمحہء آزاد کی طرف

مجھ میں تری لگائی ہوئی آگ بجھ گئی
لیکن دھواں گیا مرے ہمزاد کی طرف

اِس آئینے میں قید ہیں میری توقعات
پتھر نہ پھینکیے مری ایجاد کی طرف

خودداریوں پہ اپنی مجھے تپش آگیا
جب انگلیاں اٹھیں مری اولاد کی طرف

سوز و گداز ہی نہیں آواز میں مری
کیا دھیان دے کوئی مری فریاد کی طرف

محسن قرار واقعی درکار تھا ہمیں
دل خود بخود ہی آگیا اُفتاد کی طرف

محسن اسرار

ہوتے تھے اور یہ کھانا باورچی تیار کرتے تھے تاکہ لڑکیوں کو کم از کم عید کے دن کام نہ کرنا پڑے اور وہ بجی سنوری پھرتی رہیں۔

☆......☆

چاند رات کو کھانے کے بعد شہرام، غفران، علی اور عادل کے ذمہ لڑکیوں کو بازار لے جانے کا کام سونپا گیا۔ لڑکیاں اودھم مچاتی گاڑیوں میں سوار ہو گئیں۔ لڑکے پیچ و تاب کھا رہے تھے لیکن دادی حضور کا حکم تھا، کیسے ٹالا جا سکتا تھا۔

تمام دکانیں سجی ہوئی تھیں، سڑک پر اتنا رش تھا کہ لبرٹی پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ بازار کی سج دھج اور رونق قابلِ دید تھی۔ دوکانوں کے علاوہ جگہ جگہ چوڑیوں اور مہندی کے اسٹال بھی لگے ہوئے تھے، جن میں رنگ برنگی جگمگاتی ہوئی چوڑیاں آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھیں اور ان پر لڑکیوں اور عورتوں کا بے پناہ رش تھا۔ اتنی ساری چادر پوش لڑکیوں کو دیکھ کر لوگ خود ہی ذرا پیچھے ہٹ گئے تھے۔

سب لڑکیاں اس مخصوص دکان کی طرف بڑھیں جہاں سے وہ چوڑیاں خریدا کرتی تھیں اور دکان پر ہلہ بول دیا۔ دکاندار بے چارے گھبرا کر ایک طرف ہو گئے اور دکان لڑکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دی۔

سب لڑکیاں پریشان تھیں۔ کسی کو چوڑیاں پسند نہیں آ رہی تھیں، کسی کو صحیح ناپ نہیں مل رہا تھا اور کسی کے کپڑوں کے رنگ کی چوڑیاں دکان پر نہیں تھیں۔ عینی خاموشی سے ایک طرف کھڑی چوڑیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے سرخ کرتے پر بڑی خوب صورت سبز رنگ کی ستاروں کی بیل لگی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سرخ چوڑیاں خریدے یا سبز۔

''اگر آپ اتنے سکون سے کھڑی رہیں تو ساری رات گزر جائے گی اور آپ کو چوڑیاں خریدنے کا موقع نہیں ملے گا۔'' غفران اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ اب یہ بھی تو مصیبت تھی کہ لڑکیوں کو بازار پہنچا کر ان کی ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ گارڈز کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہو اور ان کی حماقتیں بھی برداشت کرو۔

غفران اور علی سخت بور ہو رہے تھے آخر انہیں بھی تو اپنے دوستوں کے ساتھ چاند رات منانی تھی۔ عینی نے پلٹ کر غفران کی طرف دیکھا اس کے ساتھ ہی شہرام کھڑا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر عینی گھبرا جاتی تھی۔ شاید اس کی متانت اور سنجیدگی کی وجہ سے۔

''اگر آپ کہیں تو میں انتخاب میں آپ کی مدد کروں۔'' عینی نے چونک کر شہرام کی طرف دیکھا۔

''آپ کو بھلا چوڑیوں کے بارے میں کیا علم؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''چلیے آج آپ میرے کہنے سے چوڑیاں خرید لیں تاکہ کوئی کام تو نمٹ جائے۔''

'اچھا تو حضرت کو میری چوڑیوں سے دلچسپی نہیں ہے بلکہ جلد کام نمٹانے کی فکر ہے۔ میں بھی کیسی پاگل ہوں۔ اتنی جلدی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔' اس نے مایوسی سے سوچا۔ وہ نہ جانے کیوں آج کل خواب دیکھنے لگی تھی، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ شہرام نے، سرخ اور سبز چوڑیوں کے دو سیٹ دکانداروں سے نکلوائے اور پیک کروا دیے اور عینی سوچتی ہی رہ گئی کہ شہرام کو کیسے پتا چلا کہ وہ سرخ اور سبز رنگ کی چوڑیوں کی الجھن میں پھنسی ہوئی تھی۔

خدا خدا کر کے چوڑیوں کا مرحلہ طے ہوا تو لڑکیوں کو گول گپے کھانے کی دھن سوار ہو گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق لڑکوں نے لڑکیوں کو کاروں میں سوار کرایا اور خود بھناتے ہوئے، گول گپوں کی دکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب گول گپے پیک ہو کر آئے تو مجبوراً لڑکیوں نے زیادہ احتجاج نہیں کیا کیونکہ کاروں میں بیٹھ کر گول گپے کھانے کی گنجائش ہی کہاں تھی، چوڑیوں کے ڈبوں کی وجہ سے کاروں میں جگہ اور بھی کم ہو گئی تھی۔

بارہ بجے گھر آ کر گول گپے کھائے گئے اور لڑکیوں کے بے حد شور مچانے کے باوجود لڑکے بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس کے بعد آخر کار مہندی لگانے اور لگوانے کا سلسلہ شروع ہوا۔

☆......☆

فجر کی نماز سے فارغ ہو کر تمام لڑکیوں نے بڑے ہال میں ایک بڑی سی میز پر کھانے کے تمام لوازمات سجا دیے۔ مرد حضرات نماز کے لیے تیار ہوئے تو دادی حضور نے اپنے بیٹوں اور ان کی اولادوں کی بلائیں لیں۔ صدقہ اتارا اور پھر سب کو عطر لگایا۔ مرد نماز کے لیے روانہ ہوئے تو لڑکیاں تیار ہونے کے لیے کمروں میں گھس گئیں۔ یہ بھی روایت تھی کہ خواتین اور لڑکیاں، مردوں کی نماز سے واپس آنے تک تیار ہو جائیں۔ تب ہی عیدی ملتی تھی۔

مرد حضرات نماز کے بعد بڑے ہال میں جمع تھے۔ بنی سنوری لڑکیاں ہال میں پہنچیں اور سلام کے بعد عیدی کا مطالبہ شروع کیا۔ بڑوں نے تو آرام سے دعائیں اور عیدی ایک ساتھ دے دیں لیکن بھائی عیدی دیتے وقت بہنوں سے نہ لڑیں تو عید کا کیا مزہ۔ ایک بار پھر تکرار اور شور و غل کا آغاز ہوا۔ جب غفران نے پانچ روپے کا چمکتا ہوا سکہ عینی کے ہاتھ پر رکھا تو وہ طیش میں آ گئی۔ غفران یوں بھی عمر میں اس سے صرف ڈیڑھ سال بڑا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھے اس کی جیب پر حملہ کر دیا اور پرس نکال کر بڑی فیاضی سے تمام بہنوں میں عیدی بانٹنے لگی۔

''عینی بہنا! پیٹرول کے لیے پیسے چھوڑ دینا تاکہ چھٹیوں کے بعد آفس جا سکوں۔'' غفران نے مسکین سی شکل بنا کر کہا تو سب اس کی بے بسی پر ہنسنے لگے۔

''عینی آپ مجھ سے عیدی میں کیا لیں گی۔'' شہرام نے اپنے مخصوص سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔'' عینی نے آہستہ سے کہا۔

''کیوں عیدی لینا تو کزنز اور بہنوں کا حق ہوتا ہے اور آپ یہ حق ابھی ابھی بہت اچھی طرح وصول کر چکی ہیں۔ پھر مجھ پر یہ عنایت کیوں؟'' شہرام کو ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ عینی اس کے سوا دوسرے تمام کزنز سے بے تکلف ہے۔

''رات آپ نے چوڑیاں لے تو دی تھیں۔''

رات کو شہرام نے چوڑیوں کے پیسے خود ہ ادا کر دیے تھے۔ حالانکہ دادی حضور نے سب لڑکیوں کو الگ الگ پیسے دیے تھے۔ عینی نے احتجاج کرنا چاہا تھا مگر شہرام لڑکیوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ شہرام کچھ کہتا عینی وہاں سے ہٹ گئی۔ شہرام اسے دور سے دیکھتا رہ گیا۔ وہ سرخ رنگ کے کپڑوں میں واقعی بہت پیاری لگ رہی تھی۔

عید کی دوپہر تو بڑے کھانے کے اہتمام میں گزر گئی۔ تین بجے کے قریب ساری لڑکیاں عینی کے کمرے میں جمع ہو گئیں اور پروگرام بنایا کہ تھوڑی دیر سو لیا جائے۔

''نہیں بھئی۔'' عینی گھبرا کر بولی۔ ''میں نے اس عید سے پہلے تمام عیدیں سو کر گزاری ہیں۔ اس

لیے اس عید پر میں ہرگز نہیں سوؤں گی۔"

"پھر کیا کریں؟" سب کا اجتماعی سوال تھا۔

"آئیڈیا!" زہرہ نے چٹکی بجا کر کہا۔

"ابھی ابھی مالن بیلے کی بہت ساری کلیاں برآمدے میں رکھ کر گئی ہے۔ ہم سب مل کر ان کے گجرے بناتے ہیں اور انہیں شام کو سب خواتین کو پیش کریں گے۔ کیونکہ ہم بے چاری لڑکیوں کو تو پھول پہننے کی اجازت نہیں ہے۔" زہرہ نے جھوٹ موٹ افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ حالانکہ کہنیوں تک چوڑیوں سے بھرے ہاتھوں میں گجرے پہننے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ سب لڑکیوں کو یہ خیال پسند آیا اور سب ہی اس خوب صورت کام میں مصروف ہوگئیں۔

☆.....☆

عید سے اگلے دن بھی سب لڑکیاں دادی حضور کی ہدایت کے مطابق صبح صبح تیار ہوگئیں۔ عاصمہ کو تو تینوں ہی دن دلہن کی طرح سجنا پڑا تھا۔ تمام دن مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔

تیسرے دن سب لوگ صبح صبح ہی پکنک منانے دادا حضور کے دوست کے فارم ہاؤس روانہ ہوگئے۔

وہ دن عینی کی زندگی کا یادگار دن تھا۔ جب شہرام نے بڑے سادہ انداز میں شادی کے بارے میں اس کی رائے معلوم کی تھی۔

"لیکن شہرام! یہ ٹھیک ہے کہ میں یہاں آکر بہت بدل گئی ہوں لیکن ماضی میں میری مصروفیات ایسی رہی ہیں جنہیں آپ کے ہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔" عینی نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

"میں جانتا ہوں عینی، میں بھی چار سال انگلینڈ میں رہا ہوں لیکن مجھے آپ کے ماضی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اپنی اسی صاف گوئی کے ساتھ یہ بھی بتا دیجیے کہ آپ کو اپنا مستقبل مجھ سے وابستہ کرنا پسند ہے یا نہیں؟"

"ہاں! اگر آپ کو پسند ہے تو۔"

"یار بھیا.....!" اچانک پیچھے سے غفران کی آواز آئی تو دونوں ہی چونک پڑے۔

"اب باقی ایجاب و قبول نکاح کے وقت کر لیجیے گا۔ مجھے ایک بات کہنے دیجیے کہ میں نے تو انہیں ایئرپورٹ پر دیکھتے ہی اپنی بھابی کے طور پر پسند کر لیا تھا اور اگر آپ آج بھی اقرار نہ کرتے تو میں دادا حضور سے کہہ کر آپ دونوں کا زبردستی نکاح پڑھوا دیتا۔" شہرام نے گھور کر غفران کو دیکھا تو غفران نے گھبرا کر اپنے کان پکڑ لیے اور عینی بے ساختہ ہنس پڑی۔

☆.....☆

عینی اکثر حیران ہوا کرتی تھی کہ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ اسے اپنی ممی اور پاپا کے تعلقات یاد تھے اور انہوں نے اس کی سوتیلی ماں کے ساتھ جیسے وقت گزارا تھا۔ وہ اس کے سامنے تھا اس نے کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس ماحول میں آکر اسے شادی سے نفرت نہیں رہی تھی۔ بلکہ اسے احساس ہوا تھا کہ اصل زندگی تو شادی کے بعد شروع ہوتی ہے عالیہ آپا، رافیعہ بھابی، شمع اور عاصمہ شادی کے بعد ایک بھرپور زندگی گزار رہی تھیں۔ ان میں سے کسی کو اجازت نہیں تھی کہ سسرال کا رونا میکے آکر روئیں۔ دادی حضور کا حکم تھا کہ وہ سب تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیں۔ انہیں اپنے ازدواجی مسائل خود حل کرنے چاہئیں۔ ان کے خاندان میں طلاق یا علیحدگی کا کوئی تصور نہیں تھا۔

سمیع الدولہ کی اب ویزا کی بڑھوائی ہوئی مدت بھی ختم ہو چکی تھی لیکن دادا حضور کے کہنے پر وہ عینی کو ساتھ نہیں لے جا رہے تھے۔ ان کے جانے سے چند دن پہلے تایا حضور یعنی رفیع الدولہ نے ذکر کیا تھا کہ دادا حضور شہرام سے عینی کی نسبت طے کرنا چاہتے ہیں اور وہ اپنی مرضی بتا دیں اور انہوں نے یہ کہہ کر انہیں پریشان کر دیا تھا کہ انہیں سوچنے کے لیے مہلت چاہیے اور وہ امریکہ سے آکر اس سلسلے میں بات کریں گے اور رفیع الدولہ سوچ رہے تھے کہ ان میں ابھی تک بغاوت کی خو بو باقی ہے ورنہ انہیں شہرام میں کیا کمی نظر آئی تھی کہ انہیں فیصلہ کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔

☆.....☆

رفیع الدولہ کے ہاتھ میں سمیع الدولہ کا خط کانپ رہا تھا۔ انہوں نے کئی بار یہ خط پڑھا تھا لیکن سمجھنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے لکھا تھا:

"یہ ایک بہت طویل کہانی ہے۔

بھائی صاحب یہ کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب مجھے پاکستان آنے والی ایک امریکن سیاح لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے ایک شرط پر شادی پر راضی ہوئی تھی کہ میں ہمیشہ کے لیے امریکہ اس کے ساتھ چلا جاؤں۔ میں دیوانہ وار پورے خاندان سے بغاوت کر کے امریکہ چلا گیا۔ اس لڑکی نے مجھے شادی کے بہلاوے دے کر اچھی طرح لوٹا اور پھر قطع تعلق کر لیا۔ میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ میں پاکستان واپس آ سکتا۔ میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی لیکن ہر جگہ گرین کارڈ آڑے آ جاتا تھا۔ مجھے امریکہ کی رنگینیوں نے اپنے اندر الجھا دیا تھا اور وہاں زیادہ دیر قیام کے لیے گرین کارڈ کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کسی امریکن لڑکی سے شادی کر لوں لیکن امریکن لڑکیاں بھلا کسی بے روزگار کو گھاس کیوں ڈالتیں۔

امریکہ میں اپنے چند ایک پاکستانی دوستوں کی وساطت سے میری مارتھا سے پیپر میرج ہو گئی۔ پھر میں نے کسی نہ کسی طرح اسے وہ رقم بھی ادا کر دی جو پیپر میرج کے بدلے مارتھا نے طلب کی تھی۔ مجھے پیپر میرج کرنے کے بعد سب کچھ مل گیا لیکن ذہنی سکون نہ مل سکا۔

مارتھا بہت حسین عورت تھی لیکن وہ اخلاقی طور پر اچھی عورت نہیں تھی۔ وہ کسی صورت اپنا لائف اسٹائل بدلنے کو تیار نہیں تھی اگر میں خود اسے طلاق کا مطالبہ کرتا تو میرا گرین کارڈ چھن جاتا۔ انہی الجھنوں کے درمیان ہمارے ہاں عینی پیدا ہوئی۔ عینی کے لیے ہم دونوں کے ہی پاس وقت نہیں تھا، لہٰذا ہم نے اس کے لیے ایک میڈ رکھ دی جو عینی کی دیکھ بھال تو کر سکتی تھی لیکن مذہبی تربیت نہیں کر سکتی تھی مگر اس نے شاید ایک اچھا انسان بننے میں اس کی بہت مدد کی۔ میں مجبور تھا۔ مجھے امریکہ میں قدم جمانے تھے۔ عینی آٹھ نو سال کی تھی کہ مارتھا کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میرے خیال میں اس کے نہ ہونے سے نہ میری زندگی متاثر ہوئی اور نہ عینی کی۔ مارتھا مجھے ازدواجی سکون نہیں دے سکی تھی۔ میرے کئی عورتوں سے روابط تھے، پھر فلورا میرے ساتھ رہنے لگی۔ عینی اس سے کبھی مانوس نہ ہو سکی اور نہ ہی فلورا نے اس سے کوئی واسطہ رکھا۔ عینی کے لیے اس کی آیا ہی سب کچھ تھی۔ وہ مجھ سے بھی ہمیشہ دور دور رہی اور مجھے اس کے لیے وقت ہی نہ مل سکا۔ عینی ایسے ہی حالات میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ وہ اتنے آزاد ماحول میں والدین کی سرپرستی سے محروم رہ کر بھی اتنی نہیں بگڑی جتنا اسے بگڑ جانا چاہیے تھا اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس نے حویلی کے ماحول میں اتنی جلدی اپنے آپ کو جذب

کرلیا ہے اور وہ دوبارہ امریکہ جانا بھی نہیں چاہتی۔ اسے دینی اور اخلاقی تعلیم دینا اتنا مشکل نہیں ہے لیکن بھائی صاحب ہمارے مذہب اور معاشرت کے لحاظ سے وہ میری جائز اولاد نہیں ہے اگرچہ اس میں اس کا رتی بھر بھی قصور نہیں ہے۔ میں چاہتا تو یہ بات چھپا بھی سکتا تھا لیکن میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔ مجھے لاہور آکر اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا احساس ہوا۔ میں نے اپنی بیٹی کی بھی حق تلفی کی ہے لیکن وہ فطرتاً اچھے خیالات کی مالک، ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس نے اس مختصر عرصے میں یہاں رہ کر بہت کچھ سیکھ لیا ہے اور اس خاندان میں رہ کر بہت کچھ سیکھ بھی جائے گی۔ بہرحال فیصلہ تو بابا حضور کے ہاتھ میں ہے۔

معانی کا طالب

سمیع

عینی رات کو تایا جان کے لیے دودھ لے کر کمرے میں داخل ہوئی اور ان کے ہاتھ میں خط دیکھ کر دور ہی سے سمجھ گئی کہ وہ پاپا کا خط ہے۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کردیا تھا اور وہ چپکے سے کمرے سے باہر آگئی تھی۔ تایا اپنے خیالوں میں یوں مستغرق تھے کہ انہیں اس کے آنے جانے کی خبر ہی نہ ہوئی۔

☆.....☆

اگلے دن سب لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے دفتر، اسکول، کالج اور یونیورسٹی جا چکے تھے۔ عینی ناشتے کے بعد دادی حضور کو اخبار پڑھ کر سنا رہی تھی کہ ملازمہ نے آکر کہا کہ نواب صاحب نے انہیں اپنے کمرے میں یاد فرمایا ہے اور یہ بھی کہ وہاں رفیع الدولہ اور ان کی بیگم صاحبہ بھی موجود ہیں۔

عینی کی چھٹی حس نے ایک بار پھر اسے وارننگ دی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی اور شہرام کی نسبت زیرِ غور ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دادا حضور کے کمرے کے دروازے سے چپکی اندر کی آوازیں سننے کی کوشش کررہی تھی۔

بڑی دیر خاموشی کے بعد آخر کار دادا حضور کی بارعب آواز سنائی دی۔ ہم نے سمیع الدولہ کا خط پڑھ لیا ہے اور کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں عینی بیٹی کا قطعاً کوئی قصور نہیں ہے۔ انسان اپنی پیدائش کی جگہ خود منتخب نہیں کرسکتا۔ بے شک ہمارے مذہب میں پیرج میرج کی کوئی قانونی اور مذہبی حیثیت نہیں ہے اور اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو عینی بیٹی ایک ناجائز اولاد ہے لیکن دوسری طرف ہمارے مذہب کی رو سے ایک نومولود جب دنیا میں آتا ہے تو فرشتے کی طرح معصوم ہوتا ہے اور زندگی کے کسی موڑ پر بھی اپنے والدین کے کسی فعل کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے ہمیں شہرام اور عینی کی نسبت میں قطعی کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ عینی کے لیے مذہبی تعلیم کا انتظام ہمارا فرض ہے۔ وہ اتنی سعادت مند بچی ہے اور اس نے اتنی جلدی اس ماحول میں خود کو ڈھال لیا ہے کہ انشاء اللہ گزشتہ دنوں کا سایہ بھی اس کی زندگی پر نہیں پڑے گا اور وہ خاندان کی دوسری لڑکیوں کی طرح ایک کامیاب زندگی گزارے گی۔ البتہ رشتے کے سلسلے میں اس کی مرضی معلوم کرنا بہت ضروری ہے اور ہاں شہرام کے علاوہ اگر یہ بات کم سے کم لوگوں کو معلوم ہو تو بہتر ہے۔ میرے خیال میں تو اس بچی سے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ معصوم اور بے قصور لڑکی تمام عمر اس اذیت ناک احساس میں مبتلا رہے اور دوسروں کے سامنے شرمندہ رہے کہ وہ ایک گناہ کی پیداوار ہے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی لیکن عینی کو لگ رہا تھا جیسے اس کے چاروں طرف چیخ و پکار مچی ہو۔ بہت سے لوگ نفرت بھرے انداز میں اس کی طرف انگلیاں اٹھا اٹھا کر اسے ناجائز اولاد کہہ رہے ہوں۔ پھر اندر سے آہٹ کی آواز سن کر وہ چونکی اور چپکے سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب اس کے اردگرد ایسا سناٹا تھا جیسے وہ اپنے کمرے میں نہیں اپنی قبر میں ہو۔

کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ آدمی سانسوں کے سرگم کے موجود ہونے پر بھی زندہ نہیں ہوتا یا شاید وہ اس دنیا کی واحد ہستی تھی جو خود اپنا ماتم کرنے کے لیے زندہ تھی۔

☆.....☆

رات کے دو بجے تھے۔ عینی ہوسٹل کے برآمدے کی سیڑھیوں پر گم سم بیٹھی ڈوبتے ہوئے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ شدید سردی کے باوجود اسے سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اس کے اندر ایک ایسی آگ دہک رہی تھی جو اس کے وجود کو خاکستر کیے دے رہی تھی۔ دادا حضور کے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر اس نے جو کچھ سنا تھا اس کے بعد وہ حویلی کے کسی بھی فرد سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ کمالِ ضبط سے اس نے اپنی کیفیت کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ اس نے خاموشی سے دادا حضور کو ایک خط لکھا تھا اور ان کے تکیے کے نیچے رکھ آئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس حویلی میں رہنے اور کسی بھی فرد سے کوئی تعلق رکھنے کے اہل نہیں سمجھتی۔ اس لیے وہ دوبارہ امریکہ جا رہی ہے۔

نیویارک پہنچ کر کئی ہفتے سڑکوں پر دھکے کھانے کے بعد اسے ایک جنرل اسٹور پر سیلز گرل کی نوکری مل گئی تھی اور ایک ہوسٹل میں رہائش بھی۔

اس نے اپنے پاپا سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

اسے لاہور سے آئے ہوئے چار مہینے گزر گئے تھے اور اِس عرصے میں اسے ایک پل کو بھی ذہنی سکون نہیں ملا تھا۔ آنکھیں نیند سے محروم ہو چکی تھیں۔ جہاں تک کھانے کا تعلق تھا وہ زبردستی دو چار نوالے حلق میں ٹھونس لیتی تھی کہ زندہ تو بہرحال رہنا تھا اور پتا نہیں وہ زندہ بھی تھی کہ نہیں۔ ہر احساس جیسے مر چکا تھا۔ زندگی اگر سانسوں کے آنے جانے کا نام ہے تو وہ واقعی زندہ تھی۔ اپنی کسی فرینڈ سے بھی اس نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے تو یہ سوچ کر شرم آتی تھی کہ اس نے مذہب کے لحاظ سے کتنی غلط زندگی گزاری ہے لیکن اسے کسی نے بتایا بھی تو نہیں تھا۔ پھر جب اس نے خود اسلامی کتابیں پڑھیں تو اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوا اس نے خود ہی اپنی روش بدلنے کی کوشش کی تھی۔ اُن ہی دنوں وہ پاکستان چلی گئی تھی اور اب اسے پتا چلا تھا کہ اس کا وجود ہی غلط ہے، ناجائز ہے، تو اسے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی تھی۔

اس نے اپنے آپ کو ایک ناکردہ گناہ کی اتنی کڑی سزا دی تھی گویا اس نے اپنے آپ کو جیتے جی ہی مار ڈالا تھا لیکن اس کی پشیمانی نہیں جاتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اپنے گناہوں کا کفارا کیسے ادا کرے۔

اور پھر اس کی ملاقات مسز قدسیہ عباسی سے ہوئی۔ وہ سفید چادر میں لپٹی ہوئی اسٹور میں داخل ہوئی تھیں، اسے اتنی اچھی لگی تھیں کہ وہ تیزی سے ان کی طرف لپکی تھی کہ کہیں کوئی اور سیلز گرل انہیں اٹینڈ نہ کر لے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

وہاں جا کر اسے معلوم ہوا کہ انہوں نے تو باقاعدہ ایک درس گاہ قائم کی ہوئی تھی جہاں مذہب،

فرقے اور ذات کی تمیز کے بغیر تعلیم دی جاتی تھی اور اصلاح کی جاتی تھی۔ مسز قدسیہ نے اسے بتایا کہ امریکہ میں سارے مسلمان گمراہ نہیں ہیں بلکہ انتہائی پرہیزگار اور نیک لوگ موجود ہیں جو دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتے ہیں اور بہت سے غیر مسلم ان کے ہاتھوں مسلمان ہوئے ہیں۔

عینی کو بھی یہاں آ کر بہت سکون ملا۔ مسز قدسیہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ اگر وہ سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی معافی مانگے تو اسے ضرور معافی ملے گی کیونکہ توبہ کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

☆.....☆

جب رمضان کا مہینہ آیا تو عینی کو یاد آیا کہ اسے اپنوں سے بچھڑے ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔ ہوسٹل کے کمرے میں اس کے علاوہ کوئی مسلمان لڑکی نہیں تھی۔ عینی ان کے ڈسٹرب ہونے کے ڈر سے جوس کے ساتھ برگر وغیرہ کھا کر روزہ رکھ لیتی تھی اور خاموشی سے نماز پڑھ کر سو جاتی تھی۔

وہ چاند رات تھی اور پچھلی چاند رات سے یکسر مختلف تھی۔ وہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ہوسٹل کے سامنے پارک میں اپنے پسندیدہ خاموش گوشے میں بیٹھی تھی۔ اس نے اس عید پر کوئی اہتمام نہیں کیا تھا۔ وہ اکیلی بیٹھی پچھلی چاند رات کو یاد کر رہی تھی۔ اس شام اس نے چاند کو دیکھ کر جتنی بھی دعائیں مانگی تھیں ان میں سے ایک بھی قبول نہیں ہوئی تھی اور آج اس نے چاند کو دیکھ کر بس ایک دعا مانگی تھی کہ اسے کچھ بھی یاد نہ رہے اور اسے ذہنی سکون مل جائے۔

وہ آنکھیں بند کیے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی کہ کسی نے اس کے ہاتھ پر کچھ رکھ دیا۔ عینی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہاتھوں میں سرخ اور سبز رنگ کی چوڑیاں جگمگا رہی تھیں۔

''عید مبارک ہو عینی۔'' عینی نے چونک کر نظریں اٹھائیں تو سامنے شہرام کھڑا تھا۔ عینی کو لگا آج وہ پھر خواب دیکھ رہی ہے۔

''ارے ارے پھینکنا نہیں۔'' وہ اسے چوڑیاں اٹھاتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ ''ایک تو نیویارک میں ویسے ہی چوڑیاں نہیں ملتیں اور سرخ سبز چوڑیاں تو بالکل عنقا ہیں۔'' عینی نے خاموشی سے چوڑیاں اکٹھی کیں اور انہیں شہرام کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ آپ واپس لے لیجیے۔ میں نے اب چوڑیاں پہننی چھوڑ دی ہیں۔'' عینی نے چپکے سے اپنے آنسو دوپٹے میں جذب کر لیے اور وہاں سے جانے کے لیے آگے بڑھی۔

''اور آپ اب کہاں چلیں؟'' شہرام نے گھبرا کر کہا۔

''اپنے ہوسٹل۔''

''کمال ہے یہاں آپ کو ڈھونڈنے میں ایک عرصہ لگ گیا اور آپ نے حال بھی نہیں پوچھا اور نہ ہی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔''

''مجھے ہوسٹل کے کمرے میں کسی کو بلانے کی اجازت نہیں کیونکہ وہاں میرے علاوہ چار لڑکیاں اور بھی رہتی ہیں۔''

''تو چلیں پھر لاہور چلتے ہیں۔ وہاں تو ایسی کوئی پابندی نہیں ہو گی بس اتنا ہی ہو گا کہ عید کا پورا دن جہاز میں گزارنا پڑے گا، لیکن ایک بے وقوف سی لڑکی کے لیے یہ بھی منظور.....''

''مجھے نہیں جانا لاہور۔'' عینی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔

''تو پھر مجھے نیویارک میں ہی رہنا پڑے گا۔

کیونکہ دادا حضور نے کہا تھا کہ ان کی لاڈلی کے بغیر واپس مت آنا اور میرے پاس تو گرین کارڈ بھی نہیں ہے۔'' شہرام نے بے بسی سے کہا۔

''خدا کے واسطے اس منحوس چیز کا نام نہ لیں میرے سامنے۔ اس گرین کارڈ نے مجھے دنیا میں معتوب کر دیا اور میرے لیے دنیا میں کہیں جگہ نہ چھوڑی۔'' عینی نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

''آیئے پھر اس جگہ چلتے ہیں جہاں اس منحوس چیز کا نام کوئی آپ کے سامنے نہ لے گا اور جہاں آپ معتوب نہیں بلکہ سب کی محبوب ہیں اور ایک شخص ایسا بھی ہے جس نے اپنی پوری زندگی آپ کے نام کر دی ہے۔'' شہرام نے آخری الفاظ اتنی آہستگی سے ادا کیے جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں مگر عینی نے سن لیے۔ اس نے چونک کر شہرام کی طرف دیکھا مگر کچھ کہے بغیر قدم آگے بڑھا دیے۔ شہرام نے آگے بڑھ کر عینی کا ہاتھ تھام لیا۔

''عینی میں آپ کو لینے آیا ہوں اور میں خود نہیں آیا۔ مجھے دادا حضور نے بھیجا ہے۔''

''دادا حضور سے کہیے گا۔ عینی آپ کو بہت پیار کرتی ہے اور مرتے دم تک یاد کرتی رہے گی مگر وہ اپنا قابلِ نفرت وجود لے کر کبھی ان کے سامنے نہیں جا سکتی، کبھی نہیں۔'' عینی نے آگے بڑھنا چاہا لیکن شہرام نے اس کا راستہ روک لیا۔

''عینی فیصلہ کرنے میں اتنی عجلت سے کام نہ لیں کہ بعد میں آپ کو پچھتانا پڑے۔'' شہرام نے آنسو ضبط کر کے کہا۔

''پچھتانا کیسا؟'' عینی نے شہرام کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''مجھے اپنے گناہوں کی سزا کاٹنی ہے اور بس۔ یہی میرا مقدر ہے۔'' اس سے پہلے کہ شہرام کچھ کہتا عینی نے اُس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''شہرام پلیز میرے پیچھے مت آیئے گا۔ میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکوں گی۔ اسے میری مجبوری سمجھ لیجیے۔'' یہ کہتے ہوئے عینی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆.....☆

''اوہو عینی آخر ہوا کیا ہے۔ تم تو لگتا ہے آج رو رو کے مر جاؤ گی۔ کچھ تو بتاؤ ہوا کیا ہے۔'' عینی کی روم میٹس اسے سنبھالنے کی کوشش میں خود بھی ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔ عینی تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اور ان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔

''مجھے چھوڑ دو مارتھا۔ میں مر جانا چاہتی ہوں۔'' عینی نے اپنے آپ کو مارتھا کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آخر بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔ کچھ پتا تو چلے۔ خدا کے واسطے کچھ تو بتاؤ شاید اس طرح تمہارے دل کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔''

''میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ میں اپنی جنت کو ٹھکرا کے آ رہی ہوں۔ مجھ سے زیادہ بدقسمت انسان کون ہوگا۔'' عینی نے بلکتے ہوئے کہا۔

''مگر کیوں، کس لیے..... تم نے ایسا کیوں کیا؟'' عینی کی روم میٹس کو عینی کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ دنیا میں بالکل تنہا ہے کیونکہ اس سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔ عینی کسی سے بات ہی نہیں کرتی تھی اور وہ بھی اسے ایک مغرور لڑکی سمجھ کر نظر انداز کر دیتی تھیں لیکن آج اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ انسانیت کے ناتے اس کے قریب آ گئی تھیں لیکن اس سے پہلے کہ عینی کچھ بتاتی۔ اس پر غشی کا دورہ پڑ گیا اور اسے ہوسٹل کی وین میں اسپتال

پہنچا دیا گیا۔

☆.....☆

آج اس کی حالت کچھ بہتر تھی۔ تکیوں کے سہارے نیم دراز وہ خلا میں گھورتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ کاش مجھے اس وقت موت آ جاتی جب میں نے شہرام کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ کیا میں اتنی قابلِ نفرت ہوں میرے پروردگار کہ موت بھی مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ میں حرام موت مر کر اپنے گناہوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی میرے مولا۔ مجھے موت دے دے تاکہ میں مزید گناہ گار ہونے سے بچ جاؤں۔'' اسی لمحے ایک نرس نے اس کے ہاتھوں میں ایک لفافہ دے دیا۔

''کوئی شخص یہ لفافہ ریسیپشن پر آپ کے لیے دے گیا ہے۔'' عینی نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے اور لفافہ تھام لیا۔ اس پر کسی کا نام نہیں تھا۔ لفافہ کھولتے ہی سرخ اور سبز رنگ کی چوڑیاں نکل کر بیڈ پر بکھر گئیں۔ عینی نے چوڑیاں سمیٹ کر ایک طرف رکھیں اور لفافے کے اندر ہاتھ ڈالا تو ایک کاغذ کا پرزہ اسے ملا۔

عینی!

میں نے زندگی میں آج تک قسم نہیں کھائی۔ آج پہلی بار ایسا کر رہا ہوں، وہ بھی صرف تمہیں یقین دلانے کے لیے۔ مجھے میرے پروردگار کی قسم، عینی دادا حضور اور ہم سب کے لیے تم شبنم کے قطرے کی طرح پاکیزہ ہو۔ گناہ صرف وہ ہوتا ہے جو انسان جان بوجھ کر کرتا ہے۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کسی بھی انسان کو اپنی پیدائش پر اختیار نہیں پھر تم گناہ گار کیسے ہو گئیں۔ خدا کے لیے عینی، ضد چھوڑ دو۔ میں اگر خالی ہاتھ گیا تو نہ جانے کیا ہو جائے اور ہم سب ہاتھ ملتے رہ جائیں.....''

اس سے آگے عینی سے پڑھا نہیں گیا اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر ایک بار پھر رو دی۔ اسی لمحے کسی نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ عینی نے چونک کر سر اٹھایا تو شہرام اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں عینی ایسے فیصلے سے باز آ جاؤ، جس پر بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے اور وقت گزر جائے۔'' شہرام نے دھیرے سے کہا۔

''نہیں نہیں میری زندگی میں مزید پچھتاووں کی گنجائش نہیں۔'' عینی نے دل ہی دل میں لرز کر سوچا۔

''تمہیں معلوم نہیں دادی حضور کی طبیعت اس دن سے بے حد خراب ہے جب سے تم انہیں چھوڑ کر آئی تھیں۔ عینی پلیز اب انکار نہ کرنا دادا حضور اور دادی حضور نے پہلے ہی پچیس سال تک انتظار کا عذاب سہا ہے۔ اب ان میں مزید ہمت نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے۔''

''نہیں نہیں خدا کے واسطے ایسا نہ کہیے۔'' عینی نے سرتاپا لرز کر کہا اور دھیرے سے اپنا ہاتھ شہرام کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ کر یوں مطمئن ہو گئی جیسے کسی ڈوبتے ہوئے انسان کو آخر کار کنارا مل جائے۔

''یاد ہے۔'' شہرام نے سرگوشی میں کہا۔

''جناب کی تلاش میں ایک سال سے چھٹی پر ہوں۔ نوکری چلی گئی تو فاقے کرنے پڑیں گے، منظور ہے؟''

''منظور۔'' عینی نے برجستہ کہا اور پھر جھینپ گئی۔ کیونکہ بات اُس کی سمجھ میں بعد میں آئی تھی۔ اقرار اس نے پہلے کر لیا تھا۔ اُس کی چاندرات کو مانگی گئی دُعا قبول ہو چکی تھی۔

.....☆☆.....

رمنی ناول

فرزانہ آغا

یاد کے پچھلے پہر

یادوں کے در وا کرتی ہوئی، بہت خاص سلسلہ وار ناول کی تیسری قسط

زندگی جیسی تیسی کٹ رہی تھی کہ انڈیا اور پاکستان کی سرحدوں پر کشیدگی بڑھنے لگی۔ انڈیا، سرحد پار کی باتیں جو گزرے وقتوں میں ذرا دبی تھیں پھر سے برساتی کھمبیوں کی طرح سر اٹھانے لگیں۔ کسی کو گورداسپور یاد آنے لگا، کسی کو فیروز پور، کوئی انبالے کے گھر کی یاد میں آزردہ ہوتا اور کسی کو دہلی کے چاندنی چوک کے پھیرے یاد آنے لگتے۔ نیکی اور رومی اماں کے ساتھ اردو بازار جاتی تھیں تو چوہے مار دوائیاں بیچنے والا صدا لگاتا تھا۔ ''گولی اندر...... چوہا جالندھر'' نیکی جو پہلے اس صدا پر ہنس پڑا کرتی تھی، اب مغموم ہو جاتی تھی۔ یقیناً اس کے گھر والے بھی جالندھر کی باتیں کرتے ہوں گے۔ سب پچھلی باتیں ضرور کرتے تھے پر اُن باتوں، لہجوں میں دُکھ کے ساتھ ساتھ نفرت انگیزی ہوتی۔ اُن یادوں میں زہر گھلا ہوتا جو سکھوں اور ہندوؤں کے مظالم کے ہاتھوں خوں رنگ تھیں۔ ہر طرف ایک جوش وخروش کی فضا تھی۔ اپنی قربانیوں پر ناز تھا۔ قدموں میں استقلال تھا۔ اپنی فوج پر مان تھا اور یہ یقین تھا کہ معرکہ آمنے سامنے کا ہو تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سامنے رکنے کی تاب اور سینے پر زخم کھا کر نعرۂ حیدری لگانا ہر قوم کی صفت نہیں ہو سکتی۔ سادہ، جوشیلے، جذباتی لوگ کہاں جانتے تھے کہ بنیے کی سازش بڑی طویل المدت ہوتی ہے۔

اماں اور فاطمہ قسم قسم کی سوچوں میں غرق رہنے لگیں جن میں کبھی کبھار بلقیس بھی شامل ہو جاتیں۔ رومی اور ثمیا کا اسکول کھلا تھا لیکن فضا میں بڑی بے چینی گھلی تھی۔ دلیری، جوش وولولے سے پرے پرے رات گئے کام

کالج سے فارغ ہو کر عورتیں، بچے، لڑکے، بوڑھے اور ملازم اپنی اپنی ٹولیوں میں بیٹھے ہوتے تو زیرِ بحث، موجودہ ملکی حالات ہی ہوتے تھے اور پھر ساحر کا تبادلہ ہنگامی جنگی بنیادوں پر سیالکوٹ ہو گیا تھا۔

عظیم جنہیں پاس آؤٹ ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا چولستان میں تھے۔ ان کے خطوں میں تعطل پیدا ہونے لگا تو کسی دور پار کے پڑوسی کے گھر فون پر خیریت بتا دی جاتی۔ محلے کے ہر گھر سے تقریباً ایک لڑکا ضرور فوج میں تھا، اسی باعث ملکی حالات سے بھی دوسروں کی نسبت سب سے زیادہ باخبر رہتے۔ سب نے اپنے روشندانوں پر گہرے رنگ کے کاغذ اور اُن کے اوپر کالے کاغذ لگا دیے تھے۔ دن رات ریڈیو سے ملی ترانے نشر ہونے لگے۔ کشیدگی بڑھی اور پھر تمام تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ وسائل تھوڑے ہونے کے باوجود سب لوگوں نے کچھ دالیں، چینی، چاول، اسٹور کر لیے تھے، ہر گلی کے آگے مین روڈ سے ذرا پیچھے خندقیں کھودی جانے لگیں، ایسے کاموں میں نوجوان لڑکے پیش پیش تھے، جن کو رضا کار کہا جاتا تھا۔ بلیک آؤٹ کی پریکٹس کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اعلانیہ جنگ شروع ہو گئی۔ وہ جنگ جو صرف محاذوں پر نہیں لڑی جا رہی تھی بلکہ ہر گھر کی دہلیز سے باہر اور اندر، ہر کوئی جذبہ خدمت سے سرشار، اپنے اپنے محاذ پر ڈٹا تھا۔ اسکولوں کو کیمپ کا درجہ دے کر فوجی بھائیوں کے لیے چنے، گڑ، ڈرائی فروٹ کے پیکٹ اور لاتعداد ضرورت کی دوسری چیزوں کے پیکٹ بنا بنا کر بڑے کیمپوں میں بھیجے جا رہے تھے۔ ریڈیو بیچ صحن میں رکھے اونچی آواز کر کے سُنا جاتا، سب ارد گرد ہی رہتے تھے۔ خبروں میں سیالکوٹ اور چولستان کا نام آتا تو اماں کے کام کرتے ہاتھ تھم جاتے اور وہ خبریں ختم ہونے کے بعد بھی ریڈیو کے آس پاس ہی رہتیں۔ وہیں بیٹھ کر دالیں چُنتیں اور کبھی کبھار بے آواز بہتے آنسو اپنی لرزتی انگلی سے پونچھ ڈالتیں۔ مغرب کے بعد بلیک آؤٹ ہوتا تھا۔ واجبی طور پر رات کا کھانا کھا کر گھپ اندھیروں میں باہر تھڑوں، برآمدوں یا چھت پر سب اکٹھے ہوتے تو پارٹیشن سے پہلے کے دُکھ، عذاب اور اپنے گھر، پھر سے سب یاد کرنے لگتے۔ بیل گاڑیوں پر ہجرت کرنے والوں کو خون سے سرخ دریائے ستلج نہ بھولتا۔ ستلج کو پار کرنے کی، آگ اور بلووں سے بچ نکلنے کی، گئی گزری باتیں...... باتیں گئی گزری تھیں پر یادیں نہیں...... یادیں گئی گزری ہوتیں تو یاد کرنے والوں کی آنکھیں سرخ نہ ہوتیں۔ کوئی نہ کوئی ایسی دلخراش بات کر جاتا کہ سننے والی ہر آنکھ پُرنم ہو جاتی، پھر کوئی ریڈیو اونچا کرتا تو سب گھبرا کر ریڈیو کے پاس چلے جاتے۔ جب ریڈیو سے کسی جاسوس کی گرفتاری کا پتا چلتا تو سب سہم جاتے اور کوئی نہ کوئی ضرور پوچھتا۔ ''جاسوس ماموں کدھر ہیں؟'' جاسوس ماموں ساری سرگرمیاں ترک کیے سر تک لحاف اوڑھے پر چھتی پر پڑے رہتے تھے۔

پنڈی اور گرد و نواح میں جنگ کی شدت نہ تھی۔ پر جب بھی دشمن کے طیارے فضائی حدود کو کراس کرتے تو خطرے کے سائرن بج اُٹھتے سب لوگ جلدی جلدی بستروں سے نکلتے اور اندھے اندھیرے میں بچوں کی انگلیاں تھامے اندھیری خندقوں کی جانب بڑھتے۔ فاطمہ رومی کی انگلی پکڑے تیز تیز چلتیں، زمین کی اندرونی تہواروں میں سر گھٹنوں میں دیے رومی سوچتی، نیکی پتا نہیں کس خندق میں ہوگی؟ خطرہ ٹلنے کا سائرن بجتا تو سب شکر ادا کرتے باہر نکلتے، کچھ بچے دوسرے سائرن پر بھی رونے لگتے، اُن روتے بلکتے بچوں کو چپ کرواتے سب گھروں کو پہنچتے ہی تھے کہ، پھر خطرے کا سائرن اندھیرے میں ڈوبے شہر میں گونجنے لگتا۔ چھوٹے بچوں کی چیخ پکار بڑھ جاتی۔ جنگ کی ہولناکی بھی بھلا خوشی خوشی سہنے کی چیز ہے؟ سیالکوٹ، کھیم کرن، چونڈہ میں ایسے معرکے ہوئے جو دنیا کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے گئے۔ کم وسائل کے باوجود پاک فوج، بحریہ، فضائیہ کے جوانمردی کے قصے سنہرے باب رقم کرتے گئے۔ سترہ روزہ جنگ اختتام پذیر ہوئی بغیر کسی قابلِ ذکر فتح یا شکست کے، پھر بہت سی ماؤں کے کلیجے شق ہوئے اور بہت سے بہشتی چہرے عازمِ بہشت ہوئے۔ بحیثیت قوم ایک ہی خرابی رہی جذباتیت! کچھ چیزیں زیرک دشمن سے بھی سیکھنے کی ہوتی ہیں اور وہی چیزیں جیت کا تسلسل قائم رکھتی ہیں۔ معیشت کی مضبوطی، اقدار کی مضبوطی، قومی پالیسیز کا تسلسل اور سب سے بڑھ کر اپنی مٹی سے محبت، جو یہ سب کچھ کرواتی ہے۔

ملکی حالات آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگے۔ اسکول کھل گئے تھے اور شیما اور جبین کو دیکھنے کو ایک نیا تماشا مل گیا تھا۔

کلاس میں ایک موٹی تازی لڑکی جنگ 65 کے بہادروں پر قصیدہ آرائی کر رہی تھی۔ اُس کے اُمنڈتے پھرتے ملی جذبات سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ اُس کے ذاتی ملی اشعاروں پر پوری کلاس بڑھ چڑھ کر داد دے رہی تھی۔ موضوع ''کھیم کرن'' اور ''چونڈہ'' کے میدان تھے۔ موٹی تازی لڑکی ایک تو اپنے جذبات کے ہاتھوں تماشا بنی دوسرے وہ میٹرک آرٹس میں کرنے کے بعد کچھ عرصہ لاپتا رہنے کے بعد اب پھر سے سائنس میں میٹرک کرنے کے خیال سے اسکول میں داخلہ لے چکی تھی اور آٹھویں جماعت میں شیما اور جبین کے سیکشن میں تھی۔ پہلے تو وہ دونوں اُسے ''آپا جان...... آپا جان'' کہتی رہیں۔ پھر جب یہ دیکھا کہ اُس کی شاعری نہ ''چونڈہ'' سے آگے بڑھی نہ پیچھے ہٹی تو اُسے ''چونڈہ'' ہی کہنے لگیں۔ پھر پوری کلاس کہنے لگی اور پھر پورا اسکول! بھولے سے بھی کسی کی یادداشت میں نہیں رہا کہ اس کا اصلی نام کیا تھا۔

لڑکے محاذوں سے واپس آ رہے تھے۔ باتوں، داستانوں سے کونے کھدرے بھرے تھے۔ ہندوؤں کے جن علاقوں پر پاک فوج نے قبضہ کیا تھا، وہاں کی، اُن دیہاتوں کی باتیں...... داستانیں! ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھیں۔ ساحر بھی چھٹی پر آئے تھے ایسے کہ سانولے چہرے پر جیسے اُڑتی راکھ کی پرت پڑی ہو، ہاتھ پیر

ڈاکٹر نگہت نسیم کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ

مٹی کا سفر

شائع ہو گیا ہے

ایک ایسی مصنفہ جو مسیحا بھی ہے اور تخلیق کار بھی......

دیارِ غیر میں رہ کر بھی اپنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے آباد افسانے جو اپنی مثال آپ ہیں۔

قدرے دھندلائے سے، گھر آئے تو اِس مرتبہ زیادہ خاموش تھے۔ اماں اُن کی دمساز، انڈوں کے حلوے کی اُن کی من پسند پلیٹ لے کر اُن کے کمرے میں گئیں تو ایک اطلسی مسکراہٹ سجیلے چہرے پر چھا گئی، اماں کو دیکھ کر بھی اور پلیٹ کو دیکھ کر بھی۔ کتنے برس پہلے صدر کے کباڑی بازار میں آکشن کے سامان سے انہوں نے انگلینڈ کی بنی دو پلیٹیں خریدی تھیں۔ جن کے اندر گہری نیلے رنگوں میں پینٹنگ بنی تھی اور پلیٹ کے کناروں پر چوڑی جالی بنی تھی جیسے نازک لیس لگی ہو۔ تالے تو گھر میں اتنے ہیں نہیں، پتا نہیں اماں ایسی چیزیں کدھر سنبھالتی ہیں؟ دروازے سے لگی رومی نے سوچا۔

دو روز بعد ساحر کا بیٹ مین سید عالم گھر آیا تو ساتھ پیتل کی چھوٹی سی گاگر میں پانی میں ڈالا آم کا اچار تھا۔ ساحر گاگر اماں کے ہاتھ میں تھماتے بولے۔ ''وہاں خالی گاؤں کے ایک گھر میں کمزور سی ہندو بڑھیا تھی۔ جو ہمیں دیکھ کر مزید خوفزدہ ہوگئی۔ ہم نے اُسے کہا بھی کہ ہم اُسے کچھ نہیں کہیں گے صرف گھر کی تلاشی لینی ہے تو تب بھی وہ خوف زدہ نظروں سے دیکھتی کونے میں دُبکی رہی۔ جب ہم باہر جانے لگے تو بولی۔ ''تیرے کندھے تک میرے ہاتھ تو نہیں جائیں گے کہ تجھے تھپکی دیتی یہ اچار اپنی ماں کو دے دینا۔'' میں نے کہا اماں جی! میں یہ کہاں اٹھائے پھروں گا تو اماں نے دھندلی آنکھوں سے ایسے دیکھا کہ میں نے چپ چاپ گاگر پکڑ لی وہ ہولے سے بولی۔ ''میرا کرشن بھی جنگ پر ہے۔ کوئی خبر نہیں...... ایشور کرے کوئی خبر آجائے۔''

''آجائے گی اماں! خبر بھی آجائے گی، وہ خود بھی آجائے گا۔ جنگ بند ہوگئی ہے۔'' پھر تو وہ باری باری ہم سب کے ہاتھ پکڑ کر یوں رونے لگی کہ واپس جانا دوبھر ہوگیا۔ بڑی مشکل سے سمجھایا کہ ڈیوٹی پر جانا ہے، روٹی ٹکڑا نہیں کھا سکتے۔''

...ے کے دوران ہی بلقیس کے ہاں اُن کے کچھ سسرالی رشتے دار آئے تھے، صوبہ سرحد کی طرف سے۔ اُن کی آمد پر سب یوں حیران تھے کہ پٹھان تو بڑی جری قوم ہے، پر وہ کچھ کاٹھے پٹھان جنگ اور جنگی حالات سے پریشان ہو کر پنڈی آگئے تھے۔ اُن کے خیال میں یہ زیادہ محفوظ شہر تھا۔ دو میاں بیوی اور چھ بچوں پر مشتمل یہ کنبہ سائرن بجنے پر عجیب ہڑبونگ مچا دیتا تھا۔ اُن کی بڑی والی دو نوعمر لڑکیاں جب اونچی اونچی ہیل پہنے خندق کی طرف دوڑتیں تو خود بھی بارہا گرتے بچتیں اور اُن کے پیچھے آتے خوامخواہ گرنے لگتے یا ٹھوکریں کھاتے کہ چھوٹا چھوٹا سامان اور پرس اٹھائے بچے کبھی رُکتے کبھی چلتے، ایک دوسرے کے ہمہ وقت ہاتھ تھامے میاں بیوی نہ جانے کدھر ہوتے تھے۔ ان کے چھ بچوں کے ریوڑ کو کبھی بلقیس ہانکتیں کبھی محلے والے...... گہرے میک اپ اور بھاری زیورات سے آراستہ پیراستہ خاتون میاں میں اور میاں اُن کا ہاتھ تھامے اُن میں مگن رہتے تھے۔ جنگ ختم بھی ہوگئی پر فاطمہ کو جب وقت ملتا وہ چھ کے چھ بچوں کو سامنے بٹھا کر خندقوں میں جانے کے آداب سکھلانے لگتیں، جس پر اکثر اماں ناک بھوں چڑھا کر کہتیں۔ ''اب فائدہ؟''

کچھ لوگوں نے زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ جیسے مس آصفہ، جیسے ڈولی، جیسے بابا کے کچھ کینہ پرور واقف کار! کبھی اماں کا حال احوال پتا کرنے آتے تو جاتے جاتے کہتے: ''اُس روز گھر کے آگے سے گزر رہا تھا۔ چار گھروں تک لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔'' اماں کو شاکی اور ملول دیکھ کر لڑکیاں کڑھ کر رہ جاتیں کہ جس گھر میں دس بارہ لڑکیاں اکٹھی ہوتی ہوں وہاں اگر چار گھر تک ہنسنے کی آوازیں چلی بھی گئیں تو کیا ہوا؟

''اماں! کیا بابا کہہ کر گئے تھے اپنے جاننے والوں سے کہ خیال رکھنا یہ لوگ ہنسیں نہیں؟''

''رومی! تم تو عجیب ہی بات کرتی ہو۔'' اماں جھڑکتیں تو لہجہ بودا سا ہوتا کہ اس گھر میں سب سے وسیع حلقۂ احباب انہی کا تھا۔ چالیس گھروں کی ہمسائیگی کو نبھانا کوئی اُن سے سیکھتا۔

کوئی بھولا بھٹکا چچا تایا حال دریافت کرنے آجاتا تو جاڑے کی راتوں میں انگیٹھیوں کے گرد رات گئے تک محفلیں بپا رہتیں اور پھر پھول چند گارڈنز کا وہ واقعہ ضرور دہرایا جاتا کہ بھابی جی! یاد ہے جب ہم مالٹے توڑتے پکڑے گئے تھے، تو دور سے مالی کو آتا دیکھ کر آپ نے ہمارے ہاتھوں میں مالٹے تھمے دیکھ کر جھٹ مالٹے پکڑے اور ساڑھے کی فال کے ساتھ دباتے ہوئے پلو گرد لپیٹ لیا۔ اب مالی کبھی ہمیں گھورے کبھی بھابی جی کو تکے۔ گرما گرم بحث ختم بھی ہوگئی تو وہ سوچے کہ یہ لوگ جاتے کیوں نہیں؟ اب یہ عورت چلتی کیوں نہیں؟ سانس گھونٹے کھڑی کیوں ہے؟ ''جاؤ بیگم صاحب ہم وکیل صاحب سے بات کریں گے۔'' اور...... اور...... بیگم صاحبہ چلیں تو پہلے ایک مالٹا لڑھکتا ہوا مالی کے قدموں تک پہنچا اور پھر...... توبہ!'' سب ہنستے ہنستے پاگل ہونے لگتے...... اور یاد ہے جب بلقیس اور اُس کی سہیلیاں شام ڈھلے تک گھر نہ پہنچیں تو گھر بھر میں، پھر اڑوس پڑوس میں ڈھنڈیا مچی۔ کچھ ہرکارے ''پھول چند گارڈنز'' دوڑائے گئے تو پتا چلا کہ بچے پھول ہاتھوں میں پکڑے پودوں کے پاس بیٹھے ہیں۔ بلکہ بٹھائے گئے ہیں۔

''ساحر بھی تو تھا۔'' چچا ہنستے ہنستے بولتے۔ ''بڑے بھیا...... بڑے بھیا بھی تھے؟'' رومی حیرت سے کہتی۔

''ہاں! وہ بے چارہ تو سب سے چھوٹا تھا، شاید سوا دو سال کا ہوگا۔'' اماں بات روکتیں پھر کہتیں۔ ''بچے رو رو کر ہلکان ہو چکے تھے پر مالی انہیں اٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ پھول توڑے تھے تو اب واپس بھی لگاؤ ڈنڈی پر، ویسے ہی جیسے پہلے لگے تھے۔ جب تک پھول نہیں لگاؤ گے گھر نہیں جاؤ گے۔ بچے پھولوں کنارے بیٹھے زار زار رو رہے تھے۔ مالی ایک تھا اپنی ذات کا۔ نہ نوکر نہ چچا نہ ماموں کسی کی سفارش کو مان کر نہیں دے رہا تھا۔ بچے جب کسی اپنے کو دیکھتے تو بلند آواز سے روتے۔ بات چیت کے دوران سسکیاں بھرتے جاتے اور جب مذاکرات ناکام ہو جاتے اور ناکامی کی اطلاع کو آیا ہوا شخص واپس جانے لگتا تو بچوں کے رونے کی آوازیں اور اونچی ہو جاتیں۔ اُدھر مالی کی ایک ہی رٹ کہ وہ وکیل صاحب سے بات کرے گا۔ گیلانی صاحب آئے کُل گھرانے بڑوں، بچوں کی پیشی ہوئی۔ بارہا دی گئی دھمکیاں پھر سے سب کو دی گئیں۔ بچوں نے سچے دل سے پھول نہ توڑنے کا وعدہ کیا اور مغرب کے بعد گھر لوٹے۔''

گیلانی صاحب کے سامنے بچے بڑے اکثر ''لائن حاضر'' رہتے کہ وعدہ تو کر لیا جاتا پر ایفائے عہد زیادہ دیر چل نہ پاتا تھا۔ جیسے ایک بار اماں کے دیور، جیٹھ اور گیلانی صاحب کے کاتب جنہیں احتراماً سب ''تایا جی'' کہتے تھے، اماں کے ہمراہ ''پھول چند گارڈنز'' سے کچھ ایسے نایاب رسیلے آم توڑ لائے، جو دوپہر میں پیٹ بھر کر کھا تو لیے، پر اُن کی خوشبو تھی کہ ہڑپ کیے جانے کے چار چھ گھنٹے بعد بھی ماحول سے لپٹی پڑی تھی۔ اُدھر گیلانی صاحب کے گھر آنے کا وقت ہو رہا تھا اور سب کی جان پر بنی تھی کہ وہ کہیں گے کہ جب آم گھر میں تھے نہیں تو خوشبو؟؟ ایک دانا نے جان بچانے کا کارگر نسخہ بتلایا اور سارے چھلکے، گٹھلیاں گھر کے باہر گڑھا کھود کر دفنا دی گئیں اور پھر پورے گھر میں مچھر، مکھی مار اسپرے اتنا زیادہ کیا کہ اگلے چار گھنٹے تک بڑے بچے کھانستے اور تھوکتے پھرے، سرخ آنکھوں کے ساتھ۔ تو جب کوئی ایسا واقعہ دہرایا جاتا تو اب! بات کے آخر میں اماں ضرور کہتیں ''تم سب آہستہ ہنسا کرو، آوازیں باہر جاتی ہیں تو لوگ باتیں بناتے ہیں۔''

شیما اپنی بھاری آواز میں کہتی۔ ''اس بار بڑے بھیا چھٹی آئیں گے تو میں خود بات کروں گی۔ نیچے گیلری والے کمرے میں ان کے دوست کتنا اونچا اونچا ہنستے ہیں۔''

''وہ لڑکے ہیں۔'' اماں الجھ کر کہتیں......

''آپ بھی بس......'' شیما غصے میں سر جھٹکتی، ہنسنے کے لیے لڑکے اور لڑکی کی تفریق اُس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

اماں دھیرے سے کہتیں۔ ''مجھے یقین ہے یہ بات ''موم جامے'' نے اُڑائی ہوگی۔'' موم جامے کے نام پر پھر سب ہنسنے لگتے کہ بابا کے اِس مشہور شاعر دوست کو یہ خطاب خود اماں نے دیا تھا جو اتنا مشہور ہوا کہ اصلی نام کسی کو یاد ہی نہیں تھا۔ آنے کے بعد جانے کا نام نہ لینے اور چپک جانے کی خصلت کے باعث انہیں اس خطاب سے نوازا گیا تھا کہ موصوف آدھی آدھی رات تک بیاض سناتے تھے نہ صرف سناتے تھے بلکہ داد کے طلب گار رہتے تھے۔ کل گھرانے کو جو تکلیف اس سے بڑھ کر تھی وہ یہ کہ جاڑے کی ماری راتوں میں سات سات کلو روئی کے لحاف سے نکل کر بار بار حقہ تازہ کروانا پڑتا تھا۔ نوکروں کے کان لپیٹے پڑے ہونے سے گھر والوں میں سے کسی نہ کسی کو اٹھنا پڑتا نہ صرف یہ بلکہ ''موم جامے'' کی طرف سے ارشاد ہوتا لوٹے کا پانی گرم کروا دیں۔ بچے بھی سو جاتے تو لے دے کے بلقیس، اماں اور تایا جی رہ جاتے یہ ڈیوٹی کرتے کرتے کئی روز گزر گئے...... ایک رات جب موم جامے نے چوتھی بار لوٹا تیار کرنے کا حکم نازل فرمایا تو لوٹا تو تیار ہو گیا پر ایسے کہ اس میں سرسوں کا خوب سارا تیل بھی ڈال دیا اور واقعی...... موم جامہ بہت...... بہت دیر بعد غسل خانے سے برآمد ہوا۔ ایسے کاموں میں تایا جی کا ذہن بہت زرخیز تھا۔ ایسی باتوں میں جاڑے کی راتوں میں وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلتا۔ نہ جانے وہ جاگتا مگر کب نیند کی آغوش میں اترتا شاید اُس وقت کہ چولہے میں دہکتے اپلوں کی سرخی پر سرمئی راکھ غالب آجاتی...... شاید جب!

نیلچی کے گھر کا جو حصہ گارڈن روڈ کی طرف تھا اس کی وسیع چھت کی نیچی دیوار رومی کے گھر کی چھت سے ملتی تھی۔ سامنے والی دیوار میں ہر گھر کی چھت کی طرح سیمنٹ کے چوڑے تھڑے بنے ہوئے تھے جو نہ صرف بیٹھنے بلکہ رات میں اکثر سونے کے کام بھی آتے تھے۔ اُس چوڑی چھت پر چاندنی راتوں میں گہری رات گئے ایک سایہ منڈلاتا تھا۔ طویل چھت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کی چارپائیاں صحن میں یا چھت پر سرِ شام بچھا دی جاتیں۔ سفید چادریں چاندنی میں ٹھنڈی رہتیں۔ کونے میں ایک کڑھائے میں مچھروں سے بچاؤ کو تھاپیاں سلگتی رہتیں۔ کوئی حبس بھری راتوں میں گھڑے سے پانی پیتا تو کھٹکتا...... اچھا! جونی ہوگا وہ پانی پیتا اور ٹھنڈی چارپائی پر کروٹ بدل کر آسودہ ہوتا، پر نیند جونی سے روٹھی پڑی تھی۔ ہاں! چاند پورا ہوتا تو اکثر ایک سریلی آواز اطراف کے سناٹے کو بھر دیتی۔ ''او دنیا کے رکھوالے، سن درد بھرے میرے نالے...... سن درد بھرے میرے نالے'' اٹھان ایسی پختہ اور سریلی ہوتی جو دل تھام لیتی۔ سوئے ہوئے خوابناک ہوئے جاتے اور جاگتے ہوئے سر دھنتے۔ جونی کی آواز کا سوز بتاتا تھا کہ روگ صرف لڑکپن نہیں، درمیانہ قد، ڈھیلا کرتا، بڑھی شیو اور مزاج قلندری! جو کچھ کرتا من مرضی سے کرتا، بات ہو بناتا کہ گاتا، عجیب سمندر مزاج پایا تھا، جو چاند کے عروج کے ساتھ مد و جزر اچھالتا رہتا، اُن کی بے خواب راتیں سُر ساگر میں ڈوبتی رہتیں۔ وہ نیلچی کے خالہ زاد تھے جن کی والدہ اسکول کی پرنسپل تھیں اور ''آپا جی'' کہلاتی تھیں۔ نیل کنول اُن ہی کے اسکول جاتی تھی۔

گھر میں قرآن خوانی ہوتی تو گھر گھر بلاوے کے لیے رومی اور نیلچی کو بھیجا جاتا۔ ویسے بھی تو ایک دوسرے کا

ہاتھ پکڑے مارا مار پھرتی ہی رہتی تھیں۔ جن کے بلاوہ دینا تھا وہ فاطمہ کی دوست تھیں۔ مال روڈ پر ایک بہت اچھے اسکول کی پرنسپل، ان کے صرف دو بچے تھے، انتہائی کم گو جو بے حد پڑھے لکھے ماحول کے اُداس بڑے کمروں کے دبیز قالینوں پر تھم تھم کر چلتے اور رُک رُک کر بولتے۔ پیر زادہ صاحب کی لب سڑک سفید کوٹھی کے بازو کی گلی میں رہتے تھے جو اتنی چوڑی تھی کہ اُسے گلی کہنا اکثر توہین آمیز لگتا تھا تو اسی گلی کے بائیں ہاتھ سنگِ مرمر کی تین سیڑھیاں اندرونی ڈیوڑھی تک پہنچاتی تھیں۔ بعد مغرب کے نیم اندھیرے میں ڈوبے نہ جانے کتنے کمرے اور دالان تھے، رومی اور نیلچی تو یہ بھول ہی چکی تھیں کہ وہ آخری مرتبہ کس کمرے میں ربیعہ آپا کو فاطمہ کا کوئی پیغام دینے گئی تھیں۔ گھر والے نہ جانے کدھر تھے؟ پرانی باتوں میں رومی اور نیلچی کو یہ سوچنے کی ضرورت کہاں تھی، اُن کے لیے سب سے قابلِ تسکین بات یہ ہوتی تھی کہ وہ دونوں اکٹھی ہیں۔ باتیں کرتے کرتے منقش لکڑی کے چوڑے دروازے کا گول سنہری ہینڈل گھما کر دونوں اندر داخل ہوئیں اور ساکت ہو گئیں۔

لیمپ شیڈز کے ساتھ قدِ آدم نیم عریاں بُت مدھم روشنی میں پورے عریاں ہو رہے تھے اور بُت ایک کب تھا؟ ایک...... دو...... تین! رومی کے گنتے گنتے نظر روکنگ چیئر پر ساکت ہوتے آدمی پر پڑی جو اس تخلیے میں در اندازی پر نہ صرف خود ساکت ہو چکا تھا بلکہ ساتھ ساتھ اُبلتے حلقوں میں سرخ آنکھیں اور بلوریں گلاس کا سنہرا مشروب بھی! رومی نے آہستہ سے نیلچی کا ہاتھ دبایا جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرت کدے کے بتوں کو تک رہی تھی، کچھ نہ سمجھنے کے باوجود رومی کو یہ احساس ضرور ہوا کہ غلط وقت میں، غلط جگہ آگئے ہیں۔ ساٹن کے چمکتے سفید بستر سے نازک سی کھانسی ابھری اور عریاں سفید بازو کسمسایا۔ بجائے پلٹنے کے شرمندہ رومی، شرمندہ سی نیلچی کا ہاتھ تھامے تیزی سے سامنے کے دروازے کی طرف بڑھی اور گھبراہٹ میں اُسے کھولتے ہوئے اُس کا شانہ دیوار سے لگے عریاں بُت کی ایستادہ عریانی سے ٹکرا گیا...... تو اُس نے تیزی سے تھوک نگلا، دروازہ کھول کر جلدی باہر نکلنے کی کوشش میں دونوں گرتے گرتے بچیں۔ خوش قسمتی سے اب وہ دونوں صحن میں تھیں جہاں ربیعہ آپا، فاطمہ کی دوست مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ رومی اور نیلچی برآمدے میں رکھی چوکی پر بیٹھ کر سانس ہموار کرنے لگیں۔ ربیعہ آپا نے بڑی دیر بعد سلام پھیرا تو اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ رومی نے جلدی جلدی انہیں فاطمہ کا پیغام دیا اور وہ دونوں جلدی سے باہر آگئیں۔ گھر واپس آنے تک دونوں خاموش رہیں۔

رومی کے گھر سے نیلچی کے گھر کو کئی راستے جاتے تھے۔ سو وہ اپنے دروازے تک پہنچنے کی زحمت کم ہی کرتی تھی۔ رومی کا گھر پہلے آجاتا تھا۔ سو اُدھر ہی سے اپنی طرف پار سل ہو جاتی، جب دل کرتا۔ دونوں ڈیوڑھی میں پہنچی تھیں کہ دیکھا فاطمہ کی دوست حسین کا بیٹا جگنو کھڑا تھا۔ حسبِ سابق، حسبِ عادت آدھا منہ کتابوں میں دیئے کہ کوئی خود ہی دیکھ لے تو بلا لے۔ عمر نو یا دس برس ہوگی۔ ''سورج مکھی چہرہ، روشن چمکدار سبز آنکھیں بڑا سا سر اور سنہری بال۔ نیلچی پر نہ سمجھ میں آنے والی شرمندگی اب تک طاری تھی۔ اُس نے ڈیوڑھی میں جگنو کو دبکے دیکھا تو ذرا اکھڑ آواز میں پوچھا۔ ''ہاں! کیا بات ہے؟''

''مِس کے پاس جانا ہے۔'' وہ مسمسا کر بولتا تو چہرہ لال بھبھوکا ہو جاتا۔

''مِس کون؟ باجی؟'' رومی خواہ مخواہ الجھی۔

''کیوں۔'' بمشکل حلق سے آواز نکلی اور وہ سرخ منہ کو کتابوں میں گھسیڑ تایا جی کے کمرے کے بند دروازے کے باہر ساکت کھڑا ہو گیا۔ اس امید پہ کہ کوئی دیکھ لے تو اُسے کمرے کی دہلیز بھی پار کروا دے۔ رومی اور نیلچی

اوپر جا چکی تھیں۔ اتنے میں نیل کنول اور مہ فشاں کی نظریں جگنو پر پڑیں۔ جنگ چھڑ جانے کے باعث اس کا آنا بھی موقوف رہا اور نہ تو جگنو کے ہمہ وقت دبکنے اور کسی بھی کونے میں چپکنے کی عادت سے وہ بھی عاجز تھیں اور پھر اس قدر شرمانا کہ توبہ بھلی! لڑکیوں کے ہاتھ تو چھیڑ آ گئی، فاطمہ کا کمرہ بلقیس کو دیے گئے کمروں کے عین سامنے تھا۔ سو جب جب جگنو ساکت کھڑا پایا جاتا تو مہ فشاں اور نیل کنول گانے لگتیں،

''جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اُس کو بجاتے ہیں تالیاں''

کورس اونچا ہوئے جاتا کہ اس میں رومی، جبین، نیلمی اور ڈولی کی آواز بھی شامل ہو جاتی۔ جگنو کے کندھے اندر کو جھکنے لگتے اور گلال چہرہ کتابوں میں ڈوبنے لگتا۔ اتنے میں فاطمہ کمرے کا دروازہ کھول کر آواز لگاتیں۔ ''اندر آجاؤ جگنو'' جگنو کے مردہ قدموں میں حیاتی لوٹ آتی اور وہ تیزی سے کمرے کی طرف بڑھتا تو گیت کی تال اونچی سے اونچی ہوئے جاتی۔ اماں کچن سے نکل کر اوپر جنگلے سے لڑکیوں کو گھرکتیں۔ ''کیوں بچے کو پریشان کر رہی ہو، حسین نے بڑے دُکھ اٹھائے تو اللہ نے جگنو دیا۔''

''جس اللہ نے جگنو دیا وہ اللہ جگنو کو عقل بھی دے دے۔'' کسی شوخ کی آواز ابھرتی..... روزانہ آنے والا جگنو اب اس روٹین کا ایسے عادی ہو گیا تھا جیسے کوئی کھانے پینے، نہانے کی روٹین کا عادی ہو جاتا ہے۔

اُن دنوں اسکول میں ''بلیو برڈز'' اور گرل گائیڈز کی ''کیمپنگ'' شروع ہوئی تھی۔ اسکول کے گھٹن زدہ ماحول اور ٹیچروں کے رویے کی یکسانیت سے اُکتائے ہوئے بچوں کے لیے کیمپنگ نعمتِ غیر مترقبہ تھی جسے باقی بچے حسرت آمیز نظروں سے دیکھتے تھے۔ بوائے اسکاؤٹس کے لیے ''جمبوری'' ہوتی جس میں وہ کسی جنگل میں کیمپنگ کرتے، پر لڑکیوں کے لیے اسکول گراؤنڈز میں ہی تین دن کی کیمپنگ رکھی گئی۔ مقصد کم سے کم وسائل میں بچوں کو بہتر زندگی گزارنے کے طریقے سکھانے تھے۔ رات کیمپ میں گزارنی، مقررہ وقت پر کام کاج ختم کرنا، کم وسائل میں کیمپ کو سجانا، حتیٰ کہ جعلی ایمرجنسی بپا کر کے مریض کو فرسٹ ایڈ دینا، مختلف طریقوں سے مرہم پٹی کرنا، شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے سارا کام سمیٹنا سکھایا جاتا اور رات کھانے کے بعد کیمپ کے آگے بنے مصنوعی لان میں لکڑیوں کا ڈھیر رکھ کر ''بون فائر'' ہوتا جس میں ہمت اور عزم کو برقرار رکھنے کے گیت گائے جاتے۔ تین روزہ کیمپنگ کے مارکس ہوتے تھے اور بہترین نتائج پر انعامات کا سلسلہ تین مردہ میں جان ڈال دیتا تھا۔

شیما، جبین اور چونڈہ بھی کیمپنگ میں شامل تھیں۔ چونڈہ اکیلی بھی گھوم رہی ہوتی تو ہر دم ''اپنی قوت، اپنی شان، اپنی قوت اپنی شان، جاگ رہا ہے پاکستان'' ہی گنگناتی رہتی تھی۔ تمام لڑکیوں کے لیے ایک مخصوص احاطہ بنا دیا گیا تھا، جس کے گرد گرل گائیڈز نے ایک سائز کی سیدھی سیدھی لکڑیاں کراس کی شکل میں لگا کر کیمپ کے گرد باؤنڈری بنا دی تھی۔ لڑکے جنگل میں کیمپنگ کرتے تھے تو نیچر سے زیادہ قریب ہونے کی نسبت اُن کے وسائل بھی زیادہ ہوتے تھے۔ پر لڑکیاں ضرور کوشش کرتیں کہ وہ اسکول میں موجود درختوں، پودوں سے جتنی چیزیں حاصل کر سکتی ہیں..... ان کے ذریعے کیمپ کو آراستہ اور خوب صورت بنائیں۔

رومی نے ''دھریک'' کے پیلے سوکھے پتوں کے بہت سے گچھے اکٹھے کیے اور دو تین ''پائین کونز'' کے ساتھ ایسی ترتیب سے گولائی میں باندھا کہ بہت پیاری سی "WREATH" تیار ہو گئی اسے کیمپ کے ماتھے پر ٹانگا گیا۔ دوسرا اُس نے کچھ لکڑیوں کو آڑا ترچھا باندھ کر ''تولیہ اسٹینڈ'' بنایا جو کیمپنگ کے تینوں دن استعمال میں

رہا۔ ہر لڑکی کے ذمے دو چیزیں بنانا تھیں۔ رومی اپنے حصے کا کام کر چکی تھی لیکن پھر بھی باقی ''گروپ ورک'' میں بڑی لڑکیوں کے ساتھ کام کرتی رہتی جس میں کیمپ کے آگے اینٹوں کی کیاری پر چونا کرنا، سبزیوں کی کیاریاں بنانا، کھانے کی تیاری میں بڑی لڑکیوں کا ساتھ دینا۔ کڑی مشقت کے سب کام ''چونڈہ'' کرتی۔ چوکور چہرہ، گٹھا ہوا جسم، ہاتھ میں کلہاڑی لیے جب کسی درخت سے کودتی تو کافی اونچی ''دھم'' کی آواز آتی۔ یہ درخت بھی پچھلے دو تین برسوں میں پھلے پھولے تھے، گرل گائیڈز اور بلیو برڈز کے ہاتھوں۔ ہاں! اسکول کے ساتھ جو آسودہ پُرسکون سا چرچ تھا اُس میں چیڑ کے دو ایک پرانے درخت تھے جن کے پائین کونز پک جاتے تو سی۔ بی اسکول میں گر جاتے تھے۔ دن رات ان تمام کاموں میں سب لڑکیاں خوشی خوشی مشغول رہتیں سوائے روبینہ کے۔ جو ہنوز اُسی موڈ میں تھی جس میں وہ رہا کرتی تھی۔ انتہائی کم گو، زردی مائل سفید اجلی بے داغ رنگت، سوجی سوجی آنکھیں، گھنگھریالے بال، دھیمی بے حد دھیمی چال اور سوچ میں ڈوبا چہرہ، وہ جہاں بھی ہوتی وہاں اس کی غیر حاضری ہی لگی ہوتی تھی۔ نہ جانے وہ کن خیالوں میں کھوئی رہتی اور کن سوچوں میں ڈوبی رہتی۔ اُس کی سوچیں چھٹی کلاس کی بچی کی سوچیں نہ لگتی تھیں۔ سائے کی طرح چپ چاپ کام کرتی رہتی۔ معلوم نہیں کیمپنگ کے لیے اسکول میں ٹھہر کیسے گئی۔ تین دن اور تین رات، ورنہ وہ تو چھٹی سے دس منٹ پہلے ہی بیگ پیک کرتی اور اسکول سے نکلنے کے خیال سے خوشی کے بجائے اُسے کچھ اضطراری سی کیفیت لاحق ہوتی تھی۔ اُس وقت وہ کشور اور رومی کو بھی بھول چکی ہوتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جیسے اُس کی آنکھیں دور دیکھتیں..... بہت دور اور اُس پار سے واپس ہوتیں تو نا معلوم ان میں کیا ہوتا۔ تفکرات؟ اندیشے؟ نا امیدی یا کیا؟

شام کی چائے بن رہی تھی اور اُس کی خوشبو ویران اسکول میں پھیلی تھی، چوکیدار شیما اور رومی کو بلانے آیا۔ گیٹ پر ساحر کھڑے تھے۔

''آپ کب آئے؟'' دونوں حیرت آمیز مسرت سے بولیں۔ ''رات ہی آیا ہوں۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑے ''براڈوے بیکرز'' کے ڈبے دونوں کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ اسکوٹر پر شاپنگ بیگز رکھے تھے، اُس میں لاتعداد کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔

''یہ تم دونوں اور تمہاری دوستوں کے لیے'' دھیمے لہجے پر اطمینان مسکراہٹ غالب تھی۔

''تھینک یو! تھینک یو سو مچ۔'' شیما اور رومی بہت خوش تھیں۔ رومی نے اپنی بہت سی چیزوں میں سے کچھ چیزیں روبینہ کو بھی دیں۔ اُس کا چہرہ ویسا ہی رہا سپاٹ! رومی ''ایچ جی ویلز'' کے مترجم شدہ ناول اور ''تعلیم و تربیت'' کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ بہت خوش تھی یہ سوچ کر کہ بڑے بھیا اُس سے اور شیما سے ملنے اسکول آ گئے۔

کیمپنگ میں رومی کو رات کا وقت سب سے اچھا لگتا جب سب کاموں سے فارغ ہو کر سب کیمپ کے آگے بنے میدان میں آگ جلاتے اور اس کے گرد گول دائرے میں بیٹھتے۔ پہلے بلیو برڈز کا دائرہ اور پھر..... ان کے پیچھے گرل گائیڈز کا دائرہ۔ جن کے ساتھ ٹیچرز بیٹھی ہوتیں۔ سب مل کر گیت گاتے بلکہ دہراتے۔ عزم و ہمت کو قائم رکھنے کے گیت۔ اس کے بعد کبھی کبھی کسی کی ''سولو پرفارمنس'' اس گیدرنگ میں جان ڈال دیتی جیسے چونڈہ کی مارچ پاسٹ اور ملی ترانہ۔ لڑکیوں کا مختلف ٹیچر کی نقلیں اتارنا اور خلاف توقع ٹیچرز کا لطف اندوز ہونا، کسی لڑکی کا ملاقاتی رقص یا پھر سب کا انہی دائروں میں بیٹھ کر ''کھو کھلا چھپاکی'' کھیلنا۔ چاند نصف شب کے آسمان پر آجاتا

تو سب ہنستے کھیلتے اُٹھتے، روبینہ بھی! اسی آہستگی میں اٹھتی، جو اس کے رگ و پے میں سرائیت تھی۔ کسی بھی لطف اندوزی کا اُس کے چہرے پر شائبہ تک نہ ہوتا۔

ٹیچرز اور اُن کی سہیلیوں کے بستر اندر اسکول میں ایک کلاس روم میں لگے تھے۔ رُومی اور کشور اُن کو پانی دینے گئیں تو ذرا جھجکتی تھیں کہ وہ تخلیہ تھا اور ٹیچر کا تخلیہ تھا تو وہ غیر شعوری طور پر جھجکتی تھیں اور آنکھیں جھکائے جھکائے قریبی میز پر پانی رکھتی پلٹتی تھیں۔ تخلیے میں تکیوں سے ٹیک لگائے نیم لحاف اوڑھے بھی بجائے ایک دوسرے کا صرف نام لینے کے، اس وقت بھی، نصف شب کے بعد بھی ایک دوسرے کو مس رشیدہ، مس سعیدہ، مس شرمین کہہ کہہ کر پکار رہی تھیں۔

کیمپنگ اوور ہوئی۔ لڑکیوں نے ایک مقررہ وقت کے اندر اپنے سامان باندھے۔ خیمے اکھاڑ کر باہر کے میدان کی صفائی بھی کرنا تھی، اس کے بعد اُن سب کو ایک دن کی چھٹی تھی۔ روبینہ معمول کی چُپ سے زیادہ چُپ تھی۔ سب لڑکیوں کا سامان لینے لوگ گیٹ پر کھڑے تھے، بہت سی لڑکیاں جا چکی تھیں اور بہت تھوڑی لڑکیاں باقی تھیں یا صرف گرل گائیڈ انچارج کھڑی تھیں۔ روبینہ جھجکتے ہوئے رومی کی طرف جھکی۔

''تم...... تم میرے ساتھ یہ بیگ میرے گھر تک چھوڑ آؤ گی؟''

''گھر کہاں ہے تمہارا؟''

''یہاں ادھر گوالمنڈی میں ہی، زیادہ دور نہیں ہے لیکن...... دراصل میں اکیلی ہوں تو۔''

''ہم آدھے گھنٹے تک واپس آجائیں گے؟''

''ہاں! ہاں کیوں نہیں۔''

''دراصل باجی تو ہیں نہیں، مجھے گھر سے آدھے گھنٹے تک کوئی لینے آئے گا۔'' شیما اور جبین نہ جانے کس کا حساب چکتا کرنے نکل چکی تھیں۔

''ہم اس سے پہلے ہی واپس آجائیں گے۔ یہ ہلکا بیگ اِدھر ہی چھوڑ دو، میں واپسی میں خود لے جاؤں گی۔''

''چلو! ٹھیک ہے۔'' رومی نے اُس کا ایک بیگ اور کچھ سامان اٹھالیا۔ روبینہ کلاس میں سب سے زیادہ رومی سے ہی قریب تھی۔ یعنی جتنی بھی قریب تھی۔ رومی نے اس کے گھر والوں کی صرف باتیں سنی تھیں کہ ہم راتوں کے جاگے ہیں۔ ساری رات امام بارگاہ میں گزاری۔ امی اور میری بڑی بہن محرم کے کپڑے سلوا رہی ہیں۔ یہ سب عام سی باتیں تھیں جو عام لوگ کرتے ہی ہیں۔ رومی نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔

''گھر پر دراصل کوئی ہوتا ہی نہیں اس وجہ سے...... دراصل امی تو ''فلیش مین'' میں ہوتی ہیں۔''

''جاب کرتی ہیں وہاں؟''

''نہیں! رہتی ہیں، اکثر وہیں رہتی ہیں رات کو بھی۔''

''اور تمہارے بابا؟''

روبینہ سامنے دیکھتی سیدھی چلتی رہی۔ بالکل سیدھا! پھر کہنے لگی۔ ''میری بڑی بہن بھی اُدھر ہی ہوتی ہیں۔ میں اور بونی رات کو اکثر اکیلے ہوتے ہیں......'' رومی نے سوچا اس کے بابا بھی مر گئے ہوں گے، شاید تب ہی یہ اُن کے بارے میں بات نہیں کرتی۔

''یہ...... بس! یہ ہے میرا گھر۔ آؤ اوپر آجاؤ۔ ارے! دروازہ کھلا ہوا ہے۔'' رومی، روبینہ کے پیچھے اوپر

چڑھتی گئی۔ سامنے چھوٹے سے گندے سے صحن میں، گندے کپڑے پھیلائے ناٹے سے قد کی عورت کپڑے دھو رہی تھی۔ سپید رنگت، چپٹی ناک، بھرا بھرا جسم، کافی بڑے گلے کی کالی قمیض اور بے تاثر چہرہ، روبینہ کو دیکھ کر بھی اُس کا چہرہ ویسا ہی رہا اور رومی کو آتے دیکھ کر چہرے پر ہلکی سی ناگواری آئی۔ روبینہ سامنے بنے دو کمروں میں سے جن کے دروازے چوپٹ کھلے تھے ایک کے اندر اپنا سامان رکھ آئی۔ آنکھیں جھکائے شرمندہ شرمندہ سی ماں کے گھٹنے تک آتی بونی رومی کی موجودگی کے باعث اپنی ماں کے پیچھے چھپنے میں مشغول تھی۔ بونی کی چپٹی ناک، پھولا پھولا سفید چہرہ اور گھنے گھنگھریالے بال، ہو بہو اپنی ماں کی شباہت میں تھے۔ ماں جو ایک بیزاری میں کپڑے جھاڑ جھاڑ کر جھلنگا رسی کے اوپر ڈال رہی تھی۔

''میں دوسرا بیگ لے کر آتی ہوں اسکول سے۔'' ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ رومی کو کچھ عجیب سا لگا۔ پتا نہیں کیا؟ شاید روبینہ کی امی کی بغیر لائننگ کی کالی جارجٹ کی قمیض...... شاید روبینہ سے سرد مہری، واپسی کے راستے پر روبینہ بالکل خاموش رہی اور رومی بھی، پر رومی سوچ رہی تھی کہ سبھی دوستیں ضرور ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی ہیں...... خاص طور پر امتحانوں کے دنوں میں کسی نہ کسی کاپی کے نوٹس ادھورے لگتے تو لڑکیاں اسکول کے بعد یا شام میں گھر آ کر ایک دوسرے کی کاپیاں لے جاتیں، حتیٰ کہ وہ نالائق صبیحہ بھی جو اپنی دوست سے بھی لڑائی ہو جانے کی صورت یہ طعنہ سنتی تھی کہ ''اس کی امی نے اس کے چاچے سے شادی کرلی۔'' صبیحہ کا سفید چہرہ سپید پڑ جاتا اور یہ سنتے ہی وہ حق پر ہونے کے باوجود حق سے دستبردار ہو جاتی، نوٹس کی کاپی کیا چیز ہے؟ اور تو اور ایسے کسی نازک وقت میں ''بکرا عیدن'' تک شیر ہو جاتی اور بار ہا سنا سنایا قصہ پھر دہرایا جاتا کہ جب اس کے ابا مرے تو اس کی امی نے اپنے سے چھوٹے اس کے چاچے سے شادی کرلی۔ بکرا عیدن ہر بار سے بڑھ کر جوش جذبات میں غرق جب بھی یہ تذکرہ کرتی، ساری کلاس اک گہری شرمندگی میں ڈوب جاتی اور صبیحہ؟ صبیحہ ٹیچر کے آنے پر اُس روز مزید نالائقی دکھاتی کہ وقت پر کلاس ورک مکمل ہی نہ کر پاتی اور پیریڈ ختم ہونے سے دس منٹ پہلے نالائق، کام چور، غیر حاضر دماغ لڑکیوں کی صف میں کھڑی تابڑ توڑ ہاتھوں پر بید کھاتی۔ بید کھانے پر کوئی ہاتھ سہلاتا، کوئی سرخ ہاتھ بغلوں میں ٹھونستا، پر صبیحہ چپ چاپ زار زار روتی اور صاف لگتا کہ وہ صرف بید کھانے پر نہیں رو رہی۔ رومی کی دس میں سے آٹھ نمبر آنے کی خوشی بید کی آواز اور صبیحہ کی سسکیوں میں کہیں ڈوب جاتی۔ کبھی کبھی تو رومی کا دل بے طرح اوب جاتا اور اس کا دل چاہتا فوراً یہاں سے اُٹھے اور کہیں نکل جائے۔ ایسے ہی کسی دن اگر تانگہ لیٹ ہو جاتا تو کشور کے ساتھ دال سویاں لینے چلی جاتی۔ تنگ تنگ پیچ دار اندھیری گلیاں اور بہت آگے جا کر ابلتے ہوئے تیل کے سیاہ کڑھاؤ ہوتے جن میں دال، سویاں اور چپس پک رہے ہوتے۔ تیل سے اَٹے کالے سیاہ چیکٹ فرش پر چلتے رومی کا دم نکلتا پر کشور بے خوف و خطر چلتی رومی کو چپس اور دال کا گرم لفافہ پکڑاتی اور رومی سے پوچھتی۔ ''کرسمس ٹری دیکھو گی؟''

''کہاں ہے؟''

''ذرا سا آگے جا کر گلی میں گھر ہے وہاں۔''

''کوئی منع تو نہیں کرے گا؟''

''نہیں ہم کھڑکی سے دیکھ کر آجائیں گے۔''

''چلو! جلدی چلو تانگہ نہ آ گیا ہو؟'' وہ دونوں بھاگی بھاگی مزید تنگ گلیوں کے اندر گئیں اور پھر نیچی چھت

کے ایک چھوٹے گھر کے پاس کشور رک گئی اور چھوٹے رنگین شیشوں والی چھوٹی سی کھڑکی سے کشور نے ناک چپکا دی۔ ''آؤ دیکھو!'' کشور پیچھے مڑ کر جھجکتی ہوئی رومی کو آگے کرتی بولی۔ اندر کچھ چھوٹے بڑے، تیز رنگوں کے بلب روشن تھے اور کونے میں رنگ برنگے تحفوں سے سجا ''کرسمس ٹری'' جگمگا رہا تھا۔ رومی نے ''کرسمس ٹری'' سے نظر ہٹائی اور جم کر رہ گئی صوفے پر ''مسز نیلسن'' براجمان تھیں اور کچھ دوسرے لوگ بھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ ہنس رہی تھیں اور پہچانی نہ جاتیں تھیں کہ گہرے سیاہ چہرے میں جڑے سفید سفید دانت اُن کو اور بھیانک بنا رہے تھے۔ رومی غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گئی ''مسز نیلسن؟ مسز نیلسن بیٹھی ہیں اندر؟''

''ہاں! اُنہی کا تو گھر ہے نہ۔'' کشور آرام سے بولی۔

''اللہ توبہ! جو انہوں نے دیکھ لیا؟ جو یہ ہمارے اوپر بیٹھ گئیں...... اللہ جی معافی۔'' رومی پلٹ کر بھاگی اور کشور اس کے پیچھے، رومی پھولے دم کے ساتھ تانگے میں آ کر بیٹھ گئی۔ کشور نے بھی گیٹ کے پاس سے اپنا بستہ اٹھایا اور ہاتھ ہلاتی انہی گلیوں میں گم ہو گئی۔

ایک آدمی اسکول گیٹ سے ذرا پرے کھڑا روبینہ کے ہاتھ میں کچھ لفافے تھما رہا تھا۔ براؤن لفافوں میں شاید کھانے پینے کا سامان تھا۔ روبینہ کبھی بیگ ایک کندھے پر رکھتی لفافے سنبھالتی، کبھی دوسرے کندھے پر۔ پھر بونی کی انگلی پکڑ لیتی۔ بونی بھی تو ''کچی'' میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ سپلائی کی طرف سے گھر جا رہی تھی خلافِ توقع آج ذرا تاخیر سے سر جھکائے۔ آہستہ آہستہ بھاری بیگ کو کاندھے پر تولتی۔ بہت سے لفافے ایک ہاتھ میں اور دوسرے ہاتھ سے بونی کا ہاتھ تھامے سست قدموں سے جیسے وہ جانا نہ چاہتی ہو وہاں جہاں وہ جا رہی تھی۔

وقت گزرتا رہا اسکول میں اچھا کم اور بُرا زیادہ۔ رومی روزانہ گھر آ کر شکر کرتی۔ ٹیچی اُس کے آنے سے پہلے گھر آ چکی ہوتی تھی۔ اکثر دوپہر میں ٹیچی اور رومی ''برٹش کونسل صدر'' یا ٹیچی کے گھر کے سامنے کمپنی باغ سے ملحقہ میونسپل لائبریری'' چلی جاتی تھیں۔ جہاں ساحر نے بچوں کی سال بھر کی ممبر شپ فیس بھر وادی تھی۔ وہ جب بھی پنڈی آتے تھے تو رومی کو ''فیروز سنز'' لے جانا کب بھولتے تھے۔

گارڈن روڈ پر مشہور زمانہ وکلاء کے گھروں سے آگے ایک خاندان آ کر آباد ہوا۔ شاید ''سول سروس'' میں تھے میاں، پر خوب بھاری بھر کم اور پھر سونے پر سہاگہ کہ پیدل چلنے کے شوقین۔ حد درجہ منسلکر المزاج پر نہ جانے کس زیرک نے انہیں غور سے چلتے دیکھا اور ''ہلتی جُلتی'' کا خطاب دے دیا، نام تو اُن کا غازی تھا پر خطاب کچھ ایسا زبان زد عام ہوا کہ مشکل ہے کہ کسی نے اُن اصلی نام لیا ہو۔ ''ہلتی جُلتی'' کے گھر سے زردہ آیا تھا برتن لوٹا دیے؟ میلاد کا بلاوا دے دیا سب کو، ''ہلتی جلتی'' کی بیوی کو کہہ آئے تھے؟ تو اس نام پر پورے محلے کا اتفاق تھا۔

''ہلتی جُلتی'' کا ایک بچہ تھا جسے اکثر اُس کی امی، بلقیس باجی کے پاس چھوڑ آتیں۔ اڑھائی تین برس کا ہو گا بقول اُن کے ''سنبھل'' نہیں رہا تھا۔ سوچا یہاں ''بہل'' جائے گا، پر وہ جب بگڑتا تو کسی کے بہلائے سے نہ بہلتا۔ کبھی تو کسی کونے میں چپ چاپ کھڑا تکتا رہتا یا گھنٹوں روتا رہتا۔ سارے بچے اُس عمر میں آ چکے تھے جہاں سے دوسروں کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شوخ و شرارتی لڑکیوں میں سے ایک نے کسی دن اُسے ''ٹپر ٹپر'' تکتے پوچھ لیا۔ ''تم کون ہو؟'' بولا۔ ''میں محمود ہوں...... میں محمود ہوں...... میں محمود ہوں......''

دو اڑھائی گھنٹے کا ہوم ورک کر کے مہ فشاں اور رومی درخواست لکھوانے چھوٹے بھائی جی کے پاس جانے لگیں تو دیکھا محمود وہیں، اُسی جگہ کھڑا ایک ہی جملے کی تکرار کر رہا تھا۔ ''میں محمود ہوں...... میں محمود ہوں۔'' مہ

فشاں لمحہ بھر کو ٹھٹکی پھر بولی۔ ''تم محمود نہیں ہو۔'' وہ تو رومی کا ہاتھ پکڑ کر چھوٹے بھائی جی کی ڈیوڑھی میں اتر گئی مگر محمود ان کے ڈیڑھ گھنٹے پکارتا رہا۔ ''میں محمود ہوں...... میں ہی محمود ہوں۔'' خدارا! در و دیوار چیخ اٹھے پر محمود کا راگِ محمود نہ بند ہوا۔ اماں نے نوکر سے کہا۔ ''اس کا ہاتھ منہ دھلا دو اور اسے اس کے گھر چھوڑ آؤ۔'' منہ ہاتھ تو دھل گئے پر محمود چپ نہ ہوا۔ ملازم گلی کے راستے نکلا تھا اور پورے راستے محمود چلا رہا تھا۔ ''میں محمود ہوں'' پورے محلے کے بچوں کے ہاتھ ایک شغل آ گیا۔ ''مٹی کا مادھو'' محمود جہاں کھڑا ہوتا ''شودی'' اُس کی تاک میں ہوتا، اُس کے پاس سے گزرتے چپکے سے کہہ جاتا ''تم محمود نہیں ہو'' اور پھر اگلے تین گھنٹے کی ٹیپ چل پڑتی۔ ''میں محمود ہوں۔''

''ہاں! تم محمود ہو، اب چپ کر جاؤ۔'' اماں پیار سے پچکارتیں۔ ''نہیں! میں محمود ہوں۔''

''کس نے کہا ہے اسے کہ یہ محمود نہیں ہے۔'' آنکھ مچولی کی تیاری کرتے سب رک جاتے۔ ''یہ لڑکا نہ بولتا ہے، نہ کھیلتا ہے کسی کے ساتھ۔ ضرور کسی نے گزرتے ہوئے پوچھا ہو گا اس سے کہ تم کون ہو؟''

''نہیں! میں نے تو اسے کہا تھا کہ تم محمود نہیں ہو۔'' شودی غلط الزام برداشت نہ کر سکا اور سچ اگل بیٹھا۔

''ٹھہرو! میں تمہاری امی سے آج تمہارا بندوبست کرواتی ہوں۔'' بلقیس میدانِ جنگ میں کود پڑتیں۔ شودی پہلے ہی جاسوس ماموں کی مخبری پر زیر عتاب تھا گھر بھر کے کہ ہر جگہ دیکھنے پر بھی اُس کے جوتے نہ ملتے تھے۔ روز شام کو کھیل کر آتا تو ننگے پاؤں چلا آتا۔ جب جوتوں کا پوچھا جاتا تو جوتے ڈھونڈنے کے بہانے [illegible] جاتا۔ کئی دن یہی ہوتا رہا۔ ایک دن ''جاسوس ماموں'' نے بتایا کہ اس کے سارے جوتے [illegible] ہیں۔ ''جامن کے اوپر؟'' مون باجی نے تیوریاں چڑھائیں۔

ماموں کی مخبری غلط ہو سکتی تھی۔ انہیں ایک ہی تو شوق تھا خود کو سچا ثابت کرنے کا۔ شام ڈھلتے ہی ٹارچ سنبھالے چار کی پنچائیت ساتھ لیے، گھر کے قریب جامن کے پرانے درخت تک پہنچے اور ٹارچ ڈال کر روشنی کی۔ واقعی ایک موٹی چوڑی شاخ پر ''شودی'' کے جوتوں کے کئی جوڑے پڑے تھے۔ ماموں کے چہرے پر ایسا فخریہ نور تھا کہ جیسے کشمیر فتح ہو گیا ہو اور شودی...... اس کے سر پر لاتعداد جوتے برسے، وہ بھی جو پیڑ پر نہیں تھے۔

اُن دنوں میں جن لوگوں نے زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس ''بلیک لسٹ'' میں مس آمنہ، شودی، محمود اور ڈولی سرِ فہرست تھے۔ شام کو جب سب بچے اکٹھے ہوتے تو اکثر یہ سوال اٹھتا کہ انہیں ''شودی'' سے زیادہ نفرت ہے کہ ڈولی سے؟ عذاب جان ڈولی، ہر سال فرسٹ جو آتی تھی۔ رومی اور مہ فشاں کی ہم عمر تھی تو اُن دونوں پر عتاب زیادہ نازل ہوتا۔ وہ دونوں اُس کی مثال دینے پر بلکہ مثالیں دینے پر چیں بچیں رہتیں۔ پہلے تو خود ہی دونوں پر ''دردِ سر'' کی نوبت نہ آتی اور جو کبھی آ بھی جاتی اور کسی بڑی بہن یا بھائی کے آگے کتاب اور سوال دراز کیا جاتا تو گھورتی آنکھوں سے جواب ملتا۔ ''جب ٹیچر یہ سبق پڑھا رہی تھیں تو کدھر دھیان تھا؟ ہیں؟؟ اسکول کیا وقت ضائع کرنے جاتے ہو۔ چلو دھیان سے، غور سے اس چیپٹر کو پڑھو۔ جب پڑھو گے تو جواب بھی مل جائے گا۔ پہلے خود جواب نکالو پھر دیکھیں گے۔'' اور تو اور ایسے شاہی فرمان پر پورے گھرانے میں یکجہتی ہوتی۔ رومی اور مہ فشاں سر جوڑ کر سوچتیں کہ اگر یہ حساب والی۔ تینتیس، چونتیس، چھتیس والی سیریز کو نکال دیا جائے تو باقی ٹیکلس میں تو اچھے بھلے نمبر آتے ہیں پر توبہ، جو کوئی گھر میں حوصلہ افزائی کرتا اُلٹا ہر وقت ڈولی کی مثالیں ''ڈولی فرسٹ آئی ہے...... ڈولی فرسٹ آئی ہے۔''

''ہاں بھئی! نہ لائبریری نہ گیمز، نہ ڈرامیٹک سوسائٹی، نہ گرل گائیڈ، چوبیس گھنٹے اندھیرے اُجالے ہم بھی کتابوں میں سردے کر بیٹھے رہیں تو فرسٹ آ ہی جائیں بلکہ فرسٹ سے بھی آگے کچھ ہوتا تو وہ آتے۔ اچھی بھلی مارکس شیٹ ڈولی کے فرسٹ آنے سے دو کوڑی کی ہو جاتی ہے۔''

''میں بھی سیکنڈ، تھرڈ آ ہی جاتی ہوں۔'' رومی بسورتی۔ ''ہاں! لیکن فرسٹ تو نہیں آتیں۔'' رومی اور مہ فشاں میز پر کتابیں رکھے آج ہی کے نہیں پچھلے برسوں کے بھی پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔ امتحان تو گزر گئے اب نتیجہ آنا تھا۔ اتفاق کہ رزلٹ لے کر آنے والوں میں رومی اور مہ فشاں سب سے آگے تھیں۔ فاطمہ کو رزلٹ کی وجہ سے اسکول رکنا تھا اور باقی نفری نے تانگے میں آنا تھا۔ رومی اور مہ فشاں فارغ ہوئیں تو پیدل گھر کی طرف چل پڑیں۔ جیسے ہی گھر کے پاس آخری موڑ پر پہنچیں آٹھ دس لوگ منتظر ملے۔

''کیا ہوا؟ رزلٹ آ گیا؟ رزلٹ کا کیا بنا؟''

''جی رزلٹ آ گیا پر ڈولی فیل ہو گئی۔ اُسے اور دوسرے نالائقوں کو پرنسپل صاحبہ نے روکا ہوا ہے۔ وہ سب دیر سے آئیں گے۔'' مہ فشاں نے منہ پکا کر کے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' ''کیا ہوا؟''

''ڈولی فیل ہو گئی۔'' ایک سرے سے دوسرے سرے تک بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

''تم لوگ؟ تم لوگوں کا کیا بنا؟'' کسی ایک نے آواز بڑھائی۔

''میں تھرڈ آئی ہوں اور مہ فشاں کے بھی بہت اچھے نمبرز آئے ہیں۔''

''اچھا! اچھا شکر ہے۔''

''یہ دیکھیں انعام میں ملی کتابیں۔''

''ارے واہ! زبردست۔''

سب خوش تھے گھر والے چوں کے پاس ہونے پر اور مہ فشاں اور رومی جھوٹ کی وقتی کامیابی پر۔ نئی کلاس میں آئے چند روز ہی گزرے ہوں گے کہ مہ فشاں کے کارنامے نے تقریباً سب کا مستقبل تاریک کر دیا ہے۔

اسکول کی ہر لڑکی کی طرح اُسے بھی تو مس آمنہ سے پور پور نفرت تھی اور کیوں نہ ہوتی جو بلیک بورڈ پر لکھتیں وہ سمجھ نہ آتا۔ جو بولتیں وہ سر سے گزر جاتا۔ اُن کا پیریڈ ہوتا تھا کہ دکھ کی کالی رات جو نہ گزرنے کی قسم کھا کر آئی ہوتی۔ مہ فشاں کا سیکشن فرق تھا ایک روز جیسے ہی حساب کے پیریڈ کی بیل بجی تو دور سے مس آمنہ دکھائی دیں۔ میلا بدرنگ لون کا سوٹ گرد سے اٹی چپلوں میں سانولے سوکھے پاؤں، چہرے پر ازلی بدنصیبی جسے آنکھوں کا کیچڑ چار چاند لگائے رکھتا۔ رجسٹر کو سینے پر نامہ اعمال کی طرح لگائے چلی آ رہی تھیں، مری مری چال کے ساتھ۔ مہ فشاں کے من میں نہ جانے کیا سمائی، اٹھی اور کلاس روم کا دروازہ بند کر دیا بلکہ کنڈی لگا دی۔ آدھی لڑکیاں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں اور باقی خوف زدہ ہو کر بند دروازہ تک رہی تھیں کہ باہر سے مس آمنہ کی ہذیانی صدائیں اور ڈانٹ ڈپٹ مل کر عجیب ماحول بنا رہی تھیں۔ باہر کی دھکم پیل سے سالخوردہ کنڈی اٹک اٹک کر کھلتی دیکھ کر مہ فشاں کی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ دو چار سہیلیوں کو ساتھ ملا کر اندر سے دروازے کے پٹ بند رکھنے کی کوشش میں ہنستے ہنستے اچانک خوف سے پیلی پڑنے لگتی۔ بالآخر جیت باہر والوں کی ہوئی۔ دروازہ کھل گیا اور لعن طعن، ڈانٹ ڈپٹ کا طوفان مس آمنہ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

چلیں بڑی مس کے پاس۔'' مس آمنہ کی گول گول آنکھیں عالمِ طیش سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ سانولا مٹیالا بھبوکا ہو رہا تھا۔ بڑی مس کے دربار میں حاضری بڑی طویل ہوئی کہ جبین اور شیما بھی انہی کے آفس کے آگے کھڑی تھیں۔ اکثر کھڑی رہتیں تھیں پر آج ساتھ مہ فشاں بھی تھی۔ ''بڑی مس'' نے آرڈر جاری کیے کہ خاندان بلکہ اس محلے کی طالبات پر گہری نظر رکھی جائے اور یہ طعنہ تو پھر ہر ٹیچر کی زبان پر تھا کہ مس فاطمہ کی کے طفیل مہ فشاں کو اسکول سے نہیں نکالا گیا ورنہ؟

سہ ماہی امتحان ختم ہوئے اور اس مرتبہ سب بچے سوائے ڈولی کے تینتیس نمبروں سے نیچے تھا۔ سچ کہا بڑوں نے کہ مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ عظیم کو چھٹی مل گئی۔ فاطمہ جو اُن کو سب لڑکیوں کی باغیانہ سرگرمیوں سے آگاہ رکھتی تھیں۔ رپورٹ کارڈز لے کر کھڑی تھیں۔ سب کی پیشی ہوئی۔ شیما اور جبین کو آخری وارننگ تھی، اس کے بعد سب کا حساب کا ریشو دیکھ کر انہوں نے جو فرمان جاری کیا اُس سے بہتر تھا کہ سب کو ''کالے پانی'' کی سزا ہو جاتی۔ انہوں نے فرمایا۔ ''تم سب حساب میں محنت کرو اور اچھے نمبر لینے کی کوشش کرو ورنہ میں مس آمنہ سے شادی کر لوں گا۔''

سب نے سر جوڑ کر فیصلہ کیا کہ اپنی مدد آپ کے تحت حساب بہتر کرنے کی کوشش کریں گے۔ اللہ نہ کرے، خدا نہ کرے کہ مس آمنہ! اللہ شیطان کے کان بھرے......''

نیل کنول دور کھڑی خاموشی سے تماشا دیکھ رہی تھی۔ ''آپا جی'' کے اسکول میں پڑھنے کے باعث، بی۔ بی اسکول میں پڑھنے والوں کے دکھ سکھ سے بے خبر تھی۔ اکثر شانت رہتی تھی، جوار بھاٹے آخری الذکر والوں کے مقدر تھے۔ جب بھی تانگے والے کا بھنگی گھوڑا پھسلن چڑھائی کے نزدیک ہی پہنچتا تو مانو کلیجے منہ کو آنے لگتے۔ سب بچے باآواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیتے۔ راہ چلتے حیران ہوتے کہ نہ کوئی جنازہ نہ زلزلہ؟ یہ کلمہ شہادت کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ کلمہ طیبہ کی اونچی آوازوں میں۔ تانگے والے کے شہکارے، گھوڑے پر برستے چابک اور ساتھ شیما اور جبین کی عجیب و غریب بددعائیں۔ اللہ جی! مس انور کی شلوار کا ستیاناس ہو جائے۔ اسی ادھم پکار میں یا تو گھوڑا اچڑھائی چڑھ جاتا یا دبئی چوک سے پہلے پھسلن سے واپسی کا سفر اور پھر چاروں شانے چت۔ ٹڈنی اور پھڈنی اکثر ایسی صورتِ حال میں جانباز قسم کی چھلانگ لگانے کی ماہر ہو چکی تھیں۔ پائیدان سے سڑک کا فاصلہ کم ہی ہوتا تھا کہ تانگے پر سواریوں کے وزن سے پائیدان کافی جھکے ہوتے تھے پر تب بھی چھلانگ کو ایک جگرا چاہیے تھا۔ کم از کم پکی اور دوسری جماعت کی طالبہ کے لیے اور اگر خوش قسمتی سے تانگہ یعنی گھوڑا سالم تانگے بمعہ سواریوں کے چڑھائی چڑھ ہی جاتا تو تانگے والا موڑ پر کھڑا ہو کر ٹڈنی پھڈنی کا انتظار کرنے لگتا جو اپنے سر پر رکھے جوں کی چال سے اوپر آ رہی ہوتیں اور تانگے تک آ کر سب کی پھٹکار کھاتیں۔

انہی دنوں ٹڈنی اور پھڈنی ایک جُرمِ عظیم کر بیٹھیں کہ اسکول کے باہر جو چورن بیچنے والا کھڑا ہوتا تھا اُس نے جب سے سیاہ چورن میں آگ کا شعلہ بلند کر کے چورن کو سوختہ کرنا شروع کیا تھا تو چورن والے کے گرد چھٹی کے بعد ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ وہ مختصر سا جادو بچوں کو حیران کر دیتا۔ کچھ دن تو ٹڈنی پھڈنی باقی بچوں کی طرح منہ کھولے آنکھیں پھاڑے یہ چمتکار دیکھتی رہیں پھر رہ نہ پائیں اور کوئی بھی دوسرا وسیلہ نہ پا کر تانگے والے سے دو آنے ادھار لے کر اس چورن کا مزہ چکھنا چاہا۔ چورن والے تک رسائی بڑی دھکم پیل کے بعد ہوئی۔ دونوں بہنوں نے چورن کی پڑیا دو دن چلائی پھر ایسی لت لگی، چورن کھانے کی کہ یہ ہر دوسرے دن تانگے والے

کے آگے سوال دراز کرنا پڑتا۔ ہوتے ہوتے قرضہ ساڑھے چار روپے تک جا پہنچا اور وصولی کی صورت نہ پا کر تانگے والا ایک شام گھر آن پہنچا۔ پہلے تو بے وقت تانگے والے کو آتا دیکھ کر سب بچوں میں کھلبلی مچ گئی، جب ناتواں گھوڑا چابک کھاتا بڑے بھائی جی کی بیٹھک کے سامنے رکا اور رکا ہی رہا تو سب بچے اس سسپنس کی تہہ تک نہ لا کر دور دور سے آ کر کن سوئیاں لینے لگے۔ جاسوس ماموں نے بتایا کہ ٹڈنی پھڈنی کے کھائے چورن کا رنگ چوکھا آیا۔ محلے بھر کے نوکر ہنسنے لگے۔ جاسوس ماموں نے اندر اطلاع کر دی۔ بڑے بھائی جی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا جب دونوں لائن حاضر ہوئیں۔ ٹڈنی اور پھڈنی کی ناتوانی میں رچی سفلاہٹ میں مزید زردی گھلنے لگی۔ پیشی کے دوران دونوں کی ٹانگوں کی لرزش دور سے واضح تھی۔ دیگر متاثرین تانگہ مخصوص فاصلے پر کھڑے صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد گھوڑا پے در پے چابک کھا کر اسٹارٹ ہوا اور اس کے کافی دیر بعد ٹڈنی پھڈنی آنسو پونچھتی پلٹیں۔

ٹڈنی، پھڈنی کی عبرت آمیز ذلت پر باقی بڑے بھی بچوں کو نصیحتوں کے انبار سے لادنے لگے۔ ''قرضہ کبھی نہیں لینا چاہیے۔ جتنے پیسے ملتے ہیں اسی میں گزارہ کرنا چاہیے۔ چورن کس قدر صحت کے لیے خراب ہے، یہ تم سب لوگوں کو۔ سب گھر سے انڈا پراٹھا لے کر جایا کرو، اسکول کے باہر گندی چیزیں ملتی ہیں۔''

چھوٹے بھائی جی نے سب محلے داروں میں کھڑے ہو کر کہا کہ جلد ہی وہ اسکول کی پرنسپل کو درخواست دیں گے کہ اسکول کے باہر پھیری والوں کو کھڑا ہونے کی اجازت نہ دیں۔ بڑی دیر میں مجمع چھٹا۔ کسی نے بھی ٹڈنی پھڈنی کو چپ کرانے کی زحمت نہیں کی، جو پر چھتی پر چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ اُن کی امی نے بھی نہیں۔ خلقِ خدا کو صرف کچن کی چوکی پر بیٹھی دکھتی تھیں، رات گئے کچن سے جانے والی وہ آخری ذی روح ہوتیں اور بھی تڑکے فجر اٹھتا، چچی کو وہیں پاتا۔ بے تقدیری، سادگی اور وفاداری یکجا ہو جائے تو چچی جیسے لوگ ہی جنم لیتے ہیں۔ سردی گرمی صرف اور صرف چولہے کے آگے بیس سے پچیس لوگوں کا تین وقت کا کھانا پکاتے اور ہر روز پکاتے کسی کی بھی ویسی ہی شکل ہو جاتی تھی جیسی چچی کی تھی۔ سوکھی چمرخ جان، کھنچے نقوش، پسینے سے بار بار پھسلتی گرتی عینک جس کی کمانی کسی دھجی سے بندھی ہوتی تھی۔ ''ٹڈنا'' نو دس برس کا ہوگا اور ٹڈنی پھڈنی پہلی اور دوسری میں پڑھنے والیاں، پر چچی تو ساٹھ برس کی لگتی تھیں اور آواز! خدا معاف کرے ستر برس سے اوپر کے بوڑھے کی۔ کُل گھرانے کا خیال تھا کہ مرنے سے پہلے چچا کے دوسری شادی کرنے میں چچی کی اپنی بے وقوفیوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ یہ رائے عموماً خاندان کی اُن عورتوں کی ہوتی جو اپنی گھر گرہستی کے پھلنے پھولنے میں اپنی عقل کا ہاتھ سمجھا کرتی تھیں۔

پہلے، چچا نے چچی کو چھوڑا۔ دوسری، پھر تیسری شادی رچائی تب مرے کہیں جا کر، پر تینوں بچوں کی شکل صورت نہ بتاتی تھی کہ کبھی ان کا باپ زندہ رہا ہوگا۔ اُدھر چچی کی عقل کے ماتم کو نیا نکور تڑکا یوں لگا کہ ایک روز بڑے بھائی جی نے کہہ دیا کہ ''آج تم نے دال بہت لذیذ بنائی۔'' چچی کو سہاگ تو کیا پچتا تھا تعریف بھی نہ پچی! اگلے روز اترا کر پھر وہی دال بنا دی اور اُس سے اگلے روز پھر وہی دال...... تیسرے روز بڑے بھائی جی نے دال دستر خوان پر دیکھ کر وہ غل غپاڑہ کیا کہ چچی زندگی کی پہلی اور آخری تعریف بھلا کر جیٹھ کے آگے ہاتھ جوڑنے پر مجبور ہو گئیں اور ایسے کانوں کو ہاتھ لگائے کہ عمر بھر کو تائب ہو گئیں۔ پانچ چھ مہینے گزرنے کے بعد جب گھر والوں نے ''بگھاری مسور'' پکانے کو کہا تو ایک ہی حوالے کی تکرار اور پھر کہ ''بھائی جی ناراض ہوں گے'' وجہ بتائی، لا ک

نہیں وہی ایک بات کہ بھائی جی...... مون باجی کا پارہ چڑھ گیا۔ سر جھٹک کہنے لگیں۔ ''چھوڑ دو ...رنے دو جو کر رہی ہیں۔ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جنہیں نہ کسی بات کی خبر ہوتی ہے اور نہ وہ خبر ...جاتے ہیں۔''

...دنوں رومی وغیرہ کے گھر ٹی وی آ گیا۔ ایک عجوبہ کہ پیر کے روز جس کی چھٹی ہوتی تھی۔ اماں، بلقیس اور ...ریڈیو پر ''شب تمثیل'' کے وقت سب بچوں، نوکروں کو باہر نکال کر ڈرامہ سنتی تھیں اور بچوں کو یہ گھنٹے بھر کا ...آنکھ نہ بھاتا تھا اب! اب ان کی ریڈیو سے وابستگی ذرا گھٹنے لگی۔ اب ٹی وی جو آ گیا تھا، جو ہر گھر میں ...تھا؟ کسی ایک گھر میں تھا سو ڈرامہ دیکھنے اہلیانِ محلہ بھی آتے۔ ڈرامہ ہفتے میں ایک دن ہوا کرتا تھا پر بچے ...ویسے بھی تو آتے تھے، سو ڈرائنگ روم کے صوفے دیواروں سے لگا کر بیچ قالین کی جگہ کشادہ کر دی گئی۔ ...صوفوں پر بیٹھتے اور بچے نیچے قالینوں پر اور ابھی ٹی وی کا مور (پی ٹی وی کا مونوگرام) ساکت ہوتا کہ بچے ...بیٹھنے لگتے اکثر ''مور'' سے بھی پہلے کہ جب سیدھی سیدھی لائنیں آ رہی ہوتی تھیں، تب سے...... پھر کتنی ہی دیر ...مور کے پیچھے ہلکا سا میوزک بجتا اور کل بچوں کے چہروں پر رونق آ جاتی۔ تلاوت ترجمہ سُنا جاتا اور پھر خبروں ...بعد کارٹون چلتا۔ بمشکل تین منٹ کے لیے اور اس کے بعد بڑوں کی نصیحتیں شروع ہو جاتیں کہ بہت وقت ...ضائع کر لیا اب پڑھو سب بیٹھ کر۔

...مہ ناز نے ''مس آمنہ'' کے ساتھ خوش قسمتی سے سب سے کم وقت گزارا تھا کہ وہ داخل ہی ساتویں میں ہوئی ...تھیں۔ اب نویں میں آ کر اپنے تئیں اپنا بیڑہ تقریباً پار کر چکی تھیں۔ پر عظیم کی دھمکی کا اُن پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ ...بک شاپ'' سے ''حساب کے آسان فارمولے'' اٹھا لائیں جو گاہے بگاہے رومی، مہ فشاں، ڈولی، جبین کی ...شہناز، ٹڈنی، پھڈنی، شیما، جبین، ''آریہ محلے'' والی صبیحہ اور طاہرہ کے علاوہ لاتعداد لوگوں کے زیرِ تصرف ...گردش میں رہتی۔ حساب! نیل کنول کا مسئلہ نہ تھا۔ وہ حساب کتاب سے دور گویا قبر سے باہر تھی۔ رومی اور مہ ...فشاں نے تو اگلے تین مہینوں جان توڑ کر محنت کی۔ نمبر بھی قدرے بہتر آئے پر مس آمنہ کے ماتھے کی شکنوں میں ...ایک بھی کم نہ ہوئی۔ رومی جب بھی پڑھنے بیٹھتی ''حساب کے آسان فارمولے'' پہلے ڈھونڈتی اور پھر مانگتی ...بعض اوقات تو نیلچی کے گھر کی دیواریں پھلانگ کر ''کمپنی باغ'' کو شارٹ کٹ سے جا کر آپا حسین کے ہاں ...کہ ''جگنو'' بھی تو اُسی کتاب سے مستفید ہو رہا تھا۔

...منو بھائی کا گھر میں آنا جانا بڑھتا جا رہا تھا۔ ساتھ کزن بھی ہوتا تھا۔ رومی، مہ فشاں، نیلچی، ڈولی اور شہناز کو کیا ...ہوتی کہ ان دنوں ان سب کو تو لڈو کا جنون پاگل کیے رکھتا تھا۔ وہ تو شیما، جبین، مہ ناز اور تسنیم وہ سامنے لال ...والی پٹھانی، جس نے اب قد بت نکالا تھا اور ساتھ ہی گھر سے باہر قدم بھی، وہ چاروں اکثر اُن کے آنے پر ...ہو رہی ہوتیں۔ ''اُف! چیکو اب نہیں اٹھنے کے تین گھنٹے سے پہلے۔ چلو! ڈرامے کی بربادی ہوئی، ڈھیٹ! ...جب بلقیس باجی کا منہ اُدھر ہوگا تو کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے دونوں۔'' ہم عمر لڑکیاں آپس میں ...کرتیں اپنے پھپھولے پھوڑتیں اور ناگواری اُن سے چھوٹوں تک پہنچتی۔ وہ دور کے رشتہ دار تھے اور بقول ...کے انتہائی فرمانبردار و تابعدار کہ اکثر بہن کو سلام کرنے آ جاتے تھے۔ بلقیس کی اس بے ضرر رائے سے ...لڑکیوں میں سے کوئی بھی متفق نہ تھا حتیٰ کہ ہلکی سُن گُن ہونے پر فاطمہ اور اماں نے بھی لڑکیوں کی طرفداری ...پر بلقیس نہ مانیں۔ نیت کی طرح بدنظری بھی ایسی چیز ہے کہ اُسے صرف بھانپا جا سکتا ہے وہ بھی کہ، جس کا

واسطہ پڑتا ہے۔ منو بھائی نے بھی تو اشاروں کنائیوں میں یہ بتا کر حد کر دی کہ وہ شیما، جبین، تسنیم اور نیل کول ان کی دو تین دوستوں میں سے کسی پر بھی عاشق ہونے کی کلی صلاحیت رکھتے ہیں بس صنفِ نازک میں سے بھی راضی ہو جائے تو منو بھائی اور ان کے کزن کے لیے صنفِ نازک میں بھی خوب ہی کھنچتی تھی۔

چھت پر نیلے سمندر جیسے شفاف نیلے آسمان پر سرما کی مہربان دھوپ جگمگا رہی تھی۔ نیلچی کے اسکول میں کرسمس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ دیر سے اسکول سے آئی تھی اور آنے کے بعد "چیریٹی ورک" کے طور پر رومی کے ساتھ گھر جا کر کرسمس اور نیو ایئر کارڈز کو فروخت کرنا ہوتا تھا۔ رومی نے بھی دو بہت خوب صورت جگمگ کرتے کارڈ خریدے تھے۔ ایک میں خوب صورت نورانی چہرے والے Gesus ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے اور دوسرے کارڈ پر "میری" تھیں جن کے چہرے پر نور سے لکھا تھا کہ وہ خدا کے چنیدہ بندوں میں سے ہیں۔ نیلچی ان دنوں بہت مصروف تھی کہ رومی کو اتنی بات کرنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا کہ وہ پوچھے کہ یہ کارڈ وہ کس کو دے؟ نیلچی کے انتظار میں وہ چھت پر لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی۔ سورج ڈھلنے پر آیا تو اس نے کتاب میں "بک مارک" رکھا اور اٹھ کر بیٹھی۔ اسی اثناء میں اُس کی نظر ایک ٹوٹی کرسی پر پڑی جس پر سرما کے اتنے موسم بیت چکے تھے کہ اصلی رنگ روپ کھو چکی تھی۔ اُس کی ایک ٹانگ بیچ سے علیحدہ لٹک رہی تھی اور پلاسٹک کے تار بوسیدہ ہو کر جھولے کھا رہے تھے۔ رومی اٹھی اور کرسی کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ دل میں آنے والے اچھوتے خیال پر خود کو داد دی۔ اتنے میں مہ فشاں اوپر آگئی جب رومی نے اُسے اعتماد میں لیا تو اُس کی گول گول چھوٹی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

وہ دونوں کرسی کو اٹھا کر قریب لے آئیں اور خوب ٹھونک بجا کر دیکھا کہ اس کی مرمت کے لیے کیا کچھ چاہیے ہوگا۔ دونوں نے اسٹور کو چھاننا شروع کیا۔ سوت کا ایک گولہ مل گیا۔ وارنش اور پینٹ کا ڈبہ بھی گملوں کے پیچھے سے نکل آیا پر لاکھ ڈھونڈنے پر بھی برش نہ مل سکا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی کہ کون سا آج ہی سب کام ہو جائے گا۔ کسی سے مانگ لیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے اکڑی کرسی کو سیدھا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی جو خاصی مہنگی پڑی۔ یوں کہ اس کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ پہلے تو رومی اور مہ فشاں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔ پھر یہ سوچا گیا کہ جس عظیم مقصد کے لیے یہ تیار کی جا رہی ہے اُس حساب سے تو یہ زیادہ پرفیکٹ ہوگئی ہے۔ دل کو تسلی دیتے ہوئے باریک باریک کیلوں سے دونوں ٹانگوں کو برابر، برابر رکھ کر جوڑا گیا۔ ٹوٹی ٹانگوں کے جن حصوں سے لکڑی غائب تھی وہاں "فٹ رولر" کو توڑ کر فلنگ کی گئی۔ جب کرسی اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئی تو اب اسے سوت سے بننے کی باری آئی۔ سوراخ تو موجود ہی تھے، چنانچہ ایک کھلا کھلا سا جالا بن دیا گیا کہ اوپر تو کشن ہی آنا تھا۔ اگلے روز جب چھت پر وارنش اور پینٹ ہو رہا تھا تو اپنی چھت کے کونے پر کھڑے جاسوس ماموں سوچ رہے تھے کہ چلو اچھا ہوا یہ لوگ کسی ڈھنگ کے کام سے لگے۔ کرسی کو تیار کر کے پر چھتی کے کونے میں رکھ دیا گیا۔ اب دن گزاریں نہ گزریں۔ بالآخر وہ دن آیا کہ موٹر سائیکل اور اُس کے سواروں کا آنا ہوا، منو بھائی تھے مع اپنے کزن کے۔ سلام کرنے کے لیے باری باری سبھی آئے۔ رومی اور مہ فشاں سوچیں کہ اب کہا جائے کہ کرسی.....

"باجی! یہاں کرسی رکھ دوں؟" رومی نے پوچھا۔

"نہیں...... نہیں بس ادھر ہی بیٹھ جائیں گے صوفے پر، میں تو بستر میں ہی ہوں۔"

"باجی! خیریت؟" منو بھائی نے ذرا آگے ہو کر پوچھا۔

"بس! ذرا حرارت تھی۔" حرارت بلقیس کو تھی منہ، رومی اور مہ فشاں کے اتر گئے۔ "چلو! دوبارہ بھی تو آئیں گے"

کسی دن۔'' رومی نے آہستہ سے کہا۔
''اور اگر اس سے پہلے کسی نے پرچھتی سے کرسی نکال لی اور بیٹھ گیا تو؟؟ اس تو، سے آگے سوچنے کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ چار دن میں کرسی تیار ہوئی تھی اور نو دن انتظار کے بعد تو وہ آئے تھے۔ اتنے میں منو بھائی چائے سے پہلے پانی مانگ بیٹھے۔ تھوڑی سی پھنکری ملا دینے سے پانی کا تو کچھ نہ بگڑا البتہ منو بھائی کا منہ ضرور بگڑ گیا۔
''اے لڑکی! کہاں سے لائی ہو یہ پانی؟''
''اوہ! تیلے سے نکال لائی ہوں گی، نیم گرم ہے کیا؟'' بلقیس نے پوچھا۔
''نہیں نیم گرم تو نہیں تھا کچھ..... کسیلا سا تھا۔ لائیں یہ گلاس آپ مجھے دے دیں۔ میں آپ کو دوسرا پانی لا دیتی ہوں۔ مہ فشاں نے گلاس اُن کے ہاتھ سے لے لیا۔ شکر کہ بلقیس بستر میں تھیں ورنہ چکھ چکی ہوتیں۔
کرسی کی قسمت جاگنے کو زیادہ دن انتظار نہ کرنا پڑا۔ لاہور سے آئے مہمانوں سے کمرہ کھچا کھچ بھرا تھا۔ اتفاق سے یہ دونوں بھی آن وارد ہوئے۔ برآمدے میں لڑکیوں اور سہیلیوں کی ٹوٹل نفری موجود تھی۔ سو آنکھیں سینکنے اندر آئے۔ رومی اور مہ فشاں تو ان کی موٹر سائیکل دیکھتے ہی چار چار سیڑھیاں پھلانگتی پرچھتی پر جا پہنچی تھیں بلکہ برق رفتاری سے کرسی لا کر پردے کے پیچھے سیٹ بھی کر دی گئی تھی۔ دونوں کو برآمدے میں ہی کچھ زیادہ وقت جو لگ گیا تھا۔ ''غفور..... غفور؟ مہ فشاں، رومی، کنول؟ کدھر ہو بھئی، تم لوگ سُن کیوں نہیں رہے آواز کو؟ کرسی لا کر رکھو اِدھر۔'' بلقیس کی آواز آئی۔ نیل کنول پکارنے پر اندر گئی پھر بپا ہونے والی صورتِ حال کا سوچ کر ہی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ اُس کے جاندار قہقہے مثلِ صراحی سے پانی گرنے کے ہوتے تھے، جن میں ترنم کے ساتھ تسلسل تو ہوتا ہی تھا پر نوعمری کی بے لگامی بھی واضح ہوتی تھی۔ بلقیس نے جو اُسے اندر آتے یوں ہی منہ اٹھا کر اکیلا ہنستے دیکھا تو زوردار جھاڑ پلائی جس میں اُسے صرف سلام نہ کرنے کی پھٹکار سنائی دی۔ وہ ہنستے ہنستے بمشکل ہاتھ ماتھے تک لے کر گئی اور ساتھ ہی مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ باہر ہجومِ منتظراں نے دبے دبے تھپڑوں اور گھونسوں سے اُس کی خوب تواضع کی کہ جو قبل از وقت ساری اسکیم کا بیڑہ غرق کرنے چلی تھی۔ ''آئندہ اس کو پہلے سے کچھ نہ بتانا۔'' شیمانے ٹوکا۔ رومی اور مہ فشاں پکے منہ کے ساتھ کرسی سر پر اٹھائے کمرے میں داخل ہوئیں۔ مہ فشاں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ رومی کی آنکھوں کی گہرائی شرارت کے ہاتھوں جلدی ہار نہ مانتی تھی۔ جیسے ہی کرسی منو بھائی کے پاس رکھی چار پانچ لڑکیاں اکٹھی اندر آئیں۔ منو بھائی کے تو ہاتھ پیر پھول گئے کہ کس کو دیکھیں اور کس کو تاک لیں ''سلام کرنے'' کی مختصر مہلت میں؟ رومی نے سر جھکائے جھکائے کشن برابر کیا۔ منو بھائی آنکھیں سینکتے سینکتے بیٹھ گئے۔ لمحہ بھر ہی ٹکے ہوں گے کہ ''چراں'' کی پُرشور آواز سے کرسی کھل گئی اور ناٹے، ٹھگنے منو بھائی کرسی کے اندر غرق ہوئے ایسے کہ گھبراہٹ میں اوپر اٹھی ٹانگیں چلائے جائیں۔ ساتھ کہے جائیں ''لاحول ولاقوۃ..... بھئی! لاحول ولاقوۃ۔'' لاہور والے مہمان، لڑکیاں سب کی توجہ منو بھائی پر تھی۔
''اُفوہ! یہ کون سی کرسی آ گئی؟'' بلقیس کی جھلائی ہوئی آواز آئی وہ منو بھائی کے سر پر کھڑی تھیں پر منو بھائی جواب کے قابل کب تھے۔ بلقیس نے اور اُن کے کزن نے کھینچ کر انہیں کرسی سے باہر نکالا منو بھائی بمشکل کھڑے ہوئے اور کھڑے ہوتے ہی اپنے بال ماتھے پر جمانے لگے۔ خجالت سے منہ سرخ تھا پر نظریں ہنوز اُس دروازے پر تھیں جہاں سے ہنستی ہوئی بڑی لڑکیاں نکلی تھیں۔
''پتا نہیں بھئی یہ نوکر کرتے کیا ہیں؟ رومی مہ ناز سے کہوں چائے کا پانی رکھے۔'' بلقیس الجھ کر بولیں۔ لڑکیوں

نے رومی اور مہ فشاں کی خوب کمر ٹھونکی۔ مشن کامیاب ہونے کی صورت میں اُن دونوں کے اندر تو بجلی بھری تھی۔ دونوں نے اوپر جاتے جاتے کرسی کے باقی ہاتھ بازو علیحدہ کیے اور اوپر اسٹور کے گملوں کے پیچھے ڈال دی۔

مہمان رات گئے نکلے۔ غفور آتے جاتے جھاڑیں کھا رہا تھا۔ قسم اٹھا اٹھا کر کہہ رہا تھا کہ ''کوئی ٹوٹی کرسی ہے ہی نہیں گھر میں، صاحب نے بیٹھنے میں بے احتیاطی......''

''چپ کر ڈھیٹ...... شکر کرو کہ بچت ہوگئی کتنی بری بات ہوتی جو اسے زیادہ چوٹ لگ جاتی تو؟ ماں باپ کا اکلوتا ہے۔''

''تو جی! اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے کب دی تھی کرسی، میں تو......؟''

''تم لاپرواہی نہیں ڈھیٹ بھی ہو، پاگل کر کے رکھ دیں گے۔ ایک تو اتنے مہمان اوپر سے ان کی لاپرواہی۔''

''لاپرواہی۔'' غفور عجیب عجیب نظروں سے بلقیس کو تکتا، سر جھٹکتا باہر نکل گیا۔

''اب لڑکیوں کے حساب سے کم از کم دو ہفتے تو سکون کے گزرنے تھے کہ اُن کے خیال میں جو خجالت منو بھائی نے اتنے لوگوں بطورِ خاص لڑکیوں کے سامنے اٹھائی تو کم از کم دو ہفتے تو وہ ضرور گھر بیٹھتے پر ان کے تیسرے ہی دن وارد ہونے نے بتایا کہ انہوں نے کچھ زیادہ دل پر نہیں لی۔

ڈرامے کا ٹائم ہونے والا تھا۔ لڑکیوں میں ایک کھلبلی سی تھی۔ ''یار! کوئی نمک تو ڈالو ان کے پاس۔''

''نمک پر سورۃ الناس پڑھ لینا۔'' نیل کنول شربت دینے گئی تو پاس نمک بھی چھڑک آئی۔ واپسی پر نوید لائی کہ ''انشاء اللہ آج جلدی چلے جائیں گے۔ کسی کی شادی کا کارڈ دینے آئے تھے اور نئی موٹر سائیکل خریدی ہے تو وہ دکھانے آئے تھے۔''

''ان کو تو بس بہانہ چاہیے یہاں آنے کا، کوئی اندر نہ جائے تاکہ نامراد لوٹیں۔'' مہناز بولیں۔

''لو! تو غفور کو کہنا تھا نہ کہ وہ نمک گرا کر آتا۔'' نیل کنول برہم ہوئی۔

''یہ اتنی جلدی جلدی آنے کی کوئی سزا تو ہونی چاہیے۔ چھوٹی موٹی ہی سہی عندیہ تو پہنچے کہ ان کے یہاں آنے سے کسی کو خوشی میسر نہیں۔'' شیما بولی۔

''کیوں؟ امی کو کیوں بھول گئیں تم؟'' نیل کنول نے جواب دیا۔

''اچھا چھوڑو! کچھ کرتے ہیں کچھ تو سوچو؟''

''موٹر سائیکل کے ٹائر۔'' جبین بولی۔

''تاکہ انہیں یہاں رکنے کا اور بہانہ مل جائے۔'' شیما، جبین کی بات کاٹتی ہوئی بولی۔

''ہٹیں جی یہاں سے، بیگم صاحبہ پانی مانگ رہی ہیں۔'' شیما نے کرسی پرے کر کے راستہ دیا۔ غفور فرج سے پانی نکالنے لگا تو ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھی لڑکیوں کی نظر انگوروں پر پڑی۔ رومی بولی۔ ''گچھا اُٹھا لو۔'' تھوڑی دیر میں رومی، مہ فشاں اور نیلی تھڑے کے پاس کھڑے موٹر سائیکل کی سیٹ پر انگور ملنے لگیں۔ خوب اچھی طرح گھس گھس کر سیٹ پر ہینڈل پر ساتھ ساتھ پھونکیں مار مار کر سکھانے کا عمل بھی جاری تھا۔ انگور کم پڑ گئے تو مہ فشاں چپکے قدموں اندر جا کر ''گلو'' لے آئی جسے نہایت مہارت سے ملا۔ اب یوں لگ رہا تھا کہ سیٹ نئی ہونے کی وجہ سے چمک رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اندر سے سلام دعا کا غلغلہ اٹھا اور باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ جب بلقیس باجی باہر خدا حافظ کہہ رہی تھیں تو شیشوں والی کھڑکیوں پر کم از کم اٹھارہ آنکھیں جڑی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ)

سیما رضا ردا

نُوری کا چاند

ایسا بھی کیا اپنے کاموں سے عشق کہ تیرے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔'' اماں نے بیل اور دوپٹے کا سرا جو الجھتے الجھتے اس کے پیروں سے لپٹ گیا تھا کو دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ تو وہ کچھ نہ بول سکی اور کسی سوال کی طرح ان کو دیکھنے لگی......

عید کے رنگ لیے ایک حساس تحریر، افسانے کی صورت

سوالیہ نشان کی طرح زندگی ہر لمحہ اس کے ساتھ رہی تھی۔

باپ کو پوچھتے پوچھتے، وہ ہر لمحہ سراپا سوال رہی مگر ماں نے اُس کو کبھی مطمئن نہیں کیا۔ 'کیا یہ اتنا مشکل سوال ہے کہ ماں کے پاس اس کا جواب نہیں؟' اُس کا ننھا سا ذہن یہ سوچتے سوچتے بڑا ہوگیا۔

اُس کے دونوں چھوٹے بھائی اُس سے کتنے مختلف تھے۔ 'کیا یہ اس کے بھائی ہیں؟' پھر سوال اس کے سامنے آکھڑا ہوتا۔

ماں نے ہمیشہ بھائیوں کو اس پر فوقیت دی۔ اُسے یاد نہیں تھا کہ کبھی اُس نے تازہ روٹی سب سے پہلے کھائی ہو۔

"نوری یہ گھر کے مالک ہیں۔ بیٹا یہ ہمارے محافظ بنیں گے۔ ان کے کھانے پینے کا ہمیں زیادہ خیال رکھنا ہے۔"

"میرا باپ بھی تو میرا محافظ تھا، وہ کہاں گیا؟" یہ سوال اس کے ہونٹوں پر آتے ہوئے دم توڑ گیا اور اُس نے بہت آہستگی سے اپنی پلیٹ میں نکالا سالن دوسرے محافظ بھائی کے آگے کردیا اور خود پانی کے گھونٹ پی کر بھوک کو اپنے اندر مار کر اٹھ کھڑی ہوئی اور گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر سلائی کا کام بھگتانے لگی۔ آج شام تک اُسے یہ ساری سلائی مکمل کرنی تھی۔

مردانہ شلوار قمیض، لیڈیز سوٹ وہ بڑی مہارت سے سیتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صفائی اور سلیقہ تھا۔ اس کا کام سب کو پسند آتا۔

دن بہ دن گھر بڑھتے جارہے تھے۔ آمدنی میں اضافہ ہورہا تھا اور گھر کی غربت میں کمی آرہی تھی۔ ماں کے چہرے کے تھکن میں بھی کمی ہوگئی تھی۔

بھائیوں نے اسی افراتفری اور سختیوں میں اسکول کا منہ دیکھ لیا تھا اور میٹرک کرگئے تھے۔ آگے پڑھانے کی ہمت اماں میں نہ تھی اور نہ ہی بھائیوں میں کیونکہ تعلیم سے اُن کی محبت اتنی تھی کہ محلے کی لڑکیوں کو خط لکھ سکیں۔ اماں سے مانگ مانگ کر جمع کیے ہوئے پیسوں سے موبائل میسج کرسکیں۔ سو وہ وہی کررہے تھے۔

اور ایک وہ تھی جو خدمت گزاری کی تصویر بنی اپنی ذات سے بے پروا، آئینے سے بے نیاز انگلیوں کو فگار کرتی رہتی۔ آنکھوں کو بوجھل ہونے سے بچانے کے لیے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مارتی رہتی اور پھر اُس کے ہاتھ سلائی مشین کی موٹر پر پڑتے اور تیزی سے سوئی دھاگے کے ساتھ انسان کا ظاہری لباس تیار کرنے لگتی۔

"اب تک کتنے کپڑے سی چکی ہے وہ؟" سوال پھر تازہ دم ہوکر اُس کے دماغ میں آبیٹھا اور جواب میں وہ ہمیشہ الجھ جاتی۔ حساب کتاب کے چکر میں وہ کبھی نہ پڑی تھی۔ اماں نے یہ کھاتہ اپنے حساب میں رکھا تھا۔

☆......☆

وہ چیک دار قمیض کا مردانہ کالر بڑی خوب صورتی کے ساتھ بکرم کے ساتھ بٹھا رہی تھی۔ بشریٰ اُس کے پاس آکھڑی ہوئی اور اُس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ اپنے کام میں اتنی محو تھی کہ اُسے احساس تک نہ ہوا۔

"سہیلی کبھی اِدھر اُدھر بھی نظر دوڑا لیا کرو، کب سے تمہارے دیدار کو بیٹھے ہیں۔" اُس کے لہجے کی مٹھاس اور شکایتی انداز اُس کو تازہ دم کرگیا۔

"کب آئیں تم۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا؟"

"تمہیں کیوں پتا چلے گا۔ ورنہ اتنے اچھے کپڑے کیسے سلتے۔" وہ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

نوری نے اس کو غور سے دیکھا۔ شادی کے بعد وہ کتنی نکھر گئی تھی۔ بچپن ان دونوں نے ساتھ گزارا اور

پھر جوانی کی سرحدیں طے ہوتے ہی اس کی ماں نے اپنے بھائی کے بیٹے سے پہلے بات طے کی اور پھر سال ہی میں اُسے نمٹا دیا۔

"تو خوش تو ہے نا؟" نوری نے اس کو خوش دیکھ کر بھی سوال داغا۔ شاید وہ لاشعوری طور پر سوال کرنے کی عادی تھی۔

"کیوں میں تجھے خوش نہیں لگتی کیا؟" وہ دل کھول کر بے وجہ ہنستے ہوئے اُلٹا اسی سے پوچھ بیٹھی اور وہ اپنے سوال کا جواب نہ پاکر اُلٹا اسی کو دیکھے گئی۔ پھر اُسے دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

آنسو کچھ دیر اُس کی آنکھوں میں ٹھہرے اور پھر قطرہ قطرہ چہرے پر موتیوں کی طرح بکھرتے چلے گئے۔ اُس کا پورا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔

بشریٰ اُس کی بچپن کی ساتھی تھی۔ اُس کے دکھ میں ہمیشہ ساتھ رہی تھی۔ اس کے مزاج کو سمجھتی تھی۔ اس کی زندگی کے رموز سے آشنا تھی۔ بہت دنوں بعد ہمدرد پاکر وہ بکھر گئی اور بشریٰ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی۔

"ہائے میں بھی کتنی بری ہوں ناں۔ تجھے سسرال جاکر بالکل ہی بھول گئی۔" وہ اُسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔ "سچی امجد اتنی محبت کرتے ہیں ناکہ تجھے کیا بتاؤں۔ میرا ابھی ان کے بغیر یہاں دل نہیں لگتا۔"

"اٹھارہ سالہ پیار و محبت، امجد کیسے لے گیا؟" وہ حیران حیران اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"جب تیری شادی ہوگی نا تب پتا چلے گا کہ شوہر کا پیار کیا ہوتا ہے؟" وہ اسے احساس دلاتے ہوئے بولی۔ "وہ تجھے اتنے ناز سے رکھے گا کہ تجھے خود پر غرور آئے گا، پیار آئے گا۔ تیرے پاس وقت ہی نہیں ہوگا کسی سے ملنے کا۔ یہ سب تجھ سے چھڑا دے گا۔" وہ اس کے پاس بکھرے کپڑوں کا ہجوم دیکھ کر بولی۔

وہ اس کی باتوں میں اتنی محو ہوئی کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ پھر اُس کا شوہر امجد اُسے لینے آگیا۔ اُس کی آنکھوں میں بشریٰ کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے اُس سے نہیں ملی۔

"دیکھی ان کی بے قراری۔" بشریٰ نے اُس کو ٹہوکا دیا۔ تو وہ امجد کی طرف دیکھ کر جھینپ گئی۔ واقعی اُس کی آنکھوں اور چہرے پر بشریٰ کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ ایک الگ جذبہ تھا جو نوری کے لیے اجنبی تھا۔ اُس جذبے سے وہ واقعی انجان تھی۔

اور پھر بشریٰ امجد کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی مگر نوری کو حیران کرگئی اور اُس کے اندر لاتعداد سوالات چھوڑ گئی۔

وہ سوچتی رہی کہ یہ کیسا پیار تھا؟ بشریٰ کتنی پیاری ہوگئی ہے؟ کتنی بدل گئی ہے۔ اُس کا چہرہ کتنا مسکراتا ہوا لگ رہا تھا۔ اُس کی کھلکھلاتی ہنسی کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ اُس کے کپڑے، اُس کے جھمکے...... سب بہت اچھا تھا۔

"کیا صرف ایک آدمی کی محبت نے اُس کو بدل دیا۔" بشریٰ کے انگ انگ سے محبت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ نوری کے تصور میں اُس کے شوہر کی والہانہ نظریں گھوم رہی تھیں مگر وہ نظریں اب وہ خود پر محسوس کررہی تھی۔

'کیا یہ نظریں میرے لیے بھی ہوسکتی ہیں؟' وہ اچانک آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور آئینہ سچ بولنے لگا۔

گہری سانولی رنگت، عام سے نقوش، دس سال کی عمر سے سخت جان ہاتھ، بے رنگ چہرہ، گھنگھریالے کالے بال مگر آنکھوں کی خوشگواریت قدرت کی دین تھی، اس پر کالی بھنور آنکھوں پر پلکوں

کی لمبی جھالر اُسے منفرد بناتی۔ مگر اُسے اپنے حسن کا احساس ہی نہیں تھا۔ مشینی زندگی گزارتے گزارتے وہ خود مشین بن گئی تھی۔ کبھی خود کو سنوارنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ جو اماں نے پہنایا پہن لیا۔ جو کپڑے اماں لے کر آتی وہ اُن کو سی کر زیب تن کر لیتی۔ رنگ، ڈیزائن، فیشن اِس سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"میں ایسی کیوں ہوں؟" وہ آئینے سے پوچھ بیٹھی۔

آئینہ اُس کے گزرے ماہ و سال کا حساب شاید دے دیتا مگر اماں کی کڑک دار آواز اُسے اجنبی خیالات و احساسات سے باہر لے آئی۔ وہ چونک کر اطراف میں دیکھنے لگی۔

"وہ کہاں تھی؟ یہ کون سی دنیا تھی؟ وہ آئینے کے مقابل تھی۔ اُس دنیا سے اِس دنیا میں آنے میں اُسے کتنا فاصلہ لگا۔ یہ اس نے کب سوچا مگر وہ حیران تھی کہ اب سے تھوڑی دیر پہلے اُس نے کہاں کی سیر کی تھی؟ سوالات کا ہجوم اُس کے پاس تھا مگر وہ بے بس؟

"سن۔" اماں نے اُسے بلایا۔ وہ جمعۃ المبارک کے کپڑوں کا ڈھیر لیے بیٹھی تھی۔ وہ بے دھیانی میں اماں کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ میچنگ بیل کا سرا اُس کے پیروں سے اُلجھتے الجھتے پیروں میں لپٹ گیا۔ وہ اپنے کاموں میں یونہی گم ہو جاتی تھی۔ اُسے ہوش نہیں رہتا تھا۔

"ایسا بھی کیا اپنے کاموں سے عشق کہ تیرے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔" اماں نے بیل اور دوپٹے کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ نہ بول سکی اور کسی سوال کی طرح اُن کو دیکھنے لگی۔

"تیرے بھائی تو اسٹال لگا رہے ہیں۔ جمعہ بازار میں ریڈی میڈ گارمنٹ کا۔ مجھے اُن کے ساتھ لگنا پڑے گا۔ عید بھی قریب ہے۔ اچھا ہے چار پیسے ہاتھ آجائیں گے۔" وہ بات کرتے کرتے ہانپنے لگیں۔ تو اُس نے اماں کو نورا پانی پلایا۔

"جیتی رہ۔" وہ افسردگی سے بولی تھیں۔ اُسے اماں کے لہجے کی آزردگی سمجھ نہ آئی۔

"اماں میں جاؤں۔"

"ارے سُن! میں نے کس لیے بلایا تھا تجھے، پتا نہیں کیوں بھول گئی ہوں۔" وہ کچھ دیر رکیں پھر جیسے انہیں یاد آگیا۔

"ہاں، تو سڑک پار کر کے دلشاد بیگم کے ہاں چلی جانا۔ کچھ پیسوں کا حساب باقی ہے، لے آنا۔ میں نے اُن سے بات کر لی ہے۔"

"لیکن اماں۔" اُس نے کہنا چاہا، بھلا وہ کیسے جاتی کہ وہ تو ہمیشہ اماں کی انگلی تھام کے باہر نکلی تھی۔

"ارے کیا زندگی بھر میرے پلو سے بندھی رہے گی تُو۔ جا جا کر محنت کے پیسے لے کر آ۔" اماں کی آواز میں کمزوری تھی اور بات کرتے ہوئے سانس پھول رہی تھی۔

☆.....☆

وہ خود کو اچھی طرح لپیٹ کر گھر سے نکلی تھی۔ گلی کے کونے سے سڑک کے اُس پار اُس کو جانا تھا۔

یہ راستے، یہ گلیاں اُس کے لیے اجنبی نہ تھے۔ وہ بچپن سے ان راستوں سے آشنا تھی مگر اب جوانی کی سبز بیل نے اُس کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس لیے اُس کے قدموں میں اور چال میں کنوار پنے کی جھجک تھی اور وہ تو تھی بھی حیا کی پوٹلی۔ بوقتِ ضرورت ہی اُن کو اُٹھاتی تھی۔ وہ سر جھکائے، آہستہ قدموں سے دلشاد بیگم کے گھر چلی گئی۔

چوکیدار نے اُسے اُن کے پاس پہنچا دیا تھا۔

دلشاد بیگم صوفے میں دھنسی ٹی وی کا ریموٹ گھما رہی تھیں۔ اُن کی انگلیوں کو کسی پل چین نہ تھا۔ نوری کو دیکھ کر وہ مسکرا دیں اور بہت اپنائیت سے بولیں۔

"ارے تو نُوری ہے، اماں نسیمے کی بیٹی۔ بہت ہنر ہے تیرے کام میں۔ بڑا سلیقہ ہے تیرے ہاتھ میں۔ یہ تیری اماں نے تجھے چھپا کر کیوں رکھا ہے۔"

وہ اُس کو دیکھ کر حیران تھیں۔ اماں نسیم اس کے بارے میں اکثر انہیں بتاتی رہتی تھیں۔ وہ سر جھکا کر اُن کی باتیں سنتی رہی۔

"ارے بیٹا باہر نکلو، اماں کو گھر میں بٹھاؤ۔ وہ بیمار پڑ گئی ہے چل چل کر۔"

"جی!!" وہ بس اتنا ہی بول پائی کہ دلشاد بیگم جھٹ سے بولیں۔

"بس اتنا ہی بولتی ہو تم۔ خیر جب ہی تو تمہارے کام میں ندرت ہے۔" اُس کے چھوٹے سے دماغ میں اُن کی یہ بات قطعی پلے نہ پڑی تھی۔ زبردستی انہوں نے اسے ٹھنڈا ٹھار شربت پلایا اور کپڑوں کا معاوضہ دیا اور نئے کپڑوں پر اس کی رائے معلوم کرنے لگیں اور یہ موضوع ایسا تھا جس پر وہ سنجیدگی سے گفتگو کر لیتی تھی۔

وہ بہت مطمئن ہو گئیں اور اُسے دعا دے کر رخصت کیا۔

اور پھر وہ آہستہ آہستہ اماں کے کام بھی نمٹانے لگی۔ اب راستے اس کے لیے ناآشنا نہیں رہے تھے۔ اس کی چال میں تیزی بھی آنے لگی تھی اور اُسے ٹھوکر لگنے کا بھی اندیشہ نہیں تھا اور اب وہ آنکھیں کھول کر سامنے والے سے مکالمہ بھی کر لیتی تھی۔

☆.....☆

وہ شاید عام سا دن تھا۔ جب احمد علی نے اُسے مخاطب کر ڈالا۔

وہ اپنی دھن میں نئے اَن سلے کپڑوں کا بنڈل تھامے گلی سے بہت دور تھی کہ "نُوری سنو" کی آواز پر وہ چونک کر ٹھہر گئی مگر اُس کو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ 'میرا نام کسی اجنبی کے ہونٹوں پر کیسے آیا۔' وہ دم بخود تھی۔

"حیران مت ہو، میں تمہارا نام جانتا ہوں۔" وہ اس کی حیرانگی کی وجہ سمجھ چکا تھا۔ "اور تمہیں بھی۔" احمد علی نے اُس کی حیرانی کم کرنا چاہی تھی۔

"تم پہلے دن جب اپنی اماں کے بغیر یہ روڈ کراس کر رہی تھیں۔ تب میں نے ہی تمہیں دیکھا تھا۔ تم اچھی لگتی ہو، اس لیے پکار بیٹھا۔"

نُوری نے اپنی پلکوں کی جھالر اُٹھا کر بمشکل اُسے دیکھا۔

'میں اِسے کب اچھی لگنے لگی؟' اُسے اعتبار آ کے نہ دیا۔

"کیوں؟ میں کیوں؟" وہ اُلجھنوں کے حصار میں تھی۔

"بس دل کے اچھا لگنے میں کیوں کا سوال نہیں ہوتا۔ تُو روز آتی جاتی تھی اور میں تجھے آتے جاتے ہوئے دل میں بسا بیٹھا، نُوری میری طرف دیکھ کر بات کر۔" اُس کے انداز اور لہجے میں اتنی شیرینی گھلی ہوئی تھی کہ اُسے پھر جھٹکا لگا کہ اس طرح بھی کوئی بات کر سکتا ہے۔ اُس کی آواز پر وہ مقناطیس کی طرح گھوم گئی۔ وہ اُس کے بالمقابل تھا۔ گھنگھریالے بالوں والا، سانولی رنگت پر گہری کالی مونچھیں لیے وہ مسکراتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرا نام چاند ہے۔ میں تم سے دو محلے پیچھے رہتا ہوں۔ سامنے میری دکان ہے۔ تم نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میں تو تمہاری راہ میں سر جھکائے، دل بچھائے تمہارے لیے سراپا انتظار ہی رہا مگر تم دیکھتی ہی نہ تھیں۔ بس آج میں بے بس ہو گیا۔"

بے بسی کی تصویر تو وہ بنی کھڑی تھی۔ نہ آگے جا سکتی تھی نہ پیچھے۔ اُس کے اندر بسی جیسے مصنوعی مشینی دنیا ڈھ چکی تھی۔ وہ اتھل پتھل کا شکار تھی۔

وہ کیسے اور کس طرح گھر پہنچی اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ آج اُس کے اندر ایک نئی نُوری نے جنم لیا تھا۔

نُوری کو جیسے اپنے آپ سے ایک دم پیار ہو گیا تھا۔ وہ پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اُس کی آنکھوں کی چمک یکدم جیسے بڑھ گئی تھی۔ چہرے کی بے رونقی کہیں روپوش ہو گئی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کے خم مسکرا اُٹھے۔

اُس نے محبت کو مسکرا کر خوش آمدید کہا اور آنے والے دنوں کے خواب بننا شروع کر دیے۔

☆.....☆

وہ صبح سویرے گھر کے سارے کام نمٹا کر، سلائی مکمل کرتی۔ اماں کو دوائیں دیتی پھر بھائیوں کو رخصت کر کے کھٹا کھٹ سلائی کے کپڑوں کو استری کر کے اچھی سی پیکنگ کرتی اور گھروں کے سپرد کرتی جاتی۔

اُس کے سلے ہوئے کپڑوں کی دھوم، ایک گھر سے دوسرے گھر اور پھر محلے سے ہوتی ہوئی پوری کالونی میں پہنچ چکی تھی۔

پڑوس والی خالہ شمو اماں کی طبیعت کا پوچھنے آئیں تو ان کے پاس بیٹھ گئیں۔ حال چال پوچھتے ہوئے بولیں۔

''تیری نُوری تو بہت سلیقہ مند ہو گئی ہے نسیمے۔ دیکھ تو سہی کتنی جلدی اِس نے تیری جگہ سنبھال لی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہنر بہت ہے۔ بس اب تو اِسے نمٹانے کی سوچ۔ آج کل تو نُوری اچھی بھی بہت ہو رہی ہے، ماشاءاللہ۔''

اماں نے اُن کی بات پر غور کرتے ہوئے نُوری کو دیکھا اور اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بڑی اچھی تراش خراش کے ساتھ لان کا سوٹ پہنے، آنکھوں میں کاجل کے ڈورے لگے تھے اور لمبی چوٹی آگے پڑی ہوئی تھی اور چہرے پہ انجانی سی خوشی تھی۔ شاید باہر نکلنے لگی ہے تو آزادی راس آ گئی ہے۔ ورنہ اسے دنیا کی کیا خبر تھی۔ اُن کی سوچ میں کئی ناگ در آئے۔

''میری مانو تو کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اُس کے ہاتھ پیلے کر دو۔'' خالہ نے مشورہ دیا۔

اماں اُن کی بات پر سر ہلا کے رہ گئی اور وہ ان تمام باتوں سے انجان باہر نکلنے کو بے تاب تھی کہ چاند سے ملنا تھا اور وہ اس کی راہ تک رہا تھا۔

☆.....☆

آتے جاتے خوب صورت آوارہ سڑکوں پہ
کتنے انجان لوگ مل جاتے ہیں
اُن میں سے کچھ لوگ بھول جاتے ہیں
کچھ یاد رہ جاتے ہیں

کشور کمار کی آواز گونج رہی تھی اور نوجوان، منچلے لڑکے مصروف تھے۔ ہم آواز ہو کر شغل کر رہے تھے۔

وہ موسیقی کے ردھم پر گزرتی چلی گئی۔

''لے بھائی چاند تیرا ریشمی رومال آ گیا۔'' کسی کے چھیڑنے پر اپنے کام میں مگن چاند چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ وہ مسکراتی، لجاتی شرماتی سر جھکا کر چلی آ رہی تھی۔ چاند کے دل کی حالت سب پر عیاں تھی۔ سارے یار دوست اُس کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگے۔ نوری ان سب کے درمیان سر جھکائے گزر گئی اور چاند چوری چوری اُسے جاتا دیکھتا رہا۔

''ارے واہ میرے یار۔'' سی ڈی پلیئر دکان کا حامد بیگ اُسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

''تیرے دل کی کیا کہنی..... محبت بھی کی تو اپنے پیشہ کا منصب دیکھا۔''

''واہ یار! ہماری ہونے والی بھابی بھی ماسٹرنی جی نکلیں۔ خوب جوڑی جمے گی۔'' ایک اور منچلا بولا تھا۔

''تُو تو بڑا ہیر و نظر آنے لگا ہے۔ یہ عشق نے کیا

تمال کیا ہے۔ تو پھر اپنی اماں سے بات کرنا کہ تیرے سر پر سہرا سجا دے۔ یا پھر ہم سب مل کر درخواست کریں کہ خالہ تمہارے بیٹے نے اپنے لیے چاند نی پسند کر لی ہے۔''

سب کے مشترکہ قہقہے گونج رہے تھے اور وہ خوشیوں کی رہ گزر پر چلتی اپنے کام تیزی سے نمٹا رہی تھی اور چاند اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس عید کو یادگار بنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆.....☆

مگر بیٹا، میں اس کی اماں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ جو رشتہ نُوری کے لیے جاتا ہے اُس کی اماں منع کر دیتی ہے۔''

''کیوں اماں۔'' چاند حیران و پریشان ہو کر بولا۔

''پتا نہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اُس کے ساتھ کی لڑکیوں کی شادیاں ہو رہی ہیں مگر اُس کی ماں کو احساس نہیں ہوتا۔ کچھ کہتے ہیں شاید ان کی ایک بیٹی ہے اس لیے۔''

''پھر بھی اماں تم رشتہ لے کر تو جاؤ۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے اماں۔ عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔'' وہ منت کرنے لگا تو اماں کو جیسے اُس پر ترس آ گیا۔

''جاؤں گی بیٹا، ضرور جاؤں گی۔ آخر تو میرا چاند ہے۔'' ماں نے اُس کو یقین دلایا۔

وہ کچھ امید و نا امیدی کی ناؤ کا مسافر بنا دعا گو تھا کیونکہ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسی کوئی رکاوٹ سامنے آئے گی۔

نوری کے بارے میں، اس کے سلیقے، اس کے ہنر کے قصے اس نے سنے تھے کہ وہ اُسے بغیر دیکھے اپنانے کا خیال کر چکا تھا۔ کچھ اُس کی رشتے کی بھابی نے چھیڑ چھاڑ کر اُس کے خواب اور احساسات کو پختہ کر دیا تھا کہ لڑکی بھی سلائی کڑھائی میں ماہر ہے اور اپنا چاند بھی زبردست ٹیلر ہے۔ اس مہنگائی کے دور میں دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو خوب چلائیں گے۔ زندگی کا سفر اچھا گزرے گا۔''

وہ اپنی بھابی کی باتیں سُن سُن کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ کبھی خوابوں میں اور کبھی جاگتے۔ میں وہ سوچتا تھا کہ نوری اور وہ ٹیلرنگ کی بہت بڑی شاپ کے مالک ہیں۔ انہوں نے بہت ورکرز رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کی دکان شہر کی سب سے بڑی اور مشہور دکان ہو گی۔ نوری کی ذہانت اور سلیقہ اُس کی زندگی میں چار چاند لگا دے گا۔ جانے کتنے خواب اُس نے بُن لیے تھے مگر اماں کی باتوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بہت پژمردہ ہو گیا تھا کہ کہیں خواب اُس سے روٹھ نہ جائیں۔

☆.....☆

بشریٰ رمضان کا چاند دیکھنے آئی تو اُس سے ملنے چلی آئی۔ نُوری باورچی خانے میں اماں کے لیے مرغی کی یخنی بنا رہی تھی۔ بشریٰ کو دیکھ کر وہ آسودگی سے مسکرا دی۔

''چاند مبارک ہو رمضان کا۔'' یہ کہہ کر وہ نُوری کے گلے لگ گئی۔

اماں نے بشریٰ کو غور سے دیکھا۔ ایک نئی تبدیلی اُس کے وجود سے ظاہر تھی۔ ایک انوکھا رنگ چہرے پر لیے وہ بڑی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اماں کو سلام کر کے اور ان کا حال پوچھ کر نُوری کے چھوٹے سے کیبن نما کمرے میں چلی آئی۔

دونوں کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھیں۔ پہلی رمضان کا باریک سا چاند نظر آیا تھا۔ نوری نے دعا مانگ کر اس کی طرف دیکھا تو بشریٰ کو اس کی آنکھوں میں نمی نظر آئی۔

''پاگل نہ ہو تو۔'' بشریٰ نے اُسے گلے لگا لیا۔

''میں خوب سمجھتی ہوں تیرے درد کو۔ چاند بھائی کو

میرے امجد نے ہی تیری طرف بھیجا تھا۔ یہ اتنی شکل جو نکھر گئی ہے اسی وجہ سے ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، تُو فکر کیوں کرتی ہے۔'' وہ سمجھانے لگی تو نوری نے کہا۔

''نہیں نا، اماں ناراض ہو رہی ہیں۔ وہ نہیں مان رہیں اور نہ مانیں گی؟'' اُس نے اصل وجہ بتائی۔

''کیوں بھئی، کیوں نہیں مانیں گی۔ آخر کولڑکی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ہائے میری اماں کو تو نیند نہیں آتی تھی بس انہیں تو ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح میری رخصتی کر دیں۔ اب دیکھ وہ اکیلی رہ گئی ہیں مگر پُرسکون ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں کہ انہیں اتنا اچھا داماد ملا ہے۔'' بشریٰ کڑوی باتیں کرنے کی ماہر تھی۔

''تُوری میری اماں کہتی ہیں کہ خالہ نسیمے کو تجھے بیاہنا ہی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تجھے اس گھر کا محافظ سمجھتی ہے اور ظاہر ہے انہیں سونے کے انڈے دینے والی مرغی ملی ہے۔ وہ ایسے کیسے تجھے کسی کے حوالے کر دیں۔ محلے والے بھی کہتے ہیں کہ تیری اماں تیرے رشتوں پر سانپ بن کر بیٹھی ہے۔ وہ تجھے کہیں نہ جانے دے گی۔'' بشریٰ جیسے آج سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔

''ایسا تو نہ کہہ، میری اماں ایسی نہیں ہے۔ بیماری نے اُسے ایسا بنا دیا ہے۔ اُس کا میرا علاوہ اور کون ہے بھلا۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''لے اور سُن۔'' بشریٰ نے اس کا مذاق اڑایا۔ ''اگر وہ بیمار ہیں تو انہیں تیری اور فکر ہونا چاہیے۔ بس اصل بات سن لے تُو۔ وہ تجھے اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتی۔

حالانکہ دو دو بہوئیں گھر میں آئیں گی تو خود بخود رونق آجائے گی۔ پر تیری اماں نہیں سمجھتی۔ مجھے چاند بھائی کے رشتہ کا بہت دکھ ہوگا تُوری۔ وہ تجھے بہت چاہتے ہیں۔ بہت محبت کرتے ہیں تجھ سے۔ اللہ ہی تیری اماں کے دل میں رحم ڈالے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر اپنے گھر چلی گئی۔

تُوری کے دل پر بشریٰ کی جلی کٹی باتیں اپنا اثر دکھلا رہی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد وہ کتنی ہی دیر تک کھڑکی میں کھڑی رہی۔ اُس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کسی کام کرنے کو۔ وہ بس یونہی خاموش کھڑی روتی رہی۔

چاند کی باتیں سرگوشیاں بن کر اُسے مزید رُلا رہی تھی۔

کتنے عہد و پیماں ہو گئے تھے ان دونوں کے درمیان۔ وعدوں کی زنجیر بن گئی تھی ان کی محبت..... بس وہ خاموش روتی رہی اور اللہ سے دعا مانگتی رہی۔

☆.....☆

اکثر وہ سوچتی، وہی دن اچھے تھے، جب اس کے احساسات برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ مشین پر کپڑے سیتے سیتے وہ خود مشین بن گئی تھی۔ اب جب سے اس مشین نے گوشت پوست انسان کا لبادہ اوڑھا تو دل نکل کر کیسے باہر آگیا تھا۔

'اگر میں گھر میں رہتی تو کیا تھا؟ اماں تم نے مجھے گھر سے اکیلے قدم باہر نکالنے ہی کیوں دیا؟'' وہ پھر سے سسک پڑی۔

ایک ذرا سی نظر نے اُس کی ہستی کو تہہ و بالا کر ڈالا تھا۔ نہ چاند اُس کو دیکھتا، نہ وہ اُس کی نگاہ ملتفت کا شکار ہوتی۔ ایسا کیوں ہوا میرے ساتھ؟ وہ یونہی سوالات کے تانے بانے جوڑتے جوڑتے تھک جاتی تو خاموشی سے آکر بستر پر لیٹ جاتی اور کب نیند اُس پر مہربان ہوتی اُسے پتا ہی نہیں چلتا۔

☆.....☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب موبائل فون کی بجتی گھنٹی نے اُسے ہڑبڑا دیا گیا تھا۔ اُس کے پاس تو موبائل تھا ہی نہیں کیونکہ اماں نے اجازت ہی نہیں دی تھی اُسے موبائل رکھنے کی۔ چھوٹے بھائی کا موبائل تھا غالباً اور وہ شاید تھا نہیں۔ موبائل بند ہو گیا مگر اماں کی آنکھ کھل گئی تھی۔ ابھی وہ پھر سے سونے لگی تھیں کہ موبائل کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی۔

''ارے تُوری دیکھ یہ موبائل تو بجتا ہی جا رہا ہے۔ یہ مشتاق کہاں چلا گیا ہے۔'' اماں نے چھوٹے بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

اُسے تو خود پتا نہیں تھا کہ مشتاق کہاں چلا گیا ہے؟ وہ لوگ تو رات جانے کب آتے اور صبح بھی ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر تھا۔

کچھ دنوں سے مشتاق کی طرف سے اماں بہت پریشان تھیں۔ اُس کے اندر ایک عجیب تبدیلی تھی جو سمجھ میں آنے سے قاصر تھی مگر اماں کو شاید علم ہو گیا تھا اور جب تُوری نے مشتاق کا موبائل اماں کو لا کر دیا۔ پھر اماں کی جو بات ہوئی دوسری طرف کسی سے، تو اماں کی حالت بگڑنے لگی۔

انور گھر پر نہیں تھا۔ پندرہویں روزے کے بعد سے اسٹال لگنے لگے تھے۔ سو وہ دیر سے ہی آتے تھے۔

''کیا ہوا اماں۔'' وہ اماں کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔

''کچھ نہیں بیٹا، بس.....'' وہ خود کو چھپائے چھپائے ہچکیوں سے رو دیں۔ وہ روتی رہیں اور وہ خاموشی سے، بے بسی سے بس اُن کو دیکھتی رہی۔

''جا تُو جا کے سحری کی تیاری کر۔'' اماں دوپٹے سے چہرہ رگڑتے ہوئے بولیں تو وہ بھی چپ چاپ وہاں سے اُٹھ گئی۔

☆.....☆

اور پھر بھلا بات چھپتی کب ہے۔ جلد ہی اُسے

چاند راتوں کا حساب؟

میں چاند راتوں کا حساب کیا رکھوں
مرے سب دن
سورج لے گیا اِک دن
اُداس صحن میں
انگور کی بیل میں چھپا
عشق پیچاں سے لپٹا ستون کا سایا
آخری سانس لیتا ایک دن
نئے چاند کی کسے خبر ہے!
رات کے پہلو میں لگے
سب دن کراہ رہے ہیں
پرانے چاند کی چاہ میں
ڈوبتے جا رہے ہیں

دلشاد نسیم

بھی پتا چل گیا کہ اُس کا بھائی مشتاق کسی غلط عورت کی بیٹی کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ معاملہ تو خاصے عرصے سے چل رہا تھا۔ تب ہی اماں یکدم سے بیمار پڑ گئی تھی۔

اماں نے اُسے بہت روکنا چاہا مگر وہ نہ رکا۔ سارا بنا بنایا کاروبار اس نے اس لڑکی کے پیچھے خوار کر دیا تھا۔

انور نے جب اماں کو بتایا تو پہلے اماں کو یقین نہ آیا تھا کہ انہوں نے کس طرح اپنا پیٹ کاٹ کے نُوری کی محنت اور محبت بھی بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی۔ وہ کیسے مان جاتیں کہ حلال لقمہ کھلاتے کھلاتے اُن کا بیٹا کیسے حرام روزی کھانے والوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اماں کی مخالفت اُسے نہ روک سکی۔

مشتاق نے خاموشی سے اُس لڑکی سے شادی کر لی اور گھر میں کسی کو پتا ہی نہیں چل سکا۔ اتفاق سے موبائل وہ گھر پر بھول گیا تھا تو اس کی بیوی سے اماں کی بات ہو گئی۔ اماں نے پہلے تو اُسے ڈانٹا ڈپٹا۔ اُس کے بعد اس نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے اماں کو نیچا دکھا دیا۔

انور نے تو یہ بھی بتایا تھا کہ مشتاق نے ان سے کوئی قرضہ بھی لیا تھا اور جب وہ اتنی بڑی رقم ادا نہ کر سکا تو اُس نے کہا میری بیٹی سے شادی کر لو اور اس طرح اماں کا ایک محافظ بیٹا بک کر گھر سے جا چکا تھا۔

اماں نے صبر کی سِل رکھ کر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ انہیں اب نور سے بھی ڈر لگنے لگا تھا کہ نہ جانے وہ کیا رنگ دکھائے۔ اُس کے یقین دلانے کے باوجود اُس کے لیے اماں کا دل موم نہ ہوتا تھا۔

اِن دنوں اس چھوٹے سے گھر کی فضا عجیب سی ہو گئی تھی۔ انور شاذ و نادر ہی گھر میں آتا۔ اماں اپنے حجرے میں لیٹی رہتی اور تسبیح کے دانوں کو گھماتی رہتیں اور نُوری..... اُس کا دل عجیب خدشات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ اماں کو "میری" فکر کیوں نہیں ہے؟

کیا چاند میرا نہیں ہو سکتا؟ اگر اماں نہ مانی تو کیا ہو گا؟ پھر میری شادی نہیں ہو گی۔" وہ مایوس ہونے لگی تھی۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مگر اس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی بے دلی نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

وہ مشین پر سے اُٹھ کر برآمدے کی طرف آ گئی۔ اماں پالک کاٹ رہی تھیں۔ انہیں کام کرتا دیکھ کر وہ اُن کی طرف لپکی۔

"ارے اماں تم کیوں یہ کاٹنے بیٹھ گئیں۔ ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں کر لوں گی، تم آرام کرو۔" اس نے اماں کے ہاتھ سے چھری لینی چاہی۔

"نہیں، تو اپنا کام کر۔ اب میں ٹھیک ہوں اور مجھے اب خود کو ٹھیک رکھنا ہے۔ بیماری سے جان چھڑانی ہے۔ تُو جا، جا کر کپڑوں کو مکمل کر۔ میری فکر نہ کر۔ مجھے اپنا آپ سنبھالنا آتا ہے۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی اور دل میں ایک خلش سی لے کر اُٹھ گئی۔

☆.....☆

وہ آہستہ آہستہ قدموں سے کپڑوں کے شاپرز لے کر سر جھکائے چلی جا رہی تھی کہ اچانک چاند کا سایہ دیکھتے ہوئے اُس کے قدم ساکت ہو گئے۔ وہ اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ اداس نظروں سے بس اسے دیکھے گئی۔

"اتنی خاموش کیوں ہو۔ کیا محبت پر اعتبار نہیں رہا۔"

"ہے مگر....." وہ اُس کی بات کا جواب دیتے دیتے یکدم خاموش ہو گئی۔

"مگر کیا؟" چاند کی بے تابی دیدنی تھی۔

"حالات پر نہیں ہے۔" جملہ اُس کے لبوں سے بے ساختہ ادا ہوا تھا۔

"کیسے حالات؟" وہ وضاحت طلب کرنے لگا۔

"مجھے نہیں ملنا آپ سے۔" وہ اس کے سوالات سے گریز کرتے ہوئے آنکھوں میں آئے اشک چھپاتے ہوئے وہاں سے نکلنے لگی۔

"سنو نُوری۔ رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج اماں ضرور تمہارے گھر آئیں گی اور اس عید پر تم میری دلہن بن کر میرے گھر، میرے دل کی ملکہ بن جاؤ گی۔" وہ کتنے دعوے سے یہ سب کہہ رہا تھا اور اماں..... وہ تو کبھی راضی نہ ہوں گی۔ وہ بس سوچتی رہ گئی اور تیز تیز قدم اٹھا کر آگے بڑھنے لگی۔

"نُوری تُو یاد رکھنا، چاند تیرے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ چاند تجھے حاصل کر کے رہے گا۔ آج اماں آ رہی ہیں تیرے گھر، تیار رہنا۔" اُسے چاند کی آواز آ رہی تھی مگر وہ رکی نہیں۔ روگ جیسی خوش گمانیاں شاید اُس کے نصیب میں لکھی جا چکی تھیں اور چاند..... وہ بھی تو اُس کی سب سے بڑی خوش گمانی تھا۔

☆.....☆

وہ اُداس صورت بنائے دکھتے دل کے ساتھ افطاری کی تیاری کر رہی تھی۔ دو دن کے بعد عید تھی اور گھر کی نامانوس فضا اُسے ہولا رہی تھی۔ اُس نے تو عید کے کپڑے بھی ابھی تک نہیں بنائے تھے۔

اماں نہ جانے کن مسئلوں میں گھری تھیں۔ صبح سے اُس کی بات بھی نہ ہو پائی تھی۔

"سُن نوری، میں نے پھل لا کر فریج میں رکھ دیے ہیں۔ زیادہ افطاری کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے باہر سے سب کچھ منگوا لیا ہے۔ تو بس اچھی طرح سے سب انتظام کر دینا۔" یہ کہہ کر اماں آگے بڑھیں مگر پھر سے رک کر بولیں۔ "اور ہاں" تُو میرون رنگ کا جوڑا پہن لینا اور ہلکی نازک بالیاں اور ہاتھوں میں چوڑیاں ڈال لینا۔"

"کیوں اماں! خیریت تو ہے نا، کوئی آ رہا ہے کیا؟" اُسے یکدم حیرت نے آن گھیرا تھا۔

"ہاں اب سب خیریت ہے۔ سُن آج تیری بات طے ہو رہی ہے۔ وہ لوگ بہت دنوں سے تیرا رشتہ مانگ رہے تھے۔ میں نے اُن کو کہہ دیا تھا کہ آج آ کر شگون کر لیں۔"

"کون اماں۔" اُس کا دل دھڑکا اور وہ رونے والی ہونے لگی۔

"شام کو آ رہے ہیں وہ لوگ افطاری ہمارے ساتھ ہی کریں گے۔ لڑکا بھی آ رہا ہے۔ بھلا سا نام ہے اُس کا....." اماں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہاں..... چاند۔"

"چاند....." اُس کے چاروں طرف اس نام کی بازگشت گونجنے لگی۔ اُس نے شرما کر سر جھکا دیا۔

"بس بیٹی خوش رہ۔ میں تجھ پر اپنا حق کچھ زیادہ ہی جتا رہی تھی۔ میں نے کبھی اپنے آپ سے تجھ کو جدا کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا مگر اب اللہ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ مجھے بہت جلد تیرا احساس ہو گیا۔ تُو نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ تُو ہمیشہ خوش رہے گی۔ چاند بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ خود میرے پاس آ رہا تھا۔ بس میں نے تیرے لیے ان کو ہاں کر دی ہے۔"

انکشافات تھے یا حیرانیوں کا دریا تھا جو اُس کو زمین و آسمان کے درمیان گھمائے چلا جا رہا تھا۔

کیا وہ اتنی اہم ہو گئی تھی۔ اتنی معتبر ہو گئی تھی کہ چاند اُس کا ہمسفر بن گیا تھا۔

"تو نُوری کا چاند ہے اور چاند کی چاہ میں چاہت ہے۔" نُوری کی عید چاند کے تصور سے سج گئی تھی۔ اُس کا محافظ اس کو لینے آ رہا تھا۔

.....☆☆.....

رنگ افسانہ

شیما عبدالقیوم

میری نظر کا چاند ہو تم

''ماہین میں اُس ناکردہ گناہ کی سزا تمہیں دینا چاہتا تھا جو میں نے کیا ہی نہیں اور کیسی مزے کی بات ہے کہ یہ موقع مجھے تمہارے کزن نے دیا۔'' ''جی!'' ماہین کا دل بے تحاشہ دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔ ''ہاں ماہین یوں سمجھو ایک مذاق شروع ہوا ہے جو ہماری شادی کے دن.....

عید نمبر کے لیے گمان اور بدگمانی سے جڑا ایک خیال، افسانے کی صورت

''آخر کب تک ایسا چلتا رہے گا ماہین۔ تم دونوں بس ایک دوسرے کو دیکھتے ہو، مسکرا دیتے ہو۔'' نرمین دیوار پر دونوں بازو ٹکائے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب؟'' ماہین حیران ہوئی۔

''بھئی تم اور شہیر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو تو بات آگے بڑھاؤ ناں۔'' نرمین سامنے چھت پر بیٹھے شہیر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا بات آگے بڑھاؤں۔'' ماہین اب واپس آ کر تخت پر بیٹھ گئی۔ ''مجھے وہ اچھا لگتا ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔''

''تو کیا مطلب؟'' اب نرمین اُلجھنے لگی۔ ''اس کی ممی اور بہن جو آئے دن تمہارے لیے چیزیں بھیجا کرتے ہیں۔ تمہیں اس کا مطلب سمجھ نہیں آتا۔''

''بھئی مجھے ان الجھنوں میں مت ڈالو۔'' اب ماہین بیزار سی ہو گئی۔ ''وہ لوگ کیا سوچتے ہیں؟ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ آئی ڈونٹ کیئر۔ جب اماں بابا واپس آ جائیں گے تو میں واپس گھر چلی جاؤں گی۔''

''یہ مت کہنا ماہین کہ یہ ٹائم پاس ہے۔'' نرمین کی نظروں میں ہینڈسم سا شہیر چلا آیا۔

''نہیں یہ ٹائم پاس نہیں ہے بلکہ اُس بے عزتی کا بدلہ ہے، جو شہیر نے میری کی تھی اور اب اس کا قرض چکا رہا ہے وہ۔'' ماہین بے نیازی سے زینہ اترتی چلی گئی۔

☆.....☆

سانولی سلونی سی ماہین۔ خرم مرزا اور شہلا بیگم کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ ایک آسٹریلیا میں جاب کر رہا تھا جب کہ دوسرا بیٹا اسلام آباد میں سرکاری ملازم تھا۔

رمیض کی بیوی ڈلیوری میں پیچیدگی آنے کے سبب کافی بیمار تھی تو ماہین کی تعلیم میں حرج نہ ہونے پائے یہ سوچ کر اُس کے والدین اُسے اُس کے بڑے ماموں منور کے گھر چھوڑ گئے تھے۔ جہاں ماہین کا ٹکراؤ شہیر سے ہوا تھا۔

وہ ایک عام سا دن تھا ماہین اپنے کزن علی کی جینز شرٹ چڑھائے مزے سے گھوم رہی تھی جب ممانی نے اُسے ڈسٹ بن باہر جمعدار کو دینے کو کہا تھا۔ وہ مزے سے گیٹ پر جمعدار کو ڈسٹ بن پکڑا کر پلٹی تو کیاریوں کے آس پاس پڑے کچرے کو دیکھ کر اُس کی صفائی پسند طبیعت اُلجھنے لگی۔ وہ جھاڑو سے کچرا سمیٹ کر گیٹ تک لائی ہی تھی کہ کسی کے پیروں پر نظر پڑی۔ لمبا چوڑا، گرین چمکیلی آنکھوں والا شہیر شرارت سے، پُرکشش سی ماہین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ماہین کے کزن نجیب کا فرینڈ اور پڑوسی تھا۔ وہ شہیر سے قطعاً انجان۔ ''پلیز نجیب کو بلا دیں۔''

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔'' وہ جھاڑو سائیڈ پر کرتے ہوئے بولی۔

''او کے وہ آئے تو بتا دیجیے گا کہ شہیر آیا تھا۔'' وہ گیٹ سے پلٹ گیا۔

☆.....☆

ماہین بے نیازی سے چپس کھاتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ تبھی نجیب اندر آ گیا۔

''ممی..... ممی۔'' وہ چلا رہا تھا۔

''بھیا، ممانی باتھ لے رہی ہیں۔''

''اوہ او کے۔ انہیں بتا دینا کہ میں شہیر کی طرف ہوں۔''

''او کے۔'' وہ مزے سے پاؤں ہلاتی رہی۔

''ارے بھیا یاد آیا، کل یہی شہیر آیا تھا۔ آپ کا پوچھ رہا تھا۔''

''تم'' سے پوچھا تھا۔'' وہ پلٹا۔

''ہاں جی۔'' یہ سن کر وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

''کیا ہوا آپ ہنس کیوں رہے ہیں۔''

''ماہی وہ تمہیں ماسی سمجھا تھا۔ مجھے کہنے لگا، یار

تمہاری تو ماسی بھی بڑی ایڈوانس ہے۔ آنٹی تو بڑا ماڈرن بنا کر رکھتی ہیں اپنی ماسیوں کو۔'' وہ ہنسے جا رہے تھا۔

ماہین کو بے عزتی سی محسوس ہوئی۔ وہ تو اپنے سانولے رنگ پر ویسے ہی شاکی رہا کرتی تھی اس کے ننھیال میں سب ہی بے حد گورے چٹے تھے جب کہ ماہین کی رنگت اپنے بابا پر گئی تھی۔

'تو کیا میں ماسی جیسی نظر آتی ہوں۔' نجیب کے جانے کے بعد وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ تیکھے ناک نقشے اور کالے سیاہ بالوں کے ساتھ وہ بہت پُرکشش لگا کرتی تھی۔ یکدم ہی اُس کی نظروں کے سامنے خوب صورت سا شہیر آ گیا تھا۔

☆.....☆

''یہاں کیا کر رہی ہو۔'' کچن میں چائے بناتی ماہین کو نجیب نے مخاطب کیا۔

''ماموں، ممانی اور اپنے لیے چائے بنا رہی ہوں۔ آج میں نے نان خطائیاں بنائی ہیں۔''

''اوہ واؤ! تو پلیز دو کپ اور بڑھا لو۔ شہیر آیا ہوا ہے۔ میرے کمرے میں لے آنا پلیز!'' نجیب نے پیار سے کہا۔

''اوکے بھیا بنا لیتی ہوں۔''

''جلدی لے آنا۔'' وہ اپنے کمرے میں جا گھسا۔

دروازہ ناک ہونے پر نجیب نے ''کم اِن'' کہا تو شہیر نے بے ساختہ سامنے دیکھا۔ لائٹ پرپل پلین ایئر لائن اور سیدھے پاجامے میں ملبوس ماہین اندر آ رہی تھی۔ صاف ستھری اسکن چمک رہی تھی۔ کالے سیاہ بال پونی میں قید تھے جب کہ آگے ماتھے پر بینڈ کٹنگ خوب جچ رہی تھی۔

''بھیا چائے۔'' وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اندر چلی آئی۔

''اوہ تھینک یو سو مچ۔'' نجیب نے ٹرے تھام لی۔ ''اور بائی دا وے شہیر یہ میری کزن ہے ماہین۔ ہوم اکنامکس میں ماسٹرز کر رہی ہے۔ تم نے اُس دن اِسے ماسی سمجھ لیا تھا ناں۔'' جواباً شہیر نے مسکراتی نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ پلکیں جھکائے کھڑی تھی۔

''اوہ ہاں ایم سوری! مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔''

''پتا ہے ماہی یہ کیا کہہ رہا تھا۔'' نجیب مسکرایا۔ ''کہ انگلینڈ میں جو میڈز ہوتی ہیں نا وہ ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔'' ماہین کی نظر بلیک اسٹریپ سینڈل میں چمکتے شہیر کے پیروں پر گئی تو اُس کے اپنے گندمی پاؤں اسے مزید ڈارک لگنے لگے تھے۔ وہ تیزی سے مڑ گئی۔

☆.....☆

''یہ کون ہے؟'' ماہین بال لپیٹتی کمرے سے نکل رہی تھی کہ اس کی نظر مامی سے بات کرتی بے حد گوری چٹی خوب صورت لڑکی پر پڑی۔ وہ نمرہ کی طرف مڑی۔

''ماہین آپی یہ ہمارے پڑوس میں رہتی ہیں، عینی باجی۔ شہیر بھائی کی چھوٹی بہن۔''

''اوہ!'' اس کا لہجہ یکدم کڑوا ہوا۔ 'کچھ لوگوں میں اللہ خوب صورتی کتنی سخاوت سے بانٹتا ہے۔' وہ واپس پلٹ رہی تھی کہ مامی نے اُسے آواز دے کر بلا لیا۔

''ماہین! اِدھر آؤ بیٹا۔'' عینی نے اپنی گرین چمکیلی آنکھیں گھمائیں، نازک سی ماہین جھجکتے ہوئے آگے بڑھی۔ ''عینی یہ شہیر کی بیٹی ہے۔ ہمارے پاس رہنے آئی ہوئی ہے۔''

''ہیلو۔'' عینی نے دودھ سا دمکتا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ماہین نے اس کا ہاتھ بے دلی سے تھاما۔

''کیسی ہیں آپ؟'' وہ اس کا ہاتھ تھامے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ اپنے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔

''بھیا نے آپ کا ذکر کیا تھا۔'' عینی مسکرائی، ماہین نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

''بھیا نے بتایا کہ آپ چائے بہت اچھی بناتی ہیں اور آپ کے ہاتھ کی بنی نان خطائیاں بھی کمال کی تھیں۔'' جواباً ماہین نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''ارے آنٹی پتا ہے کیا ہوا تھا۔'' وہ ممانی کی طرف مڑی، شہیر بھیا، ماہین کو ماسی سمجھ بیٹھے تھے۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''مگر ماہین تو بہت ہی پیاری اور نازک ہے میں بھیا کو بولوں گی کہ وہ قریب کی نظر چیک کروا لیں۔'' ممانی ہنس رہی تھیں جب کہ ماہین شدید غصے کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اگر انسان خود بہت خوب صورت ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اپنے سے کم شکل و صورت رکھنے والے لوگوں کا مذاق اڑائے۔'' عینی حواس باختہ جب کہ ممانی حیرت سے ماہین کو دیکھ رہی تھیں۔

''عینی اگر آپ کے بھائی بہت خوب صورت ہیں تو اپنے لیے ہیں مگر ان کو میں یہ حق ہرگز نہیں دے سکتی کہ وہ میری تذلیل کریں۔'' ماہین کی آنکھوں میں ضبط کے باوجود پانی اتر آیا۔ عینی شرمندہ شرمندہ سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ماہین ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''اگر ایسا کچھ نہیں تو وہ ہر کسی کے سامنے مجھے ماسی کیوں کہتے ہیں۔'' وہ مستقل غصہ میں تھی۔

''میں ان کی طرف سے سوری کرتی ہوں۔'' عینی نے اس کے ٹھنڈے ہوتے ہاتھ تھامے۔

''ریلیکس ماہین بیٹا! وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ مذاق کیا ہوگا۔'' ممانی نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''میرا ان کا مذاق کا نہ رشتہ ہے اور نہ ہی ایسا کوئی تعلق کہ وہ مجھے بار بار ڈسکس کریں۔'' ماہین یہ کہتی ہال سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆

آج ماہین ضد کر کے اپنی خالہ کے ہاں چلی آئی۔ نرمین اس کی خالہ زاد ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھی دوست بھی تھی۔ وہ سارا دن بہت خوشی سے گزار کر واپس نجیب کے ساتھ چلی آئی۔ نمرہ چہکتی ہوئی آئی۔

''ماہین باجی عینی باجی آئی تھیں۔''

''تو میں کیا کروں؟'' وہ بے نیازی سے سینڈل کے اسٹریپ کھول رہی تھی۔

''وہ آپ کے لیے کیک، پھول اور کارڈ لائی تھیں۔''

''وہ کس خوشی میں بھئی۔'' وہ دونوں پاؤں صوفے پر سمیٹ کر بیٹھ گئی، تب ہی فون بج اٹھا، نمرہ نے لپک کر کال ریسیو کی۔

''ہیلو! کیسی ہیں آپ۔ ہاں ہاں یہ رہیں ماہین باجی۔ لیں بات کریں۔'' نمرہ نے کارڈلیس اُسے تھما دیا۔

'شاید ماما ہوں گی۔' یہی سمجھ کر اُس نے ریسیور پکڑا تھا۔

''ہیلو ماما۔'' وہ خوشی سے بولی۔

''ماہین میں عینی۔''

''اوہ عینی۔'' وہ یکدم خاموش ہوئی۔

''آئی ایم سوری۔ یار مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنا مائنڈ کرو گی۔ میں آج گھر آئی تو تم نہیں تھیں۔''

''اٹس اوکے۔'' ماہین سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تم نے خواہ مخواہ اتنا سب کچھ کیا۔''

''اوہ۔'' عینی ہنس پڑی۔ ''وہ میں نے نہیں بھیا نے بھجوایا ہے اور کارڈ بھی۔'' اسی دوران نمرہ پھول اور کارڈ لیے چلی آئی۔ پنک روزز مسکرا رہے تھے اور انہی کے درمیان سوری کا خوب صورت کارڈ لگا تھا۔

ماہین نے ترچھی نگاہ کی تب ہی اُسے شہیر کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو ماہین مجھے معاف کرنا۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔'' وہ دھیمے دھیمے بول رہا تھا۔

ماہین خاموش رہی۔

''آپ سن رہی ہونا۔'' وہ اُس کی خاموشی سے گھبرا گیا۔

''جی سُن رہی ہوں۔''

''تو کیا آپ نے میرا سوری ایکسیپٹ کرلیا ہے۔'' ماہین نے سوچتی نظروں سے بوکے دیکھا۔

''جی۔'' اور اتنا کہہ کر اُس نے لائن ڈسکنکٹ کردی۔

☆.....☆

''مگر یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' نرمین نے ماہین کو روکنا چاہا تھا۔ ''وہ ایک مذاق تھا جو ختم ہوگیا اور جو تم کررہی ہو یہ سراسر غلط ہے۔ تم شہیر کے جذبات کو مذاق بنارہی ہو۔''

''اور جو اس نے کیا تھا؟ زمانے بھر میں مجھے ماسی بنا کر رکھ دیا تھا۔'' وہ ہنوز اسی بات کو خود پر سوار کیے بیٹھی تھی۔

''مگر اس کے لیے تو شہیر نے سوری بھی کیا تھا نا ماہی۔'' نرمین کو اپنی سلجھی ہوئی کزن سے یہ امید ہرگز نہ تھی۔

''لیو اِٹ یار۔ تم کیا ہر وقت اس کی وکالت پر تلی رہتی ہو۔'' ماہین اب چڑ گئی تھی۔

''آئی کانٹ لیو اِٹ۔ یہ معاملہ تمہارے اور شہیر کے درمیان نہیں، اس کے گھر کی نائج میں بھی ہے۔''

''تو میں نے کب کہا تھا کہ اعلان کرے اور میں نے کب اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے وعدے کیے ہیں۔'' وہ نظریں چرا رہی تھی۔

''یہ بات مجھ سے نظر ملا کر کہو ماہی۔'' نرمین نے اُسے کندھوں سے تھام کر سامنے کرلیا۔

''بس نرمین نو مور نصیحت پلیز، ویسے بھی ماما بابا کل آرہے ہیں۔ گھر چلی جاؤں گی میں۔'' اب وہ الماری سے اپنے کمرے سمیٹ رہی تھی۔

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ایک مذاق شہیر نے کیا تھا، ایک مذاق میں نے کیا۔ حساب برابر۔'' یہ کہتی ہوئی نرمین کو اس وقت وہ بہت ظالم لگی تھی۔

☆.....☆

ماما بابا کے ساتھ گھر واپس آکر ماہین بے حد خوش تھی۔ بھابی اور بے بی بالکل ٹھیک تھے۔ وہ سارا دن ماما کے ساتھ چپکی رہتی۔ شہیر تو جیسے اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔

آج یونیورسٹی سے واپس آکر وہ فریش ہوکر کھانا کھا رہی تھی کہ فون بج اٹھا وہ دھیرے سے اٹھی۔

''کیا مصیبت ہے۔'' وہ بے مزہ ہوئی۔

''ہیلو۔'' وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف شہیر تھا۔ وہ حیران ہوئی۔

''آپ کو میرا نمبر کس نے دیا۔''

''نمرہ سے لیا ہے عینی نے۔''

''اوہ۔''

''کیسی ہو ماہین، بتائے بغیر چلی آئیں۔'' وہ بہت اداس سا لگا۔

''ہاں ماما بابا آگئے تھے۔'' وہ پُرسکون تھی۔

''ماہین کم از کم ایک کال تو کرسکتی تھیں یار۔''

''سوری خیال نہیں رہا تھا۔'' وہ ہنوز لاپرواہی تھی۔

''کیا مطلب؟'' اب شہیر قدرے حیران ہوا۔ ''تمہیں میرا خیال نہیں رہا کہ میں کتنا پریشان ہو جاؤں گا۔''

''ارے۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''اس میں پریشان

ہونے والی کیا بات ہے بھلا۔ ایک ہی شہر میں تو ہیں ہم۔''

''مگر تم نے مجھے کبھی اپنا نمبر نہیں دیا۔'' وہ شاکی ہوا۔

''مجھے بالکل خیال نہیں رہا۔ ماموں جان کے ہاں تو روزانہ بات ہوجایا کرتی تھی۔''

''اچھا!'' شہیر چپ سا ہوگیا۔ ''ماہین ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھیے۔''

''کیا تم نے مجھے مس کیا۔'' ماہین لمحہ بھر خاموش ہوگئی۔

''بتاؤ نا؟''

''کیا کریں گے جان کر۔ اگر میرا جواب آپ کے حسبِ مرضی نہ ہوا تو؟'' وہ ہنس پڑا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں نے تمہیں بہت مس کیا۔ اینڈ آئی ایم شیور کہ تم نے بھی مجھے مس کیا ہوگا۔''

''پتا نہیں۔'' ماہین نے مختصراً جواب دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی ماہین۔'' شہیر کو عجیب سا لگا تھا۔ ''اچھا ماہین ممی اور عینی اِس ویک اینڈ پر تمہارے گھر آئیں گی۔''

''وہ کیوں؟'' ماہین حیران ہوئی۔

''بھئی تم سے ملنے، انکل آنٹی سے ملنے۔''

''وہ تو مجھ سے مل چکی ہیں۔'' ماہین کو خطرے کی گھنٹیاں بجتی محسوس ہوئیں۔

''شہیر میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں، ماما بلا رہی ہیں۔'' اس نے بغیر کچھ اور سنے فون رکھ دیا تھا۔

☆.....☆

آج ندرت خالہ اور نرمین آئی ہوئی تھیں۔ وہ نرمین کو لیے کمرے میں چلی آئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا، تب ہی نرمین نے اچانک اس سے پوچھا۔

''اور تمہارے ہیرو کے کیا حال ہیں۔''

''کون؟'' ماہین کی معصومیت قابلِ دید تھی۔

''ارے یار شہیر اور کون؟''

''ارے وہ۔'' ماہین ہنس پڑی۔ ''کہانی ختم۔''

''کیا مطلب، تم نے شہیر کو کیا کہا۔'' نرمین سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

''فی الحال تو کچھ نہیں۔'' تب ہی ماما کی آواز آئی۔

''ماہین بیٹا کال اٹھاؤ۔ تمہاری دوست کا فون ہے۔'' ماہین نے پاس پڑا کارڈلیس اٹھالیا۔

''ہیلو کون۔ اوہ عینی کیسی ہو۔'' ماہین نے بے زار سی شکل بناتے ہوئے مصنوعی طور پر لہجہ خوشگوار بنایا۔ ''اوہ بالکل نہیں عینی تم میری بہت اچھی دوست ہو۔''

''صرف دوست ہوں۔'' عینی نے سوالیہ لہجہ اختیار کیا۔

''تو اور کیا، تم میری بہت اچھی دوست ہو۔'' ماہین دانستہ اس کے سوال میں چھپے استفسار کو نظر انداز کرگئی۔

''اوہ نہیں ابھی نہیں پلیز میں بزی ہوں۔'' ماہین نے جان چھڑانے کا انداز اختیار کیا تب ہی عینی ریسیور شہیر کو پکڑا چکی تھی۔

''کیا حال ہیں ماہین۔'' وہ اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ لیے دیے انداز میں بولی۔

''آپ کے ہاں سلام کا رواج نہیں ہے کیا۔'' وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' وہ دھیمے سے بولی۔ نرمین کا

دھیرے دھیرے مسکرانا اسے سلگا رہا تھا۔

''ماہین میں نے بتایا تھا نا کہ ممی تمہارے گھر آنا چاہتی ہیں۔ میں اگلے ماہ آسٹریلیا جا رہا ہوں۔ جانے سے پہلے چاہتا ہوں کہ ہم کسی بندھن میں بندھ جائیں۔''

'ناؤ اِٹس اے ٹائم ٹو کلیئر ایوری تھنگ۔' ماہین نے سوچا اور دوٹوک لہجے میں بولی۔

''شہیر میں نے آپ سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا کہ ہم ساتھ زندگی گزاریں گے۔''

''کیسی بات کر رہی ہو ماہین۔'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''یہ بات مجھے پہلے ہی آپ کو بتا دینی چاہیے تھی۔'' وہ سپاٹ لہجہ اختیار کیے ہوئے رہی۔

''تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی۔'' وہ ابھی تک حیران تھا۔

''نہیں مجھے، ماہین خرم مرزا کو کسی بھی شہیر سے کبھی محبت نہیں ہوئی۔'' وہ مزید سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تو وہ سب کیا تھا ماہین۔'' شہیر کو ابھی تک اس کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''وہ کچھ بھی تھا مگر محبت نہیں تھی۔'' ماہین کو بلاوجہ غصہ آنے لگا۔ ''یاد کریں وہ دن جب مجھے ماسی بلایا تھا اور مختلف وقتوں میں یہ احساس دلاتے رہے کہ میں ایک کم شکل لڑکی ہو۔''

''ایسا کچھ نہیں تھا ماہین۔'' وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے بھی تمہیں ایسا نہیں سمجھا، صرف تنگ کیا تھا، مذاق کیا تھا ماہین۔'' شہیر کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماہین کے دل کو کس طرح صاف کرے۔

''ہاں تو میں نے بھی مذاق کیا تھا۔ وہ سب مذاق تھا، بدلہ تھا اس بے عزتی کا، جو آپ کی وجہ سے مجھے اٹھانی پڑی۔'' وہ اب قدرے تلخ انداز میں بولی۔ ''اور پلیز میرا پیچھا کرنا بند کر دیں۔ اٹس آل اوور۔ مجھے دوبارہ فون مت کیجیے گا۔'' اُس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا جب کہ نرمین نہایت افسوس سے اسے دیکھتی رہی۔

☆.....☆

اُس دن کے بعد سے نہ تو شہیر نے کبھی اسے کال کی اور نہ ہی عینی نے اُسے کال کی۔ ماموں کے ہاں وہ ایک دو بار گئی مگر وہاں بھی اُن سے متعلق کچھ سننے کو نہیں ملا۔ انہی دنوں میں ماہین کا ماسٹرز بھی مکمل ہو گیا اور نرمین اور نجیب کی شادی فکس ہو گئی۔ بات پرانی ہو گئی تھی لہٰذا نرمین بھی تقریباً بھلا چکی تھی۔

ماہین کو نجیب اور نرمین دونوں پیارے تھے لہٰذا اُس نے دل کھول کر شادی انجوائے کی۔ دل میں کہیں ایک بات تھی کہ دوبارہ کبھی شہیر کا سامنا نہ ہو اور یہ پھانس بھی دل سے نکل گئی جب نمرہ نے بتایا کہ وہ لوگ یہاں سے شفٹ کر گئے ہیں اور شہیر آسٹریلیا جا چکا ہے۔

☆.....☆

دن اپنی رفتار سے گزر رہے تھے، ماہین نے ایک فرم جوائن کر لی تھی۔ ماما اور بابا کو اب اس کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی ماہین کی کہیں بات طے نہ ہو پاتی تھی۔ خرم مرزا بھلے یہ بات کسی سے نہ کہتے مگر انہیں احساس تھا کہ ماہین کی عمر کی تمام لڑکیاں اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ خود نرمین دو بچوں کی ماں بن چکی تھی اور اس سے عمر میں کئی سال چھوٹی نمرہ کی اگلے مہینے منگنی طے ہو گئی تھی۔

جنید اور عبید بھی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ ماما اور بابا سال میں ایک بار کبھی جنید سے مل آتے تو کبھی عبید سے مل آتے ماہین بظاہر خوش نظر آتی تھی مگر دل ہی دل میں کوئی نامعلوم سی خلش تھی جو اسے لمحہ

ستاتی رہتی۔ اکثر رات کی تنہائیوں میں شوخ و چنچل سا شہیر یاد آ جاتا۔ آج اگر وہ دونوں ساتھ ہوتے تو کیا تب بھی زندگی ایسی ہوتی؟؟ یہ سوال اب اسے اکثر ستایا کرتا تھا۔

☆.....☆

وہ ایک عام سا دن تھا جب وہ مالی سے لان کی صفائی کروا رہی تھی۔ تب ہی ایک بال دیوار سے لگتی اس کے پیروں میں آ رکی۔ ماہین نے جھک کر بال اٹھائی تب ہی مین گیٹ سے آواز آئی۔

''پلیز بال دے دیں۔'' وہ مسکراتی ہوئی گیٹ تک چلی آئی۔ دو مسکراتے چہرے والے بچے اسے تک رہے تھے۔

''آنٹی بال پلیز۔''

''اوہ شیور، پلیز۔'' اس نے انہی کے انداز میں جواب دیتے ہوئے بال انہیں تھما دی۔ وہ پلٹ رہی تھی کہ ہارن کی آواز پر پھر رک گئی۔ گاڑی دیکھتے ہی وہ خوش ہو گئی۔ نرمین اور نجیب تھے۔ اس نے بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔ گاڑی رکتے ہی موٹی سی نرمین باہر نکل آئی، گود میں چھے ماہ کا ہمدان انگوٹھا چوس رہا تھا۔

''لاؤ! اسے مجھے دے دو۔'' اس نے بے تابی سے ہمدان کو جھپٹ لیا۔ پیچھے سے آٹھ سالہ حبہ بھی اتر آئی۔ ''ماہی خالہ۔''

''اوئے ماہی خالہ کی جان۔'' اس نے اُسے ساتھ لپٹا کر چٹاچٹ کئی بوسے دے ڈالے۔

''السلام علیکم بھیا۔'' وہ مسکراتے نجیب کو دیکھ کر بولی۔

''والسلام! کیا حال ہے بھئی۔'' وہ مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔ جب کہ نرمین وہیں لان میں چلی آئی۔

''پھول تو خوب کھل اُٹھے ہیں۔'' وہ توصیفی نظروں سے بچے لان کو دیکھ رہی تھی۔

بس سوچتی ہوں میں.....

کاش میری ماں ہوتی
میرے اپنوں کو کچھ تو سمجھاتی
اپنے پیارے سے دھیمے لہجے میں
ماں کی عظمت بھی سب کو بتلاتی
میرے دکھ درد کو سمجھتی وہ
میرے سکھ پر بھی خوش وہ ہو جاتی
اور اب..... ہر لمحہ
سوچتی ہوں اگر وہ ہوتی پاس
وہ محبت سے مجھ کو لپٹاتی
چوم کر ماتھا مجھ کو سمجھاتی
وقت اک سا نہیں رہتا ہے کبھی
وقت ہر زخم کو مٹا دے گا
آنسو پونچھو، نہ دکھ سے یوں دیکھو
بچے جلدی بڑے نہیں ہوتے
عقل آنے میں دیر لگتی ہے
وقت سے اس طرح نہ گھبراؤ
میں تیرے آس پاس رہتی ہوں
تیرے آنسو مجھے رلاتے ہیں
تیرے ہی پاس کھینچ لاتے ہیں
مائیں مر کے بھی مر نہیں سکتیں

نزہت فاروقی

"ہاں محنت بھی تو خوب کرتی ہوں۔"

"اتنی محنت خود پر بھی کرلیا کرو ماہی۔"

"کیوں کیا ہوا ہے مجھے، اچھی خاصی تو ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"ماہین، خرم انکل بہت پریشان ہیں یار۔"

"اُن کی پریشانی خود پیدا کردہ ہے نرمین۔ یہ میرے بس کی بات کہاں ہے۔" وہ افسردہ ہوگئی۔ "کبھی سوچتی ہوں کہ یہ میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟"

"ہاں یہ تو میں بھی سوچتی ہوں ماہی۔" نرمین نے ہمدان کو نیچے اتار دیا تھا۔ "کہتے ہیں کہ پہلے رشتے میں بلاوجہ نقص نہیں نکالنا چاہیے اور تم نے تو حد کردی تھی۔"

"چھوڑو یار وہ پرانی بات تھی۔" ماہین آہستہ سے بولی۔

"نہیں وہ پرانی بات نہیں تھی۔ ماہی اور نہ ہی ٹین ایج والی بات تھی۔ جانتی ہو شہیر واپس آگیا ہے۔ اُس سے نجیب کی ملاقات ایک سیمینار میں ہوئی تھی۔ وہ ابھی بھی سنگل ہے۔" دل میں کہیں اس کا عکس لہرایا تھا۔

"عینی کی شادی ہوگئی ہے اور ان کی ماما کا انتقال ہوگیا ہے۔ شہیر کچھ عرصہ یہیں رہے گا۔"

"تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو۔"

"کیونکہ اُس نے نجیب سے تم سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔" ماہین حیران پریشان اسے تکنے لگی تھی۔

☆.....☆

اگلے دن شہیر، نجیب کے ساتھ ماہین کے گھر چلا آیا۔ رمضان کی آمد آمد تھی۔ ماہین بوڑھے ہوتے ماما اور بابا کی حالت دیکھ کر اداس رہا کرتی تھی۔ یہ اچانک آمد اُس کے لیے کافی حیران کن اور شرمناک بھی تھی۔ اُس نے ایک جھلک دیکھی تھی شہیر کی، کافی سوبر اور ڈیسنٹ لگ رہا تھا۔ شرارتی آنکھوں پر گلاسز ٹکے تھے۔ پرسنالٹی آج بھی بہت متاثر کن تھی ماما اور بابا بہت خوش لگ رہے تھے جب کہ نجیب بھی کافی کھلا کھلا دکھ رہا تھا۔ وہ ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی خود کو آئینے میں دیکھ رہی تھی اُسی وقت نجیب اندر چلا آیا۔

"گڑیا آؤ میرے ساتھ شہیر آیا ہے۔ جانتی تو ہو ناں اُسے۔"

"جی بھیا۔" وہ جھجک رہی تھی۔

"ارے کیا ہوا۔" نجیب خوش دلی سے ہنس دیا۔ "بہت اچھا بندہ ہے ٹرسٹ می۔" وہ اُسے خود سے لگائے لگائے اندر چلا آیا۔ بابا سے بات کرتے شہیر نے نظر اٹھا کر سامنے آتی ماہین کو دیکھا اور بلا ارادہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دشمنِ جاں آج بھی اتنی معصوم اور متاثر کن تھی جتنی پہلی بار نظر آئی تھی۔

"السلام علیکم!" شہیر نے سلام کہا۔ "آپ کے ہاں سلام کرنے کا رواج نہیں ہے شاید۔" مسکراتی ہوئی آواز پر ماہین نے اسے دیکھا۔ مونچھوں تلے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ جواباً وہ دھیرے سے جواب دیتی بابا کے قریب بیٹھ گئی۔

"پھوپو جانی شہیر میرا بہت پرانا دوست ہے اور پڑوسی بھی رہا ہے۔ چند سال پہلے اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ ایک بہن ہے جو کیپ ٹاؤن میں رہتی ہے۔ تو میں اس کے رشتے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔" نجیب بہت قرینے سے بات آگے بڑھا رہا تھا۔

"بیٹے آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟" ماما نے بات جوڑی۔

"دراصل آنٹی اس طرف دھیان نہیں گیا۔ پہلے پڑھائی اور پھر بزنس، پتا ہی نہیں چلا کہ وقت اتنا گزر

گیا۔" یہ بات کہتے ہوئے اس نے ماہین کو دیکھا جو اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اُس کے براہ راست دیکھنے پر وہ جھینپ سی گئی۔ "اور آنٹی مجھے ایسی لڑکی کی خواہش تھی جو مذاق کو مذاق سمجھے۔" ماہین خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

☆.....☆

"یار پھوپا اور پھوپو تو بہت خوش ہیں تجھ سے مل کر۔" نجیب اور شہیر واپس جا رہے تھے۔

"ہاں مگر آپ کی موصوفہ کزن تو بالکل غائب دماغ تھیں۔"

"وہ شروع سے ایسی ہی ہے یار، جذباتی اور پاگل۔"

"ہاں اس کا اندازہ تھا مجھے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "مگر بھابی کو ٹھیک یو کہنا ہے کہ انہوں نے تجھے اس معاملے میں اپنا راز داں بنا کر میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔"

"ہاں۔" نجیب کھل کر ہنس دیا۔ "مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ محترمہ کیا حرکات کر رہی ہیں۔ ورنہ یہ سب معاملات آج سے چھ سال پہلے طے پا گئے ہوتے۔ خیر سزا تو ملنی چاہیے ماہین کو۔" وہ دونوں ہلکے پھلکے باتیں کرتے رہے۔

باقی کے معاملات بہت آسانی سے طے ہوتے چلے گئے۔

☆.....☆

رمضان آچکے تھے۔ ماہین ہر وقت دل ہی دل میں اندازے لگاتی اور گھبراتی رہتی۔ دسویں رمضان کو ماہین اور شہیر کی منگنی ہوگئی۔

عینی نے Skype پر بہت دھوم کیا تھا اور آنے کا وعدہ کیا تھا جب کہ نرمین کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا مگر ماہین کے وسوسے بڑھتے جا رہے تھے۔

ان دنوں میں ایک بار بھی شہیر نے اس سے بات نہیں کی تھی۔

جنید اور عبید اس سال عید گھر منانا چاہتے تھے لہٰذا طے پایا کہ عید کے فوراً بعد ماہین کی شادی بھی سرانجام پا جائے۔ عینی بھی عید کے بعد پاکستان پہنچ رہی تھی۔ سب بہت خوش تھے سوائے ماہین کے..... نہ جانے کیوں؟

☆.....☆

ایسا رمضان بہت سالوں بعد آیا تھا کہ مرزا صاحب کی پوری فیملی موجود تھی۔ ماں باپ بہت خوش اور مطمئن تھے۔ دونوں بھابیاں بھی کافی ایکسائٹڈ تھیں۔ شادی کی تیاریاں بھی ساتھ ساتھ جاری تھیں۔

آج پندرہواں روزہ تھا۔ ماہین ظہر کی نماز پڑھ کر کچھ دیر لیٹنے کی نیت سے کمرے میں آگئی، تب ہی اس کا موبائل بج اٹھا۔ کوئی اَن نون نمبر تھا۔ اس نے کال ریسیو کر کے موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"میں شہیر۔" ماہین نے یک لخت الٹا ہاتھ دل پر رکھا تھا۔

"جی۔" وہ خاموش رہی۔ "کیا بات ہے ماہین خرم مرزا ایک بار بھی سلام نہیں کیا آپ نے مجھے۔ ایسی بھی کیا دشمنی کہ سلامتی بھیجنے کی روادار نہیں ہیں آپ۔" آواز میں کیا تھا وہ سمجھنے سے قاصر رہی۔

"جی ایسی تو کوئی بات نہیں۔" ماہین مری ہوئی آواز میں بولی۔ شہیر کا بے ساختہ قہقہہ لگانے کو دل چاہا تھا۔

"پھر کیسی بات ہے ماہین۔"

"جی کچھ بھی نہیں۔"

"اس 'کچھ بھی نہیں' نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا ماہین۔" وہ خاموشی سے اُسے سن رہی تھی۔

"جانتی ہو نجیب میرا بہت اچھا دوست ہے۔ وہ انکل

آنٹی کی وجہ سے بہت پریشان تھا کہ تمہاری شادی کی وجہ سے وہ بہت فکرمند ہیں؟"

"یہ سب باتیں اس وقت کرنے کی کیا تک ہے۔" ماہین بس سوچ کر رہ گئی۔

"تو میں نے سوچا کیوں نہ موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔"

"فائدہ۔" ماہین مزید حیران ہوئی۔

"ہاں ماہین فائدہ۔ میں اس ناکردہ گناہ کی سزا تمہیں دینا چاہتا تھا جو میں نے کیا ہی نہیں اور کیسی مزے کی بات ہے کہ یہ موقع مجھے تمہارے کزن نے دیا۔"

"جی۔" ماہین کا دل بے تحاشہ دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔

"ہاں ماہین یوں سمجھو ایک مذاق شروع ہوا ہے جو ہماری شادی کے دن ختم ہوگا۔ جب عین شادی کے دن میں واپس آسٹریلیا لوٹ جاؤں گا۔" یہ کیسی بات کر رہا ہے شہیر۔ ماہین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

"شہیر آپ ایسا کچھ مت کیجیے پلیز۔ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ ہاں میں غلط تھی۔ میں نے ایک چھوٹی سی بات کو اتنا بڑھا دیا کہ سب کچھ غلط ہوتا گیا۔" وہ اب رو رہی تھی۔ شہیر کا دل جیسے تڑپ اٹھا۔

"بس ماہین جو ہوا اب اس کا تاوان تو بھگتنا ہوگا نا آپ کو۔" یہ کہہ کر اس نے لائن ڈسکنکٹ کر دی کہ اس سے زیادہ کا اُس میں یارا نہیں تھا۔

☆.....☆

"نہیں یار میں نہیں کر سکتا اُس کے ساتھ یہ سب۔" وہ نجیب کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ "وہ رو رہی تھی۔"

"ہاں تو کوئی بات نہیں۔" نرمین اطمینان سے صوفے پر ٹک گئی۔ "شہیر بھائی کچھ دن ایسے ہی رہنے دیں۔ اس کو احساس ہونے دیں کہ اس نے کتنی بڑی بے وقوفی کی تھی۔"

"مگر بھابی۔" وہ لاچارگی سے بولا۔

"نو اگر مگر۔" وہ تحکم سے بولی۔ "کتنا سمجھایا تھا میں نے بھائی نے مگر اپنی زندگی کے ساتھ آپ کی زندگی کو بھی گھن لگایا۔"

"ناسمجھ تھی بھابی وہ۔" شہیر ابھی بھی اس کی سسکیاں محسوس کر رہا تھا۔

"اوہو شادی تو ہوئی نہیں اور موصوف گئے ہاتھ سے۔" نجیب اس کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

"یہ بات نہیں ہے نجیب۔" نرمین سنجیدہ ہو گئی۔ "میں نے اس کی آنکھوں میں آپ کا عکس دیکھا تھا۔ وہ آپ سے محبت کرتی تھی مگر خود سے الجھتی رہی اور ایک بے مقصد بات میں اتنے سال ضائع کیے۔ وہ ہمیشہ بہانوں سے مجھ سے، کبھی نجیب سے آپ کے متعلق پوچھتی رہی ہے۔ وہ بعد میں بہت نادم رہی ہے۔ یہ سب کرنے کا مقصد اس محبت کو باہر لانا ہے اور اسے احساس دلانا ہے کہ یوں محبت بھرا دل توڑا نہیں کرتے۔"

شہیر کو وہ دن یاد آ گئے تھے وہ اذیت جو اس نے ایک عرصہ جھیلی تھی۔ اس واقعے کے بعد اکثر ماہین اُسے نجیب کے گھر دکھائی دیتی رہی تھی۔ ہاں تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہوا آپ کے ساتھ ماہین مرزا، وہ آنکھیں بند کر کے مسکرایا۔ تھوڑی تکلیف اٹھانا تو آپ کا بھی حق بنتا ہے ناں، وہ مستقل مسکرائے جا رہا تھا۔

☆.....☆

ماہین سخت مصیبت میں تھی۔ ہر روز اسے شہیر کا میسج ملا کرتا تھا۔ آج سترہ دن باقی ہیں ماہین۔ آج پندرہ دن باقی ہیں اس مذاق کے ختم ہونے میں اور وہ سہم سہم جاتی۔

کئی بار ارادہ کیا کہ بابا اور ماما سے بات کرے مگر ان سب کی خوشی دیکھ کر خاموش ہو جاتی۔ جنید اور عبید، جی جان سے تیاریوں میں مصروف تھے جب کہ ماما، بھابیوں کے ساتھ مل کر شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

آج 23 ویں شب تھی۔ عبادت کرتے کرتے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ کچھ ہی دن باقی تھے۔ وہ روئے جا رہی تھی ستائیسویں روزے کو اس کا نکاح تھا۔ دل عجیب سے خیالات سے دوچار تھا۔

"میں نے تو آپ سے محبت کی تھی شہیر، بہت محبت۔" وہ اب خود سے بات کر رہی تھی۔ "پہلی نظر میں محبت کی تھی۔ بس سمجھ نہیں پائی تھی۔ سب کچھ الجھا کر رکھ دیا میں نے۔" وہ روئے جا رہی تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ستائیسواں روزہ آ گیا۔ عینی بھی پاکستان آ چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے نرمین اس کے کپڑے پہنچا گئی تھی۔

نکاح عصر کے وقت طے پایا تھا۔ وہ فیروزی کامدار سوٹ میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ نکاح نامے پر دستخط کرتے وقت اُس کے ہاتھ کانپے تھے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"جانتی ہو ماہین، شہیر بھائی بہت ہینڈسم لگ رہے ہیں۔ وائٹ شلوار قمیص میں۔" بسمہ اس کی چھوٹی بھابی اسے گلے سے لگائے بول رہی تھی۔

"کس طرح انہیں حقیقت بتاؤں۔" وہ بے بسی سے ہاتھ مسل رہی تھی۔

☆.....☆

"تو مسز ماہین شہیر۔" میسج کھولا تو شہیر کا نمبر تھا۔ "رات کے ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔ ماہین نے بے بسی سے میسج ریسیو کیا۔ "اب صرف تین دن باقی ہیں آپ کے اور میرے مذاق کے ختم ہونے میں۔" ماہین نے بے ساختہ اس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ دوسری بیل پر کال ریسیو ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم!" نہ جانے کیسے سلام اس کی زبان سے نکلا تھا۔

"ارے..... وعلیکم السلام۔" وہ ہنس پڑا۔ "سورج کہاں سے نکلا ہے جو محترمہ ماہین مرزا نے سلام کیا، گویا فائنلی آپ نے مجھ پر سلامتی بھیج ہی دی۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں۔" وہ رو ہی دی تھی۔ "میں دونوں ہاتھ جوڑ کے آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ میری نادانی کی سزا میری فیملی کو نہ دیں۔ قصور تو میرا تھا نا، تو سزا مجھے دیں۔ اِن سب کا کیا قصور تھا۔" شہیر کا دل چاہا کہ وہ نرمین اور نجیب کے نادر خیالات پر لعنت بھیج کر ماہین کو سب کچھ بتا دے۔ وہ ضبط سے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

"ایک بات پوچھوں ماہین؟" جواباً اس کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ "کیا! اُس سارے عرصہ میں ایک بار بھی تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہوئی۔ میں کبھی تمہیں اچھا نہیں لگا۔"

"ایسا نہیں تھا شہیر۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "ایسا کچھ نہیں تھا شہیر۔ مجھے آپ سے محبت تھی، محبت ہے۔ مجھے اِس مقدس رشتے کی قسم! میں نے آپ کے سوا کبھی کسی کو نہیں چاہا اور نہ ہی کسی کو سوچا۔" وہ اب بلند آواز میں رو رہی تھی۔ "یہ جھوٹ نہیں مگر میں اپنی انا سے ہار گئی تھی۔" شہیر کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

"You have to pay for it." اتنا کہہ کر شہیر نے کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔ کہیں وہ اپنے جذبات پر اختیار کھو نہ بیٹھے۔

☆.....☆

بالآخر آج وہ دن آ ہی گیا تھا جس کے انتظار میں شہیر اور ماہین دونوں کی نیند عذاب تھی۔ ہاں جذبات الگ تھے۔

باارلر سے لے کر ہال تک پہنچنے میں ہر پل اسے لگا کہ کسی بھی لمحے کوئی خبر آجائے گی۔ یہاں تک کہ بارات آگئی، کا شور مچ اٹھا۔

وہ مسقل عذاب میں تھی۔ کب کون سی رسم ادا ہوئی، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ کب بھابیاں اُسے زمین اور عینی کے سہارے گاڑی تک لائیں، اسے کچھ احساس نہیں تھا۔ ماما کے گلے لگ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ جنید اور عبید نے اُسے دعاؤں کے سائے تلے رخصت کیا۔ بابا کا پُرشفقت لمس ابھی تک زندہ تھا۔

عینی اُس سے چھیڑ چھاڑ کرتی کمرے تک پہنچا گئی تھی۔

آج عید کا پہلا دن تھا اور شہیر کی ضد پر آج رخصتی قرار پائی تھی۔ اُس کا پورا وجود کانپ رہا تھا کمرے میں ٹھنڈک کچھ زیادہ ہی تھی، تبھی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز نے اُس کا دل مزید دھڑکا دیا تھا۔ وہ یک لخت بیڈ سے اٹھ گئی اور شہیر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سرخ اور گرین لانگ شرٹ اور ڈھاکہ پاجامے میں وہ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی، شہیر لمحہ بھر کو بے خود سا ہو گیا۔ کشادہ پیشانی پر جڑاؤ ٹیکا چمک رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔

”مجھے معاف کر دیں شہیر۔“ بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”کیا سمجھوں ان آنسوؤں کو۔“ شہیر نے دائیں ہاتھ کی پہلی پور پر اس کا آنسو سمیٹا تھا۔ ”شرمندگی یا محبت۔ جدائی کا خوف یا بے عزتی کا خوف۔“ وہ اُس کے مزید قریب آ گیا۔ ماہین ایکدم اُس کے سینے سے جا لگی۔

”یہ صرف محبت ہے شہیر، صرف جدائی کا خوف ہے، یقین کر لیں۔“ وہ مستقل رو رہی تھی۔ ”ان کچھ دنوں میں مجھے احساس ہوا کہ اس دل میں کچھ نہیں تھا سوائے آپ کی محبت کے۔“ شہیر نے نرمی سے اس کی ٹھوڑی کو تھام کر چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔

”وہ بھی مذاق تھا جانِ شہیر، صرف یہ احساس دلانا تھا کہ بعض مذاق کتنے جان لیوا ہوا کرتے ہیں۔ اگر جانا ہی ہوتا تو آتا کیوں۔“ ماہین نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔ جواباً شہیر نے دونوں کان پکڑ لیے۔

”سوری اس تمام تکلیف کے لیے جو تمہیں ہوئی۔“

شہیر نے بھی صرف ماہین مرزا کو چاہا تھا۔ وہ آنکھوں میں محبت کی جوت جگائے اسے دیکھ رہا تھا۔ کتنے حسین جذبے تھے جو آنکھوں سے عیاں تھے۔ وہ جھینپ کر پیچھے ہٹی۔

”نہیں اب نہیں پلیز ماہین۔“ اُس نے ماہین کو کندھوں سے اپنی طرف گھمایا تھا۔ ”بہت انتظار کروایا ہے ما......“ ماہین نے اُسے گھورا۔ ”مطلب مار ہی ڈالا تھا تم نے تو ماہین۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”سنو!“ شہیر نے اس کے ہاتھ تھام کر دو خوب صورت کنگن اُس کے ہاتھ میں ڈال دیے۔ ”عید مبارک ہو۔“

”آپ کو بھی۔“ وہ دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی۔

”اور میرا تحفہ؟“ شہیر نے ہاتھ پھیلایا۔

”یہ ماسی آپ کا تحفہ ہے۔“ وہ زندہ دلی سے مسکرائی تھی اور باہر عید کا چاند بھی مسکرا اٹھا تھا۔

......☆☆......

اصفا فیصل

یقین کا موسم

”میرے جذبات اتنے بے مول نہیں ہیں عاصمہ کہ میں الفاظ کے ترازو میں تولوں۔“ ”پھر بھی وردہ جن سے پیار کرتے ہیں کم از کم ان کے علم میں تو یہ بات ہو۔“ ”نہیں اور تمہیں میری قسم، تم اس بات کا تذکرہ......

عید کی مناسبت سے لکھی گئی ایک تحریر، افسانے کی صورت

"میں نے ہجر میں آس کے پودے لگائے ہیں، یقین وگمان سجائے ہیں۔"

"واہ جی واہ کیا بات ہے وردہ جی کی۔" عاصمہ نے شرارت بھری نظروں سے وردہ کو دیکھا تھا۔

وردہ ابھی ابھی واش روم سے نکلی تھی اُس نے لپک کر اُس سے ڈائری چھینی تھی۔

"شرم تو آتی نہیں کسی کی ڈائری پڑھتے ہوئے۔" وردہ نے ڈائری الماری میں رکھتے ہوئے کن انکھیوں سے اُسے گھورا۔

"جس نے کی شرم، اُس کے پھوٹے کرم۔" عاصمہ نے ٹھنڈی آہ بھری اور کھڑی ہوگئی۔

"تم کو تو اللہ ہی پوچھے۔" وردہ نے جیسے ہار مانی۔

"ہاں بھئی ہم جیسے لوگوں کا اللہ ہی پُرسانِ حال ہے۔" عاصمہ اب بھی ڈھٹائی سے مسکرا رہی تھی۔

"توبہ ہے بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو۔" وردہ دھیرے سے مسکرائی۔

"اچھا بھئی مجھے کام ہے میں چلی۔" عاصمہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اتنی جلدی...... تو پھر آنے کی کیا ضرورت تھی۔" وردہ کو اُس کا اتنا جلدی جانا بالکل اچھا نہ لگا تھا۔

"وردہ بی بی ہم ضرورت کے تحت نہیں، صرف محبت میں چلے آتے ہیں۔ افسوس کہ آپ نے ابھی تک ہمیں پہچانا ہی نہیں۔"

"ارے عاصمہ ناراض مت ہو، بیٹھو ناں۔ تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" وردہ نے منت بھرے انداز میں کہا۔

"جلدی بولو بھیا آفس سے آنے والے ہیں، میں گھر پر نہیں ہوں گی تو انہیں اچھا نہیں لگے گا۔" عاصمہ نے عجلت بھرے انداز میں کہا۔

"ایک تو یہ بھیا نہ ہو گئے تلوار ہو گئے، جو ہر وقت سر پر سوار رہتے ہیں۔"

"ارے ارے کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔"

"صحیح کہہ رہی ہوں۔ دن ہو، رات ہو، تمہارے انس بھیا میرے دل و دماغ پر سوار رہتے ہیں۔" وردہ نے جس بات کو کہنے کے لیے کیا کیا الفاظ سوچ رکھے تھے انجانے میں کسی بھی طرح عاصمہ کو اپنی دل کی بات بتا ہی دی۔

"اب یہ منہ تو بند کرلو، مکھی چلی جائے گی۔" وردہ عاصمہ کے ہونق منہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ذرا مجھے چٹکی تو کاٹنا، کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔"

"یہ لو۔" وردہ نے جھٹ سے اُسے چٹکی کاٹی تو وہ اچھل کر رہ گئی۔

"اوئی ماں! میں تو مذاق کر رہی تھی۔ بچی اتنی زور سے چٹکی کاٹی ہے۔" عاصمہ نے بازو سہلاتے ہوئے کہا۔

"مگر میں مذاق نہیں کر رہی، بالکل سیریس ہوں۔"

"ہم م م...... اب میں سمجھی یہ ڈائری میں شاعری......" عاصمہ کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ وردہ نے کشن اٹھالیا تھا اُسے مارنے کے لیے عاصمہ جلدی سے ہنستے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی پر جاتے جاتے اُسے منہ چڑانا نہیں بھولی تھی۔

☆......☆

عاصمہ گھر آئی تو حسبِ معمول بھیا آچکے تھے۔ بوا جی کچن میں شام کی چائے کے ساتھ لوازمات تیار کر رہی تھیں۔ پاپا حسبِ معمول اسٹڈی روم میں تھے۔

عاصمہ اور وردہ کے پاپا دونوں بھائی تھے۔ اُن کی ایک ہی بہن تھی جو لاہور میں رہتی تھی، سال دو سال بعد چکر لگا ہی لیتی تھیں۔

پاپا آرمی کے ریٹائرڈ آفیسر تھے۔ ایک ایکسیڈنٹ میں اپنی شریکِ حیات اور اپنی ٹانگیں کھو چکے تھے۔

وردہ کے پاپا کا اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔ ان کی دونوں ہی بیٹیاں وردہ اور سعیعہ بڑی فرمانبردار تھیں۔ اپنے خاندانی گھر میں دونوں فیملیز اپنے اپنے پورشنز میں سیٹل تھیں۔ کسی قسم کا کوئی بھی مسئلہ نہیں تھا مگر معاشی خوش حالی ہر لحاظ سے وردہ کے پاپا کے گھر کی واضح تھی۔ اُن کے رہن سہن میں بھی فرق تھا، جس کو بہر حال عاصمہ دل ہی دل میں محسوس کرتی تھی۔

عاصمہ کے پاپا ایک انا پرست فوجی آفیسر تھے۔ اسی لیے وہ بھائی سے کسی بھی قسم کی مدد کو اپنی انا پر تازیانہ محسوس کرتے تھے، اسی طرح وردہ کے پاپا کو بھی اپنے بھائی کا وقار اور بھرم بہت عزیز تھا۔

معاشی حالات میں فرق ہونے کی وجہ سے کبھی بھی عاصمہ نے وردہ کے لیے، اُس بھائی کا ساتھ نہ سوچا تھا اور آج سے پہلے وردہ نے کبھی ظاہر بھی نہیں کیا بلکہ وہ خاندانی شادیوں کے خلاف تھی اور اب اچانک......

☆......☆

تایا ابو کی طرف لان میں آج سب جمع تھے۔ چھٹی کا دن تھا۔ چھٹی کے دن کبھی تایا ابو کی طرف سے اور کبھی چاچو کی طرف سے ٹی پارٹی ارینج ہوتی تھی، سعیعہ، چاچو کے آرمی کے قصے سننے کے لیے چاچو کی جان کھا رہی تھی۔ وردہ اور عاصمہ بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ انس تایا ابو سے ملکی سیاست پر گفتگو کر رہا تھا۔ تائی امی اور بوا سودے کی لسٹ بنا رہی تھیں کہ اچانک وردہ کو شرارت سوجھی اور اس نے جان بوجھ کر شٹل انس کی طرف اچھالی اور شٹل بھوکے شیر کی طرح لپک کر چائے کی پیالی میں غڑ غوں کرنے لگی اور اُس نازک سی شٹل کے گرنے سے انس جہاں ہڑبڑایا، وہیں چائے نے آسمانی شرٹ پر نقش و نگار بنا دیے۔

سعیعہ، وردہ اور عاصمہ کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا۔ تایا ابو بھی مسکرانے لگے تائی امی نے ڈانٹا۔

"یہ کیا حال کر دیا بچے کا۔ لے کر شرٹ کا ستیاناس کر دیا۔"

"سوری امی وہ غلطی سے اس طرف آگئی۔" وردہ نے منمناتے ہوئے کہا۔

انس ایکسیوز می کہہ کر اٹھ کر چلا گیا اور یوں ایکدم سے جیسے سارے رنگ ہی پھیکے پڑ گئے۔

☆......☆

انہی دنوں پھوپو کے لاہور سے آنے کا پروگرام بنا۔ پھوپو کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ زہرا، فہد اور ناصر۔ اُن کے آنے سے خوب رونق ہوگئی تھی۔

وہ سب یا تو کبھی وردہ کے پورشنز میں جمع ہو جاتے یا کبھی سب عاصمہ کی طرف، سب فی الحال فارغ تھے سوائے انس کے۔ انس کی بینک جاب تھی عموماً وہ شام چھ بجے تک گھر آجایا کرتا تھا۔ اس دن چھٹی تھی اور سب نے انس کو گھیرا ہوا تھا۔

"آپ ہمیں کہیں لے کر ہی نہیں جاتے۔ آج کا کوئی پروگرام بنائیں۔ ہمیں گھومنے جانا ہے۔" زہرا نے کافی استحقاق سے انس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ وردہ بھی وہیں موجود تھی۔ اُس کو زہرا کا یہ انداز اچھا نہیں لگا۔ وردہ کو خود معلوم نہیں تھا کہ انس اُس کو اچھا لگتا ہے۔ وہ تو جب اُسے عاصمہ نے کہا کہ بھائی کی جاب پکی ہوگئی ہے۔ اب جلد ہی اُن کی شادی کرنے کا پروگرام ہے۔ تب اُسے احساس ہوا کہ وہ جو خاندان میں شادیوں کے خلاف تھی، نہ جانے کب سے انس کے لیے دل میں سوفٹ کارنر لیے بیٹھی تھی۔

"سی ویو چلتے ہیں۔" سعیعہ نے کہا۔

"ہاں ٹھیک۔" فہد نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ارے اتنے سارے لوگ ایک گاڑی میں تو نہیں جاسکیں گے۔" زہرا نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"پاپا سے گاڑی کی چابی میں لے لوں گی۔"
وردہ نے فوراً آئیڈیا دیا۔

"او کے ڈن! ایک گاڑی میں ڈرائیو کرلوں گا اور ایک ناصر۔ کیوں ٹھیک ہے ناصر۔" انس نے کہا۔

"ٹھیک ہے بٹ مجھے راستہ نہیں پتا، آپ گاڑی ساتھ ساتھ ہی رکھیے گا۔" ناصر نے رضامندی ظاہر کی۔

"اور واپسی میں پزاہٹ۔" زہرا نے فرمائش کی۔

"ہرگز نہیں۔ میری جیب یہ فضول خرچی برداشت نہیں کرسکتی، سوری۔" انس کی اس بات پر زہرا شرمندہ ہوگئی اور وردہ کو اس کے چہرے کا رنگ دیکھ کر بڑا مزہ آیا۔

☆......☆

شام چار بجے تک بوا نے کھانے پینے کا سامان تیار کر کے ان کے حوالے کردیا تھا۔ سب تیار ہو کر بڑے جوش میں نکلے۔

انس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر زہرا بیٹھ گئی۔ پیچھے فہد بیٹھ گیا۔ دوسری گاڑی میں ناصر، رمشہ، سعیہ اور وردہ بیٹھ گئیں۔

زہرا کی تیاری آج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بلیک شیفون کے سوٹ میں اُس کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔ وردہ نے بھی موسم کی مناسبت سے سی گرین کلر کا سوٹ زیب تن کیا تھا مگر زہرا کو انس کے ساتھ بیٹھا دیکھ اس کا موڈ آف ہوگیا۔ حالانکہ انس نے وردہ کو آواز بھی دی کہ تم بھی ہمارے ساتھ ہی آجاؤ مگر اُس نے "نو تھینکس" کہہ کر انکار کردیا۔

"ارے اس کو کیا ہوا۔" انس نے حیرانگی سے زہرا سے پوچھا۔

"کیا معلوم۔" زہرا نے کندھے اُچکائے۔

پورا رستہ گانے گاتے، انجوائے کرتے گزر رہا تھا۔ بس ایک وردہ ہی تھی جو چپ چاپ بیٹھی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔" عاصمہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"راستے سے پین کلر لے لیتے ہیں۔" ناصر نے کہا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں ضرورت نہیں۔" ناصر نے انس کو کال کی کہ آگے کسی میڈیکل اسٹور سے پین کلر لینی ہے۔ وردہ کے سر میں درد ہے۔ راؤنڈ اباؤٹ پر جا کر انس کی گاڑی نے ٹرن لیا اور رک گئی۔ انس گاڑی سے نکل کر اسٹور پر گیا۔ واپسی میں اُس کے ہاتھ میں منرل واٹر اور پین کلر تھی۔

"کیا ہوا وردہ۔" انس نے فکرمندی سے پوچھا۔ انس کے فکرمند ہونے سے وردہ کو یک گونہ سکون ملا تھا مگر اچانک اس کی بیک پر جب زہرا نے بے فکری سے ہاتھ رکھ کر گاڑی کے شیشے سے اندر جھانکا تو وردہ کے تاثر بگڑ گئے۔

"کچھ نہیں بس تھوڑا سا درد تھا۔ شکریہ آپ نے زحمت کی۔" وردہ کا ایسا رویہ دیکھ کر انس نے عاصمہ کو پین کلر اور منرل واٹر کی بوتل پکڑا دی۔

☆......☆

سی ویو پہنچ کر سب پانی میں چلے گئے۔ وردہ سامان کے پاس بیٹھی رہی اور دور سے سب کو تفریح کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ نہ جانے اس کا دل اس قدر برا کیوں ہو رہا تھا۔ وہ انس کے ساتھ کسی کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس سے پہلے جب بھی پھوپو وغیرہ کی فیملی آئی، انس اپنی پڑھائی میں مصروف ہوتا تھا۔ اتنا گھل مل نہیں پاتا تھا اور شاید وردہ نے کبھی اِس طرح سے سوچا بھی نہیں تھا اور کوئی اریب قریب اپنے سگے رشتے دار بھی نہیں تھے، جن کا گھر میں آنا جانا ہوتا۔ بنیادی طور پر انس کے ساتھ کسی کا وجود اُسے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک اُس نے دیکھا کہ زہرا انس کو کھینچ کر پانی میں گرانے

کی کوششیں کر رہی ہے۔

"پتا نہیں کیوں مجھے نوکر سمجھ رکھا ہے۔ یہاں بٹھا کر خود تو سب چلے گئے ذرا میں بھی سمندر دیکھ لوں۔ بھاڑ میں جائیں انس اور زہرا۔" بڑبڑاتے ہوئے وردہ پانی کی طرف بڑھنے لگی تو انس نے دور سے وردہ کو جاتے ہوئے دیکھا۔

"عجیب پاگل لڑکی ہے ہم سب یہاں ہیں اور محترمہ نہ جانے کہاں جا رہی ہیں۔" زہرا نے انس کی نظروں کے تعاقب میں انس سے کہا۔

"چلو بھئی بہت مستی ہوگئی اب ذرا پیٹ پوجا کرلیں۔" فہد نے شور مچایا۔

"چلو چلو۔" سعیہ بھی کہنے لگی۔

"ایک منٹ تم لوگ چلو میں وردہ کو لے کر آتا ہوں۔" اس سے پہلے کہ زہرا کچھ کہتی وہ آگے بڑھ گیا۔

"ارے زہرا تم کہاں جا رہی ہو۔ تم چلو ہمارے ساتھ۔" عاصمہ نے زہرا کا ہاتھ کھینچا۔ اس کو بھی زہرا کا ہر وقت انس کے ساتھ چپکنا پسند نہیں آرہا تھا۔

"وردہ کہاں گم ہو؟ کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔"

"آپ یہاں کیوں آئے۔"

"کیوں میرے یہاں آنے پر پابندی ہے۔"

"نہیں پابندی کیوں ہوگی۔" وردہ کو بلاوجہ کے سوال جواب سے چڑ ہونے لگی۔ انس کو ایسا لگا جیسے وردہ کو اُس کا آنا اچھا نہیں لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا وردہ جانے کے لیے قدم بڑھا چکی تھی۔

گھر واپس آتے ہوئے بھی وردہ خاموش ہی رہی۔

☆......☆

"السلام علیکم!" انس نے ابو کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، انس بیٹا بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

چاند اور تم

بہت دور، تنہا تنہا
اپنی دنیا میں مگن
کسی گہری سوچ میں
سب سے لاتعلق
کوئی دیکھے یا نہ دیکھے
کسی کی پروا نہیں
جیسے!!!
چاند اور......
تم!!

علی رضا عمرانی

"جی ابو کہیے۔"

"بیٹا تمہاری ماں زندہ ہوتی تو یہ بات تم سے کہتی مگر اب چونکہ میں ہی تمہاری ماں ہوں اور میں ہی تمہارا باپ۔ نفیسہ (پھوپو) نے مجھ سے ناصر کے لیے عاصمہ کا رشتہ مانگا ہے۔ اب چونکہ تم اُس کے بڑے بھائی اور دوست ہو، تو اس سے مشورہ کر کے مجھے جواب دے دو۔"

"ابو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ناصر تو بہت اچھا لڑکا ہے مگر عاصمہ تو ابھی چھوٹی ہے۔"

"ہاں فی الحال منگنی کا ارادہ ہے۔ عاصمہ کی شادی تو میں تمہاری شادی کے بعد کروں گا۔ تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتا دو۔"

"ابو آپ میرے لیے جو فیصلہ کریں گے وہ میں تہہ دل سے قبول کروں گا۔"

"بیٹا تم نے دل خوش کردیا۔ آج کل کے دور

میں ایسی فرمانبردار اولاد ہی میرا مال وزر ہے، پھر بھی زہرا یا وردہ میں سے کوئی ایک نام بتا دو۔ دونوں اپنی ہی بچیاں ہیں۔ میں عاصمہ کی منگنی اور تمہارا نکاح ایک ہی دن کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی بہن اور بھائی پر بھروسہ ہے کہ وہ مجھے انکار نہیں کریں گی مگر چونکہ زندگی تم نے گزارنی ہے تو فیصلے کا حق بھی تمہیں ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے ابو میں آپ کو سوچ کر بتا دوں گا۔"

"ہاں ضرور بیٹا، پوری زندگی کا سوال ہے۔"

اب انس عجیب مشکل سے دوچار ہو گیا تھا۔ ذہن بار بار وردہ کی گردان کرتا۔

"وردہ۔" بچپن سے ساتھ رہتے ہوئے کبھی اُس میں کوئی برائی نہیں دیکھی تھی۔ نازک سی من موجی سی ہنس مکھ سی یہ کزن انس کو بہت پیاری تھی مگر گزشتہ دنوں سے اُس کا رویہ کچھ عجیب سا تھا اور "زہرا۔"

اُس کی ہر بات، ہر انداز میں پیار، محبت والہانہ پن جھلکتا تھا۔ نہیں میں کسی کے سر زبردستی مسلط نہیں ہو سکتا مگر اس دل کا کیا کروں جو وردہ ہی کا ساتھ مانگتا ہے۔

☆.....☆

رات کو تایا ابو کی طرف سب کے لیے کھانے کا اہتمام تھا۔ ہلکے فیروزی سوٹ میں سوگوار سی وردہ دل میں اُتری جا رہی تھی۔

"بھئی آج کا کھانا میری بیٹی نے تیار کیا ہے۔" تایا ابو نے فخر سے کہا۔

"واہ سعدیہ تم تو بہت ہوشیار ہو گئی ہو۔" انس نے جان بوجھ کر سعدیہ کا نام لیا۔

"جی نہیں یہ سب وردہ نے بنایا ہے۔" عاصمہ نے کہا۔ پھوپو نے وردہ کو پیار کیا۔

"بہت ہی شاندار خوشبو ہے۔ یقیناً مزیدار ہو گا۔ زہرا تم بھی بہن سے کچھ سیکھو۔"

"امی بس آپ تو ہر جگہ شروع ہو جایا کریں۔" زہرا نے نخوت سے کہا۔

"بس ٹھیک ہے، کوئی خاص مزیدار نہیں۔" فہد نے وردہ کو چڑایا۔ اسی نوک جھونک میں کھانا ختم ہوا۔ جب واش بیسن سے ہاتھ دھو کر انس ہٹا تو کھانے کی تعریف کرنے کے لیے وردہ پاس کچن میں چلا آیا۔

"میرے جذبات اتنے بے مول نہیں ہیں۔ عاصمہ کہ میں الفاظ کے ترازو میں تولوں۔"

"پھر بھی وردہ جن سے پیار کرتے ہیں۔ کم از کم اُن کے علم میں تو یہ بات ہو۔"

"نہیں اور تمہیں میری قسم، تم اس بات کا تذکرہ کسی سے نہیں کرو گی۔"

"کرنا پڑے گا۔ گھر میں شادی کی باتیں ہو رہی ہیں اور تم۔"

"ہرگز نہیں۔" وردہ نے عاصمہ کی بات کاٹی۔

"بھائی آپ کو کچھ چاہیے۔" اچانک عاصمہ کی نگاہ انس پر پڑی۔

"ہاں..... نہیں بس میں تھک گیا آرام کروں گا۔ یہی بتانے آیا تھا تمہیں۔"

"او کے بھائی میں ابھی چائے لے کر آتی ہوں۔"

کمرے میں آ کر بھی انس کو سکون نہیں ملا۔ اچھا تو یہ بات تھی۔ وردہ کسی کو پسند کرتی ہے۔ جبھی آج کل اتنی پریشان ہے اور یقیناً اُس کو پتا ہو گا کہ گھر میں آج کل کیا چل رہا ہے، اس لیے وہ زیادہ پریشان ہے۔

"بھائی چائے۔" عاصمہ اُس کے کمرے میں چائے لے آئی تھی۔

"عاصمہ!!"

"جی بھائی۔"

''وردہ کو کہنا پریشان نہ ہو۔ جو وہ چاہتی ہے وہی
''

''جی بھائی۔'' عاصمہ نے بے ساختگی سے کہا۔
''ہاں۔ عاصمہ جب تم دوست ہو کر اپنی دوست
خوشی چاہتی ہو تو میں کیوں نہیں۔' دل ہی دل میں
بنا اور پھر گھٹن اتنی بڑھی کے کمرے کی ہر کھڑکی
کھول دی مگر اضطراب کم نہ ہوا۔

☆......☆

اگلے دن سے رمضان شروع ہو گئے۔ مصروفیات
جیسے اس سب کچھ بھول گیا مگر فیصلہ...... فیصلہ وہ کر
تھا۔ محبت کا مطلب پانا ہی تو نہیں ہوتا۔ محبت میں
کر بھی سب کچھ پایا جاسکتا اور پھر تیزی سے ماہِ
یام گزرنے لگا۔ آج اٹھائیسواں روزہ تھا۔ اُسے
صاحب نے بلا بھیجا تھا۔
''ابو میں اندر آجاؤں۔'' انس نے اسٹڈی روم
دروازہ کھٹکھٹایا۔
''ہاں بیٹا۔''
''آپ نے بلوایا تھا۔''
''بیٹا جی کچھ کہا تھا میں نے آپ سے اور آج
ایک ماہ سے اوپر ہو گیا۔ آج کل میں عید ہو جائے گی
اور تمہاری پھوپھو بھی عید کے فوراً بعد لاہور چلی جائیں
گی۔''
''سوری ابو میں کل رات کو انشاء اللہ آپ کو بتا
دوں گا۔'' اس نے عجلت بھرے انداز میں کہا اور فوری
طور پر تراویح کا بہانہ بنا کر اٹھنے لگا۔
''بیٹا بھلے تم کل بتانا مگر سوچ سمجھ کر۔''
''جی ضرور ابو۔''

☆......☆

آج چاند رات تھی۔ پورے گھر میں صفائیاں
شروع تھیں۔ افطار کے بعد ذرا دیر کو فراغت ہوئی تو
عاصمہ ذرا کی ذرا بیٹھی تو اسے انس نے پکارا۔
''عاصمہ میری بات سنو۔''
''جی بھائی۔'' وہ یکدم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
''تم کو ناصر کیسا لگتا ہے۔'' آج ماں کی کمی اُسے
بے تحاشہ محسوس ہو رہی تھی۔ اگر امی ہوتیں تو عاصمہ
سے آج یہ سوال وہ خود کرتیں۔
''بھائی آپ رو رہے ہیں۔'' عاصمہ نے بھائی
کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
''ہاں آج امی کی بہت یاد آرہی ہے۔''
''بھائی مت روئیے، مجھے یقین ہے آپ اور ابو
میرے لیے جو فیصلہ کریں گے، وہ میرے لیے
بہترین ہوگا۔''
''شکریہ بہنا، آج تم نے میرا مان اور بھی بڑھا دیا۔
تمہارے جانے کے بعد تمہاری بہت کمی محسوس ہوگی۔''
''جی نہیں وردہ آپ کو اتنا پیار دے گی کہ آپ کو
میری یاد ہی نہیں آئے گی۔''
''وردہ...... مگر وہ تو کسی اور کو پسند کرتی ہے۔''

مارے حیرت کے انس کا منہ کھلا رہ گیا۔
''بھائی، بھائی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ
محترمہ تو دل و جان سے آپ پر فدا ہیں۔''
''مگر وہ اُس دن تایا جان کے ہاں ڈنر کے بعد
وردہ کچن میں جو تم سے کہہ رہی تھی۔''
''ہاں تو وہ آپ کے ہی بارے میں تو کہہ رہی
تھی کہ جب آپ خود اس کی محبت نہیں سمجھتے تو وہ
کیوں بتا کر اپنے جذبات کو بے مول کرے۔''
''اچھا تو وہ اس کا اکھڑا اکھڑا انداز......'' جیسے
انس کچھ یاد کرنے لگا۔
''وہ تو آپ کے ساتھ زہرا کو اتنا فری دیکھ
کر......''
''اچھا بچو ٹھیک ہے، ہم سے استادی۔'' انس کو
سب کچھ سمجھ آ گیا تھا۔
''آئی لو یو پیاری بہن۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں

کہ تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی۔'' فرطِ جذبات سے عاصمہ کے ماتھے پر بوسہ دے کر وہ اسٹڈی روم کی طرف لپکا۔

''ابو۔''

''جی کہیے برخوردار۔''

''وہ ابو آپ نے کچھ پوچھا تھا تو۔''

''ہاں ہاں بیٹا کیا ہوا۔ فیصلہ کرلیا آپ نے شاید۔''

''ابو! عاصمہ آپ کے فیصلے پر راضی ہے اور میرا فیصلہ ہے کہ..... گھر کی بات گھر میں ہی رہے۔''

اُس کا مطلب میجر صاحب اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔

''وردہ۔''

''جی ابو۔'' یہ کہہ کر وہ رکا نہیں بلکہ تیزی سے باہر نکلا تھا۔

☆.....☆

'تو وردہ جی اب کچھ سزا آپ کو بھی ملنی چاہیے۔' یہ سوچ کر وہ وردہ کے پورشن میں آیا۔

وردہ چھت پر تھی۔ وہ آسمان پر چاند ڈھونڈ رہی تھی۔ اچانک اُس کے بہت قریب آکر انس نے ہولے سے کہا۔

''وردہ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' ایکدم سے اپنے اتنے قریب انس کو پا کر وہ دھک سے رہ گئی اور پھر اپنے حواس بحال کرتے ہوئے اعتماد سے بولی۔

''جی کہیے میں سن رہی ہوں۔''

''وہ ایسا ہے کہ مجھے زہرا اچھی لگنے لگی ہے۔''

''تو آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں زہرا کے پاس ہی جائیے۔'' دکھ سے دل پھٹا جارہا تھا۔ آنکھوں کے آنسو چھپانے کے لیے وردہ نے منظر سے ہٹنا چاہا۔

''آپ ہی تو میری ماہ جبیں، زہرہ جبیں اور دل

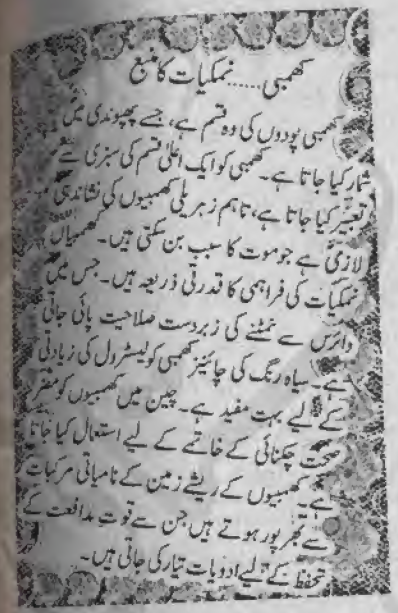

کی مکیں ہیں۔'' اس کے آنسو دیکھ کر انس ساری شرارت اور سزا بھول گیا تھا۔

''جی۔'' وردہ پلٹی۔

''جی اور اب سے نہیں، بچپن سے۔'' انس نے جیب سے ایک اَدھ کھلا گلاب نکال کر وردہ کے آگے کیا اور خود گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ایک ہاتھ کمر پر باندھ لیا۔

''وردہ جی آپ اس خاکسار انس سے شادی کریں گی؟''

''م..... م..... م..... سوچ کر بتاؤں گی۔'' وردہ گلاب کا پھول لے کر ہنستی ہوئی بھاگنے لگی۔

''ارے ایک منٹ سنو تو۔'' اُس کی بات پر وردہ ایک دم پلٹی تھی۔

''عید مبارک۔'' یہ سُن کر وردہ شرما کر نیچے بھاگ گئی اور انس نے دونوں ہاتھ فضا میں کھول کر ایک طمانیت بھری سانس لی تھی۔

.....☆☆.....

رنگ فسانہ

شوکت تھانوی

پھر وہی عید

اب پھر عید کا چاند نظر آگیا اور چاند دیکھتے ہی بجائے اس کے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہم ہاتھ مل مل کر یہ سوچنے لگے کہ آخر اس مرتبہ کیا ہوگا۔ ابھی تو خیر بازار میں ہیں لیکن گھر پہنچے نہیں کہ کوئی جوتے کا تقاضا کرے گا اور کوئی.....

حال سے جڑا ماضی کا آئینہ، بطورِ خاص عید نمبر کے لیے

پارسال! تو کسی نہ کسی طرح غصہ کر کے گھر بھر کو سر پر اُٹھا کر اپنی اور سب کی جان ایک کر کے عید کو اگر ٹالا نہیں تو ایک حد تک پھیکا ضرور کر دیا تھا مگر اب پھر عید کا چاند نظر آ گیا اور چاند دیکھتے ہی بجائے اس کے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہم ہاتھ مل مل کر یہ سوچنے لگے کہ آخر اس مرتبہ کیا ہوگا۔ ابھی تو خیر بازار میں ہیں لیکن گھر پہنچے نہیں کہ کوئی جوتے کا تقاضہ کرے گا اور کوئی ٹوپی کا۔ کسی طرف سے شیروانی لانے کی دھمکی دی جائے گی یعنی گھر پہنچتے ہی ہماری حیثیت اس لاوارث لاش کی سی ہوگی، جس سے گدھ چمٹے ہوئے ہوں اور یہاں یہ حال ہے کہ حسب معمول جیب میں بس اللہ کا نام تھا اور قرض مانگنے کے تمام دروازے بلکہ اسی سلسلے میں چلنے کے لیے بھی اکثر سڑکیں بند تھیں۔ مگر گھر والے ان باتوں کو کیا جانیں۔ ان کے لیے تو عید آئی تھی خواہ وہ عید ہمارے لیے موت ہی کی حیثیت کیوں نہ رکھتی ہو۔ بچے تو بچے گھر کی بڑی بوڑھی یعنی بیگم صاحبہ سے اور بھی ڈر معلوم ہوتا تھا کہ وہ فہرست تیار کیے بیٹھی ہوں گی اور ہمارے گھر پہنچتے ہی دودھ، میوہ، شکر، سویاں، عطر، تیل وغیرہ کا کھاتہ کھول کر بیٹھ جائیں گی۔ پھر خواہ ان کا شوہر چوری کرے یا ڈاکہ ڈالے، مرے یا جیے۔ بہرحال ان کی عید ہونا چاہیے۔ مع ان کے بال بچوں اور ان کی رعایا کے جو صبح ہی سے ہم کو دعائیں دے دے کر کوسنا شروع کریں گے۔

ان خیالات نے ہمارا سر چکرا دیا اور ہم بمشکل تمام پارک کی ایک بینچ تک پہنچ سکے جہاں ذرا سکون بھی تھا اور جہاں سے عید کا باریک چاند بھی نظر نہ آتا تھا۔ مگر یہ خیالات ہنوز ذہن کو تپ دق میں مبتلا کیے ہوئے تھے کہ آخر عید کو کیونکر ٹالیں اور گھر والوں کو عید سے کس طرح باز رکھیں۔ گردا مارے دماغ کہ اس پریشانی کے عالم میں بھی وہ لاجواب اسکیم ذہن میں آئی کہ ہم یکا یک اچھل پڑے اور ایک مرتبہ پھر ذرا تازگی کے ساتھ اس اسکیم پر نظر ثانی کرنے کے بعد ہم نے بے ساختگی کے ساتھ تالی بجا کر کہا: ”بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔“

اب نہ ہم کوئی فکر تھی نہ وہ پہلا سا اضمحلال بلکہ اب تو عید کے چاند پر بھی ہم مسکرا رہے تھے کہ بڑے دعوے سے آپ نکلے تھے ہماری بُدھیا بٹھانے مگر اب دیکھنا ہے کہ آپ کیا کر سکتے ہیں ہمارا۔“

اس وقت جی چاہتا تھا کہ چاند پر قہقہے لگائیں مگر وہ بے چارہ خود ہی ہماری اسکیم کے بعد ماند ہو چکا تھا اور آخر کار ہمارے مقابلے کی تاب نہ لا کر غائب ہو گیا۔ تو ہم بھی اٹھے اور ٹہلتے ہوئے تانگہ اسٹینڈ تک پہنچ کر گھر کے لیے ایک تانگہ کیا۔ حالانکہ جہاں سے تانگہ کیا تھا وہاں سے گھر کا فاصلہ ایک فرلانگ سے شاید ہی کچھ زیادہ ہو۔ مگر اس وقت مصلحت یہی تھی کہ اتنی دور کے لیے تانگہ کیا جائے۔ چنانچہ تانگے پر بیٹھ کر ہم نے نہایت مردہ آواز میں تانگے والے سے کہا ”ذرا آہستہ آہستہ آغا باقر کے امام باڑہ تک پہنچا دو۔“

تانگے والے نے تعمیل حکم میں اپنے گھوڑے سے سڑک پر آتو بنوانا شروع کیا اور یہ مختصر راستہ بمشکل تمام پانچ منٹ میں طے کر کے ہمارے گھر کے سامنے تانگہ پہنچ گیا۔ تو ہم نے پھر تانگے والے سے کہا۔

”ذرا دروازے پر کھڑے ہو کر غلام نبی کو آواز دے دو۔“

تانگے والے نے غلام نبی کو آواز دے کر جو بلایا تو وہ چاند کی خوشی میں اچھلتا ہوا نکلا۔ مگر ہم کو تانگے پر بدحواس پڑا ہوا دیکھ کر کچھ بجھ سا گیا اور دوڑ کر ہمارے پاس آتے ہوئے بولا۔ ”ارے میاں کو کیا ہوا؟“

ہم نے اشارہ سے اور کچھ زیر لب اس سے کہا کہ ہم کو پکڑ کر اندر لے چلے۔ لہٰذا اس نے ہمارا بازو اپنے کندھے پر رکھ کر ہم کو تانگے سے اتارا مگر ہم پھر بھی لڑکھڑائے تو دوسری طرف تانگے والے نے سہارا دیا اور ہم گویا ان دونوں پر لدے ہوئے دروازہ تک پہنچ گئے۔ جہاں غلام نبی نے آواز دے کر گھر

میں پردہ کرا دیا تاکہ تانگے والا بستر تک ہم کو لے جا سکے اور ایسا ہی ہوا بھی کہ ہم کو ان دونوں نے لا کر بستر پر لٹا دیا جہاں ہم آنکھیں بند کر کے اور ہاتھ پیر بالکل ڈھیلے کر کے پڑ رہے۔

اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ گھر بھر کو سانپ سونگھ لیا ہے۔ البتہ بیگم بے قرار تھیں کہ کسی طرح تانگے والا باہر جائے تو ہماری بالیں پر آئیں۔ لہٰذا تانگے والے کے جاتے ہی بیگم بدحواس، سراسیمہ اور سٹپٹائی ہوئی ہمارے قریب آ کر بیٹھ گئیں اور حکیم اجمل خان مرحوم کی طرح نبض دیکھ کر پھر پیشانی ٹٹول کر غلام نبی سے کہا:

”یہ ان کو آخر کیا ہوا؟“

غلام نبی نے آہستہ سے کہا: ”کیا جانیں بی بی یہ میاں کو کیا ہو گیا ہے۔ تانگے والا کہتا تھا کہ پارک میں تانگہ کیا تھا اور وہاں سے اسی طرح بے حال تانگے پر پڑے ہوئے آئے ہیں۔“

بیگم نے تشویش سے کہا: ”گھر سے تو اچھے بھلے گئے تھے اور اس وقت بھی بخار و خار تو ہے نہیں مگر بالکل نڈھال پڑے ہیں۔ ہائے اللہ یہ ان کو آخر ہوا کیا؟“

غلام نبی نے کہا: ”روزہ بھی تو نہیں رکھا جو یہ کہا جائے کہ روزہ کھول کر طبیعت بگڑ گئی۔“

عین اسی وقت چھوٹا بچہ دوڑتا ہوا آیا اور اپنی پوری آواز میں کہا۔ ”اماں! ابا ہماری ٹوپی لائے؟“

بیگم نے اس کا منہ دباتے ہوئے کہا۔ ”کمبخت، باوا کا تو یہ حال ہے اور اس کو ٹوپی کی پڑی ہے۔ خدا ان ہی کو اچھا کر دے میری عید تو یہی ہے۔“

ہم اس بے ہوشی کے عالم میں یہ جملہ سنتے ہی مارے خوشی کے روبصحت ہونے والے تھے کہ پھر ہم کو عید کا خیال آ گیا اور ہم نے اپنی حالت کو بدستور رکھا۔ بیگم نے غلام نبی کے ہاتھ بچہ کو وہاں سے ہٹوا دیا اور ہدایت کر دی کہ یہاں کوئی شور و غل نہ ہونے پائے۔

اس کے بعد گھبرا گھبرا کر ہمارا سر اور سینہ سہلانے لگیں لیکن جب دیر تک افاقہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو پھر گھبرا کر غلام نبی کو بلا لائیں اور اس سے کہا۔

”غلام نبی ذرا جا کر بڑی سرکار سے کہہ دو کہ ان کا یہ حال ہے۔ میرے تو ہاتھ پیر پھولے جاتے ہیں۔ اللہ ان بچوں پر رحم کرے۔ اپنے حبیب کا صدقے میں۔“

غلام نبی نے بھی وفاداری کے ساتھ کہا۔ ”ہاں بی بی اللہ ہمارے میاں کو اچھا کر دے۔ کیسے نڈھال پڑے ہیں کہ دیکھا نہیں جاتا۔“

غلام نبی تو ادھر بڑی سرکار یعنی خوشدامن صاحبہ کو اطلاع کرنے چلا گیا اور اِدھر بیگم نے تمام ورد و وظائف، پھر آیت کریمہ اور اس کے بعد غالباً گلستان اور بوستان پڑھ پڑھ کر دم کرنا شروع کر دیا۔ وہ بے چاری اس وقت سخت بدحواس تھیں اور تمام گھر کی چہل پہل اس طرح غائب تھی کہ گویا ہم واقعی خلد آشیاں ہونے کے قریب تھے۔ بچے اپنی اپنی جگہ پر سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ بیگم بھی اس وقت عید کے سامان کی فہرست سے کیا، اپنے تن من سے بے خبر تھیں اور دامن پھیلا پھیلا کر ہماری صحت کی بھیک مانگ رہی تھیں کہ اتنے میں ہمارا سسرالی قافلہ غلام نبی کے ساتھ ہی آ پہنچا۔

خوشدامن صاحبہ بدحواسی کے ساتھ اپنے پانچے سنبھالتی ہوئی تشریف لائیں اور بیگم سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہوا آخر ان کو۔“

بیگم نے ہاتھ ملتے ہوئے رونی صورت بنا کر کہا۔ ”میں کیا جانوں یہ ان کو کیا ہو گیا ہے۔ اچھے بھلے گھر سے گئے تھے اور اس حالت میں تانگے میں پڑ کر آئے ہیں۔ جب سے ہوش ہی نہیں ہے۔“

بڑی سالی نے ہمارے سر میں انگلیاں پھرا کر کہا۔ ”کچھ نہیں کمزوری ہے۔“

چھوٹی سالی نے کہا۔ ”یا اللہ! تو میرے دولہا بھائی کو اچھا کر دے۔ بھئی کل تو گئے تھے، مجھ کو

ستا رہے تھے۔"

سالے صاحب نے کہا۔ "کہیے تو ڈاکٹر کو بلالاؤں؟"

ہم نے اپنے دل میں کہا کہ مارا اس نے، یہ ڈاکٹر کی فیس بھی دلوائے گا۔ اس سے عید ہی منالی جاتی۔ لہٰذا ہم نے کراہتے ہوئے کروٹ لینے کی جو کوشش کی تو سب ہماری طرف جھک پڑے اور خوشدامن صاحبہ نے ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "منجھلے دولہا۔"

چھوٹی سالی نے ہاتھ سہلا کر کہا۔ "دولہا بھائی۔"

بڑی سالی نے کہا۔ "کیسے ہو بھیا۔"

ہم نے نیابت کے ساتھ آنکھیں کھول کر کہا: "پ..... پانی۔"

یہ سننا تھا کہ جیسے بھونچال آگیا۔ خوشدامن صاحبہ سے لے کر بیگم تک اور بیگم سے لے کر چھوٹی سالی تک سب ہی پانی کے لیے جھپٹ پڑیں۔ کوئی کسی سے ٹکرایا۔ کسی نے کٹورا سنبھالا کوئی صراحی لے کر لپکا۔ اور آخر کار خوشدامن صاحبہ نے ہم کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر پانی پلایا۔

ہم نے ایک گھونٹ پیا کچھ چھلکایا کچھ منہ سے ٹپکایا اور پھر آنکھیں کھول کر گویا سب کو دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں سلام کیا تو خوش دامن صاحبہ نے پھر منہ کے قریب جھک کر کہا۔

"کیسے ہو میرے لال؟"

ہم نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ اچھے ہیں۔ سالے صاحب بدستور ڈاکٹر لانے پر تلے ہوئے تھے، کہنے لگے۔

"میری رائے میں ڈاکٹر کو ضرور دیکھ لینا چاہیے۔"

اگر ہم اس وقت تندرست ہوتے تو ان حضرت کی خبر لے لیتے مگر اب ہم نے اشارہ سے ان کو قریب بلاتے ہوئے نہایت مری ہوئی آواز میں کہا۔

"میں..... اب اچھا ہوں۔"

خوشدامن صاحبہ نے کہا: "آخر یہ تم کو ہوا کیا تھا۔"

ہم نے اسی آواز میں رک رک کر کہا۔ پارک میں یکا یک چکر آیا اور پھر..... پھر خبر نہیں کہ کیا ہوا۔"

بیگم نے کہا۔ "ان کو ایک مرتبہ اور بھی اسی طرح چکر آیا تھا، جب بڑے ننھے کی مسلمانی تھی مگر جب سے پھر یہ بات نہ ہوئی تھی۔"

خوشدامن صاحبہ نے بیگم سے کہا۔ "اچھا تم تھوڑا سا گرم دودھ لاؤ۔ یہ کمزوری ہے اور کچھ نہیں۔"

دودھ کی واقعی ضرورت تھی اس لیے کہ بھوک کے مارے آنتیں ایک دوسرے کو کھائے جاتی تھیں۔ اگر پہلے سے یہ خبر ہوتی تو بازار میں پہلے کچھ لے کر کھا لیتے۔ اس کے بعد بیمار پڑتے۔ بہرحال دودھ لایا گیا اور باوجود اس کے کہ بھوک کے مارے غٹا غٹ اس کو پی جانے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے بن بن کر اور ہر گھونٹ پر اصرار کرا کرا کے بمشکل تمام وہ پاؤ بھر یا اس سے کم دودھ پیا۔

اس وقت بارہ کا عمل تھا اور عید میں چند ہی گھنٹے باقی تھے۔ لہٰذا دودھ پی کر ہم نے بالکل تندرست ہو جانا مناسب نہ سمجھتے ہوئے کمزوری سے اپنی گردن ڈال دی۔ یہاں تک کہ خوشدامن صاحبہ نے سالے صاحب کے ساتھ اور سب کو تو واپس کر دیا اور خود ہمارے ہی یہاں رہ گئیں اور ہم عید کی طرف سے اطمینان کر کے سو گئے۔

ظاہر ہے کہ دوسرے دن عید تھی مگر ہم اپنے بستر پر گاؤ تکیہ لگائے عید منا رہے تھے اور خوشدامن صاحبہ عید کے اخراجات ہمارا صدقہ سمجھ کر اپنے ذمہ لیے ہوئے تھیں۔

خدا کرے کہ آئندہ سال بھی ایسی ہی کوئی صورت ذہن میں آجائے۔

بہرحال اس سال تو ہم عید سے صاف بچ گئے اور بیگم بھی اس قدر خوش رہیں کہ کسی عید میں ہم نے ان کو اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔

.....☆☆.....

سلسلۂ خاص

ارم زہرا

چاند میرا منتظر

ہمارے اطراف میں سانس لیتے کرداروں سے سجے، سلسلہ وار ناول کی تیرہویں قسط

گوہر ایک بھرے پُرے، روایات سے جڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ قسمت اسے رضا بیگ جیسے بندے سے یونیورسٹی میں ملا دیتی ہے۔ گوہر شادی کے بعد رضا کے گھر آ جاتی ہے۔ رضا کی ایک بہن سمیکہ ہے اور ماں صولت بیگم، باپ سائیں رئیس بیگ ہیں۔ صولت بیگم خواہشوں کے حصول کے لیے ہر ناجائز حربہ استعمال کر کے تن تنہا اس خاص مقام تک پہنچی ہیں۔ جہاں امیر زادے ان کی ایک ابرو کی جنبش پہچانتے ہیں۔ سمیکہ بیگ ماں کا دایاں بازو بننے کے لیے تیار ہے۔ دونوں ماں بیٹی ہائی سوسائٹی کی جان بن چکی ہیں۔ گوہر کا بھائی فاضل ہے۔ مطالعے کا بے حد شوقین ہے مگر انٹر تک تعلیم حاصل کر پایا ہے۔ گھر میں ذکیہ بیگم کی راجدھانی ہے۔ بہوویں قدسیہ اور کشور اس گھر میں آل اولاد سمیت ہنسی خوشی، دکھ سکھ بانٹتی زندگی گزار رہی ہیں۔ ذکیہ بیگم کی نواسی ہانیہ بھی یہیں رہتی ہے جو اپنی ماں کے انتقال کے بعد باپ سے بھی دور ہے۔ گوہر کے لیے آہستہ آہستہ رضا کے گھر کا ماحول اجنبی ہوتا جا رہا ہے۔ بہت سارے سوال جواب طلب ہیں اور جب اس پر کچھ حقیقت آشکار ہونے لگی تو ہانیہ ماموں فاضل کے لیے کڑھتی رہتی ہے۔ کسی نہ کسی طور اس نے فاضل کو آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے راغب کر لیا۔ فاضل کی کتابوں سے دوستی اسے لائبریرین کے روپ میں لے آئی۔ سائیں رئیس اپنے گھر سے اب بھی دور ہیں۔ سمیکہ اور صولت بیگم دن بدن کھل کر گوہر کے سامنے آتی جا رہی ہیں۔ رضا کی گوہر سے محبت عروج پر ہے۔ جو ماں بیٹی کے لیے فکرمندی کا باعث ہے۔ سمیکہ فاضل میں دلچسپی لے رہی ہے مگر فاضل اس کے ناز و ادا کے جال میں کسی طور پر نہیں آ پا رہا۔ ذکیہ بیگم کے گھر کی رونقیں آباد ہیں، ہانیہ امتحان میں بہت اچھے نمبر حاصل کر لیتی ہے۔ آگے پڑھنے کے لیے اسکول سے اسے اسٹیٹس دینا پڑتا ہے اسکول والے اس کے لیے الوداعی پارٹی کا اہتمام کرتے ہیں اور ..... فاضل کی ملاقات فرح نامی لڑکی سے ہوتی ہے۔ وہ اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ ہانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں کا ماحول اسے خوب راس آتا جا رہا ہے اور اُس کی علمی تشنگی سیراب پانے لگی ہے۔ سمیکہ شہرت کے زینے پر قدم رکھ چکی ہے۔ اُس کا بوتیک اعلیٰ پیمانے پر لانچ ہو چکا ہے۔ صولت بیگم، سمیکہ کو اپنی جانشین بنانے کی پوری تگ و دو میں مصروف ہیں۔ سمیکہ ہائی سوسائٹی موو کر رہی ہے مگر اُس کا خون اُسے اکثر احتساب کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ قسمت کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ گوہر اور رضا سائیں رئیس سے ملنے آبائی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں اُن کا خوب خیر مقدم کیا گیا۔ سائیں رئیس اپنے آبائی گوٹھ سے الیکشن لڑنے کی پوری تیاری کر لیتے ہیں۔ اس بات کی خبر صولت بیگم کو ہو جاتی ہے۔ سمیکہ کی بوتیک کے فنکشن میں اس کی سہیلی سارہ، کچھ بڑے لوگوں کی نظروں میں آ جاتی ہے۔ صولت بیگم سے جب سارہ کے متعلق بات ہوتی ہے تو وہ سمیکہ پر سارہ کو لائن پر لانے کے لیے دباؤ ڈالتی ہیں۔ سمیکہ کو اُس سے خود سے نفرت محسوس ہوتی ہے مگر صولت بیگم شاطر کھلاڑی ہیں۔ وہ خود سے سارہ کو فون کر کے گھر بلا لیتی ہیں اور پھر اُسے لفظوں کے سحر میں جکڑ کے روشنیوں کی دنیا کے خواب اُس کی آنکھوں میں بھر دیتی ہیں۔ ہانیہ کے کالج میں مشاعرے کا انعقاد ہوتا ہے، جس میں ایک سلیبر یٹی ''ریان علی'' مہمانِ خصوصی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اُس کی شخصیت ایک سحر لیے ہوئے تمام طلبہ و طالبات پر فسوں پھونک دیتی ہے۔ طلال اس موقع پر بھرپور داد لیتا ہے اور پھر ہانیہ کا انداز ریان علی کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے، سمیکہ اپنے ڈیزائن کردہ ملبوسات کے ریجیکٹ ہونے پر تلملا اٹھتی ہے۔ صولت بیگم اُسے اپنا بزنس چمکانے اور خود کو کامیاب کرانے کے گُر سکھانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ سمیکہ کے لیے دوراہے، ایسی صورت حال بہت خطرناک ہے، گوہر، سمیکہ کو پریشانی شیئر کرنے کا کہتی ہے تو وہ بپھر جاتی ہے اور سارا غصہ اُسی پر نکل جاتا ہے۔ گوہر اس موقع پر حیران ہے مگر کچھ کہہ نہیں سکتی۔ وہ رضا کی محبت میں یہ ہتک آمیز سلوک برداشت کر جاتی ہے، ریان علی، ہانیہ سے محبت کرنے لگتا ہے، ہانیہ اچانک اس محبت کو پا کر گومگو کیفیت سے دوچار ہے۔ فاضل، فرح کے بلانے پر اس کے گھر جاتا ہے تو اُسے پتا چلتا ہے کہ اُس کی کتابوں سے دوستی کی وجہ اُس کی تنہائی اور ماں کی بیماری ہے۔ اُس کی ماں اچانک بیمار ہو جاتی ہیں تو وہ فاضل ہی کی مدد سے انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کراتی ہے۔ شیخ حنیف کو سمیکہ کی سہیلی، سارہ اُس کی بوتیک لانچنگ تقریب میں پسند آ جاتی ہے۔ صولت بیگم، شیخ صاحب کی فرمائش پر سارہ پر ڈورے ڈالنے کے لیے سمیکہ سے کہتی ہیں۔ آخر کار سمیکہ، سارہ کو اُن کے جال میں پھانسنے کے لیے پلاننگ شروع کر دیتی ہے۔ ہانیہ چاہ کر بھی ریان علی کی محبت کا جواب، محبت سے نہیں دے سکتی۔ وہ خوشبو سے التجا کرتی ہے کہ وہ ریان سے کہے کہ اُسے فون یا میسج نہ کرے۔ خوشبو ریان تک اُس کا پیغام لے کر پہنچتی ہے تو وہ اپنی طوفانی محبت کا اظہار کر دیتا ہے۔ گوہر میکے جاتی ہے تو صولت بیگم اور سمیکہ، سارہ کو شیخ حنیف کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ اچانک سے گوہر کے آنے پر سارہ، شیخ کے ہاتھوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ صولت بیگم، رضا کے آگے کچھ اس طرح اپنی مظلومیت کی کہانی سناتی ہیں کہ رضا نہ چاہتے ہوئے بھی گوہر سے بدظن ہو جاتا ہے اور اُسے ماں اور شیخ حنیف سے معافی مانگنے کو کہتا ہے۔ گوہر عجیب کشمکش و بیچ میں مبتلا ہے۔ فرح کی ماں کی حالت غیر ہے اور وہ اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں زندگی اور موت سے نبرد آزما ہے۔ ایسے میں فاضل..... **اب آپ آگے پڑھیے:**

گوہر کو اپنے منتشر اعصاب سمیٹنے کے لیے مضبوط قوتِ ارادی کی ضرورت تھی۔ گلاس وال دھکیل کر آتے رضا کو دیکھ کر وہ بے ساختہ پلٹی۔ اندر کے جبس اور گھٹن کو کم کرنے کے لیے اُسے رضا سے بات کرنا ضروری تھی مگر وہ لاتعلقی سے بیڈ پر لیٹتے ہی آنکھیں موند چکا تھا۔

''رضا آپ کی منفی سوچ نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میرے اندر جو ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہے، اُسے سکون نہیں مل رہا۔'' گوہر نے اپنائیت کے احساس سے رضا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''تو دور کر دو اپنی اس وحشت کو اور امی سے معافی مانگ لو۔ ویسے بھی وہ تم سے بڑی ہیں۔ ان کے آگے جھکنے سے تمہاری قدر اور بڑھے گی۔'' گوہر کا ہاتھ آہستگی سے ہٹاتے ہوئے رضا بولا تھا۔

''رضا میں غلط نہیں ہوں، آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں۔ میں امی سے معافی مانگ لوں گی۔ مجھے اس بات پر اعتراض نہیں ہے مگر رضا سچائی کا بھی تو سامنا کرنا چاہیے۔ آخر کب تک ہم اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے رکھیں گے؟'' گوہر کا چہرہ غصے کی حدت سے تپ چکا تھا۔

''تم چاہتی کیا ہو آخر۔ جب میں نے کہہ دیا ہے کہ میری ماں غلط نہیں ہے تو پھر تم کیوں انہیں زبردستی غلط ثابت کرنا چاہتی ہو؟'' رضا کا چہرہ ایک پل کے لیے متغیر ہوا اور گوہر کی طرف بڑھا ہاتھ واپس اپنے پہلو میں گر گیا۔

''کاش رضا اُس دن آپ سارہ کو دیکھ لیتے، اُس کے معصوم چہرے پر کس قدر کرب تھا، میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ یک دم بجھ سی گئی تھی، بالکل اُدھ موئی ہو گئی تھی۔ ایک پل کے لیے تو میں بھی ڈر گئی تھی رضا۔'' گوہر نے تڑپ کر رضا کی طرف دیکھا۔ وہ رضا کو قائل کرنے کی بھرپور کوششوں میں تھی مگر رضا کوئی بھی ایسی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا جو صولت بیگم کے خلاف ہو۔

''گوہر اگر میرا یہاں لیٹنا تمہیں ناگوار گزر رہا ہے تو میں اٹھ جاتا ہوں۔'' رضا نے قدرے تیزی سے تکیہ سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''رضا ایسا نہیں ہے، بس میں تو آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔''

''پلیز گوہر اس سے پہلے کہ میرے اعصاب چیخ جائیں، میرا ذہن منتشر ہو جائے، تم مجھے اکیلا ہی چھوڑ دو تو بہتر ہو گا۔''

''ٹھیک ہے رضا پھر آپ آرام کیجیے میں ہی یہاں سے چلی جاتی ہوں۔'' گوہر آہستگی سے قدم اٹھاتی کمرے سے ملحقہ بالکونی میں آ گئی۔

یہ وقت بھی بڑا ظالم ہے۔ نت نئے تجربات ہماری جھولی میں ڈالتا چلا جاتا ہے۔ آج ایسا لگ رہا ہے رضا کے ساتھ گزرا ہر پل، جیسے بے معنی ہو گیا ہو۔ رضا کی ذات کے کتنے خوب صورت رنگ جو رضا کے ساتھ میں نے گزارے ہیں، رضا کی رفاقت پر مجھے ہمیشہ ناز رہا ہے مگر آج یہ کیا ہوا؟ رضا کے سنگ گزرے لمحے، محبت بھری ساعتیں بے حد عام سی کیوں ہو گئی ہیں؟ گوہر کو اپنے تپتے رخساروں پر ہوا عجیب خشک خشک محسوس ہو رہی تھی۔

☆.....☆

فیشن شو اپنے عروج پر تھا مختلف ممالک سے ڈیزائنرز اِس شو میں مدعو تھیں۔ ایک سے ایک خوب صورت ڈریس سامعین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر ڈیزائنر اپنی ثقافت کو جدت کے رنگوں سے آراستہ کر کے ریمپ پر جلوہ

گر کر رہا تھا۔ اس شو میں سبیکہ بھی اپنے بوتیک کو Present کر رہی تھی۔

''اوہ تو آپ کی رسائی یہاں تک بھی ہوگئی۔ کیسی چل رہی ہے آپ کی پریکٹس؟'' سبیکہ کو ریمپ کے قریب کھڑا دیکھ کر فائق اُس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

''وہاٹ ڈو یو مین بائے پریکٹس۔ آئی ایم پرفیکٹ ڈیزائنر، ہاں یہ الگ بات ہے کہ آپ پرفیکٹ کو پرفیکٹ نہیں سمجھتے۔'' سبیکہ کا انداز مجروح کر دینے والا تھا۔

''اپنے ڈیزائن میں جب تک جدت نہیں لائیں گی تب تک آپ کامیاب نہیں ہو پائیں گی۔ میں ہی کیا، کوئی بھی آپ کے ساتھ ڈیل کر کے، اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہے گا۔'' فائق نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی بات وضاحت سے پیش کر دی۔

''یہ تو وقت بتائے گا مسٹر فائق کہ کون صحیح ہے اور کون غلط؟'' غصے کی آگ میں جلتا سبیکہ کا سرخ تپتا چہرہ فائق سے چھپ نہیں سکا تھا۔

''مجھے وہ لڑکیاں بہت پسند ہیں جو اپنی جیت کی خاطر کچھ بھی کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ آگے بڑھنے کی لگن اور جستجو کا راستہ سیدھا ہو پھر یقیناً کامیابی مقدر بن جاتی ہے۔'' فائق خدشات کی زنجیر میں بندھی اِس نازک سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اپنی جیت کے زعم میں ہارتی جا رہی تھی۔

''مسٹر فائق میرا راستہ سیدھا ہو یا آڑھا ترچھا، میں منزل تک پہنچنے کا ہنر جانتی ہوں۔ بس صحیح وقت کی منتظر ہوں۔'' سبیکہ کے لہجے میں شکستگی کا عنصر نمایاں تھا جسے اُس نے کمال مہارت سے چھپا لیا۔

''اصل میں، میں گھما، پھرا کر بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ شاید اسی لیے آپ مجھ سے بدگمان نظر آ رہی ہیں۔'' ہلکی سی مسکراہٹ فائق کے لبوں پر رقص کرتی صاف محسوس ہوئی۔

''ایکسکیوزمی! میں خوش فہمی اور بدگمانیاں نہیں پالتی۔ مجھے خود پر بھروسہ ہے اور اِس بل پر میں آگے بڑھ رہی ہوں۔ آج نہیں تو کل کامیابی میرا مقدر ہوگی۔'' کھوکھلی ہنسی کے ساتھ سبیکہ نے تمسخرانہ نظروں سے فائق کو دیکھا۔

''چیلنج کر رہی ہو مجھے؟'' فائق سبیکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بولا۔

''ہاں فائق میں تمہیں چیلنج کرتی ہوں۔ ایک دن میں آسمان کا سب سے روشن ستارہ ہوں گی اور تمہارے جیسے تو بہت سے میرے اردگرد ٹمٹماتے مدھم پڑتے جائیں گے لیکن میں سب کی توجہ کا مرکز ہوں گی۔'' سبیکہ اپنے اندر کی جھنجھلاہٹ کو دباتی اُسے تنبیہ کر رہی تھی۔ جب کہ فائق اُس کی بے داغ شفاف رنگت، متناسب سراپا، خوبصورت نین نقش کو فراموش کیے، اُس کے لہجے کی کاٹ اور بہادری کو داد دے رہا تھا۔ اس کے نزدیک ایک نازک سی لڑکی جس کے اندر ہزار قیامتیں چھپی ہوئی ہیں اس کو یکسر بھلا کر اپنی انا کی خاطر جیت کو اپنا مقدر بنانے چلی ہے۔ یہ ناقابلِ یقین تھا۔

''اور مس سبیکہ میں اُس وقت کا انتظار کروں گا۔'' فائق کے لبوں پر احسان کر دینے والی مسکراہٹ تھی جسے سبیکہ نے ناگواری سے دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے تو پھر یوں ہی سہی، ایک دن میں اپنی جیت کا تاج سر پر سجائے تمہارے سامنے آؤں گی اور تمہیں ہارتا ہوا دیکھوں گی۔'' سبیکہ کندھے اچکاتی مسکراتے ہوئے فائق کے نزدیک آ چکی تھی۔

''امید کرتا ہوں کہ یہ خوشی آپ کو جلد نصیب ہو؟'' یہ کہتے ہوئے وہ زہریلے انداز میں ہنسا تھا اور پھر آہستگی

سے پلٹ گیا۔

اپنی ہتک کا احساس سبیکہ کی روح پر آگ برسا رہا تھا۔ وہ زخم خوردہ ناگن بن گئی تھی۔ ''جانے کیوں یہ فائق ہمیشہ ہی مجھے سلگاتا رہتا ہے۔'' مگر اگلے ہی پل وہ دھیرے سے مسکرائی یہ مسکراہٹ کسی ناگن کی پھنکار سے مشابہ تھی۔

☆.....☆

گولڈا سمتھ کا قول ہے کہ ''نکمی سے نکمی بات کی تائید کے لیے بھی کوئی نہ کوئی حمایت میں نکل ہی آتا ہے۔''

صالحہ نے بردبار انداز میں کہتے ہوئے عماد اور جبران کو دیکھا جو مسلسل اِدھر اُدھر کی ہانک رہے تھے۔

''صالحہ آپی کبھی تو بخش دیا کرو یار۔'' جبران نے ہونٹ سکیڑ کر صالحہ کو دیکھا۔

''کچھ لوگ سمجھ اور عقل سے عاری ہوتے ہیں۔'' حفصہ نے عماد کی جانب طنزیہ جملہ پھینکا۔

''جانتا ہوں میں، تم یہ کس لیے کہہ رہی ہو؟'' عماد اطمینان بھری سانس بھر کر بولا۔

''تو پھر ضد پر کیوں اڑے ہو، فضول خواہش کا کوئی مصرف بھی تو ہو۔'' حفصہ سچ مچ جذباتی نظر آ رہی تھی۔

''خیریت تو ہے دونوں میں کیا کوئی ناراضگی چل رہی ہے؟'' صالحہ نے دونوں کو کریدا۔

''کوئی ناراضگی نہیں ہے آپی۔'' حفصہ کی نگاہیں بوجھل سی ہو کر عماد کے سراپے میں الجھ گئیں۔

''ہاں، ہاں کوئی بات نہیں ہے۔'' عماد بھی منہ بناتا ہوا بولا۔

''سیانے کہتے ہیں کہ اتنا نہ روٹھو کہ منانے والا خود روٹھ جائے۔'' صالحہ نے دونوں کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔

''بائے داوے ان دونوں میں سے کون روٹھا ہے؟'' جبران نے کن اکھیوں سے عماد اور پھر حفصہ کو دیکھا۔

''میں ناراض ہوں کیوں کہ آدمی کی عقل کی دلیل اس کا قول ہے اور اصل کی دلیل اس کا فعل ہے اور مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ عماد.....''

''کیوں عماد نے ایسا کیا کہہ دیا؟'' ہانیہ جو فریج سے آئس ٹرے نکالنے آئی تھی، وہیں رک گئی۔

''کچھ نہیں ہانیہ آپی میری ایک چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے اس نے۔ دل تو چاہ رہا ہے اِس کی چوٹی پکڑ کر موڑ دوں۔'' عماد مصنوعی غصے سے بولا۔

''یعنی راز یہ کھلا کہ یہ دونوں خود کو عقلمند ثابت کرتے ہوئے ایک دوسرے سے ناراض ہیں۔'' جبران نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

''چلو بھئی ایک دوسرے کو مناؤ۔ یوں لڑتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' ہانیہ نے دونوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی۔

''میں نہیں مناؤں گی اِس پاگل کو، جانتی ہیں ہانیہ بجو.....'' ابھی حفصہ کچھ کہتی کہ عماد بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور حفصہ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''چھوڑ دو مجھے جنگلی بلے۔'' ایک ہی جست میں حفصہ خود کو عماد کے حصار سے چھڑاتی ہانیہ کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

''حفصہ، بولو، بولو تم کیا بتا رہی تھیں ہانیہ بجو کو۔'' صالحہ نے سخت تنبیہی نظروں سے عماد کو گھورا۔

''بتا دو، تم پر اعتبار کر کے میں نے دنیا کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔'' عماد خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''آخر مسئلہ کیا ہے؟'' ہانیہ نے باری، باری دونوں کو دیکھا۔

''کچھ خاص نہیں بجو، آج صبح یونیورسٹی جانے کے بجائے اِس کا سارا وقت چھت پر کبوتروں کے ساتھ گزرا ہے۔'' حفصہ سنجیدگی کے ساتھ قدرے روٹھے لہجے میں بولی۔

''اوہ ہو، لاحول ولا۔'' ''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' صالحہ تیز آواز میں بولی۔

''میں بھی چلتی ہوں۔ مامی نے آئس منگوائی تھی۔'' ہانیہ پیروں میں سلیپر ڈالتی ہوئی بولی۔

''تم نے کیوں کیا ایسا میرے ساتھ۔'' عماد دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اُس کے سامنے کھڑا اُسے گھور رہا تھا۔

''تم جیسا کٹھور انسان تو میں نے پوری دنیا میں کہیں نہیں دیکھا۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر اتنے پیارے رشتوں کو تنہا کر کے......'' ابھی وہ کچھ آگے ہی کہتی کہ جبران قریب آ گیا۔

''تم دونوں کی لڑائی سنجیدگی لیے ہوئے ہے۔ سب خیریت تو ہے نا؟'' جبران عماد کو گھورتے ہوئے بولا۔

''نہیں بگ بی، بس یونہی میں اکیلے پکنک پر جا رہا ہوں ناں، تو یہ مجھ سے ناراض ہو رہی ہے۔'' عماد نے حفصہ کے متبسم چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا جہاں ایک رنگ جا رہا تھا تو دوسرا آ رہا تھا۔

''تم دونوں پاگل ہو اور پاگلوں کا میرے نظریے کے مطابق کوئی علاج نہیں ہوتا۔'' جبران ایک بار پھر دونوں کو گھورتے ہوئے غرایا اور کمرے سے نکل گیا۔

''اب بولو، عماد کیوں اتنی بڑی بات سب سے چھپانا چاہ رہے ہو؟'' حفصہ نے استفسار کیا۔

''میں چاہتا ہوں تم سب کے بجائے امی اور دادو کو راضی کرو، مگر افسوس تم تو پورے شہر میں ڈھنڈورا پیٹنے نکل پڑیں۔'' عماد، حفصہ کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو کیا کروں عماد، کیسے خود کو سمجھاؤں۔ میں یہ بات خود تسلیم نہیں کر پا رہی کہ......''

''تم جانتی ہو گزرتے وقت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مسائل کا انبار لگتا جا رہا ہے۔ کل کو اگر یہ بڑے مسائل بن کر سامنے آ گئے تو اُس وقت میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔'' حفصہ سے نظریں چرائے اب وہ قدرے سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

''میں سمجھ نہیں پا رہی کہ تم آخر چاہتے کیا ہو؟'' حفصہ کے لہجے میں اب تشویش کا رنگ غالب نظر آ رہا تھا۔

''وقت آنے پر یہ بھی بتا دوں گا۔ فی الحال تو مجھے جس جاب کی آفر ہوئی ہے اُس کے بارے میں، میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں اور اب تم رہنے ہی دو، میں خود ہی امی سے بات کر لوں گا۔'' عماد بجھے لہجے میں کہتا پلٹ گیا تھا۔

''سنو تو عماد۔'' حفصہ کے دل پر ایک چبھن اور کھٹک سی ہونے لگی تھی۔

''میری ساری خوش فہمیوں کی لو میں بجھ کر رہ گئیں ہیں، جو میں نے انجانے میں تمہاری ذات سے وابستہ کی تھیں۔ کوئی بات نہیں حفصہ مجھے اِس بات پر یقین ہے کہ بہتا پانی خود اپنے راستے بنا لیتا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ جذبے کامل ہوں۔'' ایک عجیب نامانوس سی افسردگی سے بجھا وہ پلٹ چکا تھا۔

عماد کے ایسے تیور دیکھ کر حفصہ سچ مچ سٹپٹا گئی تھی۔ قدرے معذرت خواہ نظریں وہ کمرے میں دوڑاتی ہوئی وہیں صوفے پر براجمان ہو گئی۔

☆......☆

ناؤ اب ندی میں مجھ کو چھوڑ دینی چاہیے
وقت ساحل پر گزرتا جا رہا ہے رائیگاں

حیف مجھ پر کیا کروں میں یہاں
جا چکی ہے فصل بہار
باسی پھولوں، خشک مرجھائی ہوئی کلیوں کے ہار
محو رنجِ انتظار
شور لہروں کا بڑھا
گر رہے ہیں پتے زار زار

''ٹیگور کی یہ نظم مجھے ہمیشہ سے ہی بہت پسند ہے۔'' فرح عجیب سے احساسات میں گھری خالی نظروں سے اس حصے کو دیکھ رہی تھی جہاں اُس کی امی لیٹا کرتی تھیں۔ خالی بستر، خالی کمرہ، خاموشی کا راج جیسے اُس کے اندر تک سناٹے سے اتر گئے تھے۔

''جانتا ہوں امی کے ساتھ گزرا تمہارا لمحہ لمحہ قیمتی تھا مگر اب کیا کرو گی۔''

''اس میں قسمت کی خطا ہے نہ زمانے کا قصور
غم تو انسان کے جینے کی سزا ہوتے ہیں''

فرح اپنے اندر کی تلخی کو اندر ہی سمیٹتے ہوئے بولی۔

''بے کار کی باتیں بند کرو۔ تمہارا دکھ بہت بڑا ہے لیکن حقیقت کا سامنا کرنے کی خود میں ہمت پیدا کرو۔'' فاضل کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔

''میں تھک گئی ہوں زندگی سے، دل چاہتا ہے موت آ جائے۔ سگے رشتوں کا احساس ہی تو انسان کو زندہ رکھتا ہے اور میرے پاس تو کوئی نہیں بچا۔'' وہ بے اختیار رونے لگی۔

''اوہ خدایا! اس طرح تو تم مریض بن جاؤ گی۔ بہادر بنو یار، زندگی کی کٹھنائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرو، جیسے کرتی آ رہی تھیں۔''

''فاضل ایک سوچ مجھے الجھا رہی ہے؟'' وہ ناک پونچھتے ہوئے بولی۔

''کیسی سوچ فرح؟'' فاضل بے یقین نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''ایدھی یا کوئی اور فلاحی ادارہ...... اگر میں وہاں شفٹ ہو جاؤں؟'' لبوں سے ٹوٹتے لفظ پل بھر میں ڈھ گئے اور وہ بے اختیار رونے لگی۔

''کیا؟'' فاضل کے اعصاب پر بڑا زوردار دھماکا ہوا تھا مگر وہ جلد ہی اپنے اعصاب کو سنبھالتا ہوا بے اختیار اُس کی طرف بڑھا۔

''نہیں فرح بالکل بھی نہیں۔ میں تمہیں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانے دوں گا؟'' فرح کے زرد پڑتے چہرے پر فاضل کی نگاہیں مرکوز تھیں۔

''تو پھر میں کیا کروں فاضل۔ موت اچانک ایک زوردار آندھی کی طرح آئی اور مجھ سے میرے جینے کا مقصد چھین کر لے گئی۔''

''جانتا ہوں فرح؟'' فاضل نے غم کی شدت سے اپنا سر جھکا لیا۔

''میں کن عذاب ناک لمحات سے گزر رہی ہوں، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں اور اُس پر اکیلے پن کی اذیت

بھی۔ فاضل میری رگوں میں خون کے بجائے آتشی سیال گردش کر رہا ہے۔''

''فرح، فرح زندگی سے غافل نہیں ہو سکتیں تم۔ یہ وقت کٹھن ضرور ہے مگر گزر ہی جائے گا ایک دن۔'' فاضل جذباتی ہو رہا تھا۔

''تو پھر میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔ اکیلے گھر میں تنہائیوں کا مقابلہ کرنے سے بہتر ہے کہ میں کوئی فلاحی ادارہ جوائن کر لوں۔ اس طرح میری بے مقصد زندگی کو، کوئی مقصد تو مل جائے گا۔'' وہ مغموم انداز میں ہنسی جیسے اپنی زندگی کا مذاق اڑا رہی ہو۔

''فرح اگر تم چاہو تو میں تم سے نکاح کر سکتا ہوں۔'' فاضل اپنے دل کی بات ان حالات میں فرح تک پہنچائے گا، اُس کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔

''جی!'' فرح نے بے یقینی سے فاضل کے سراپے پر نظر ڈالی۔ اُس کا بدن ایک خفیف سے ارتعاش کا شکار ہوا تھا، جیسے کوئی سمندر کی اندرونی پُرجوش لہر، اوپری ساکن سطح کو ہولے سے چھو لے۔

''ہاں فرح میں تم سے نکاح کا متمنی ہوں۔ سوچ رہا تھا تمہاری امی کا سوئم ہو جائے تو تم سے بات کروں مگر تمہاری اتنی غیر حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔'' فاضل کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور پریشانی کی لکیریں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔

''مجھ پر احسان کرنا چاہتے ہیں؟'' فرح کے چہرے پر گہرا سکوت بکھرا ہوا تھا۔

''نہیں فرح، میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ میری تو خواہش تھی کہ تمہاری امی سے تمہارا ہاتھ مانگوں مگر جانے کیوں میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا۔'' فاضل کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ بہت ٹھہرے ٹھہرے انداز میں گویا تھا۔

''نہیں فاضل آپ تو میرے لیے مسیحا بنے ہیں۔ اگر آپ میری زندگی میں نہیں آتے تو یقین کریں کہ میں اس غم کے بوجھ تلے ہی دب کر مر جاتی۔'' وہ مضطرب ہو کر بولی تھی۔

''تو پھر فرح آپ کا کیا خیال ہے؟'' فاضل کی نظریں اب فرح پر مرکوز تھیں۔ ملال اور تاسف اُسے دیکھ کر بڑھ گیا تھا۔ فرح نے ایک اچٹتی سی نظر فاضل پر ڈالی اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''فاضل میرے دل میں ہزار وسوسے پل رہے ہیں۔ کہیں میں آپ پر بوجھ تو نہیں بن گئی ہوں۔ کہیں آپ نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ مجبوری میں تو نہیں کیا؟'' فرح کی ساری حسیات گویا بیدار ہو گئی تھیں۔

''میں کوئی تمہید نہیں باندھ رہا اور نہ لگی لپٹی رکھنے کا قائل ہوں۔ یہ سچی بات ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہیں اس اذیت کی آگ میں جلتا نہیں دیکھ سکتا۔'' وہ فرح کے چہرے پر پھیلے ٹھہراؤ اور سکوت کا از سرِ نو جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''اور آپ کے گھر والے..... کیا وہ راضی ہو جائیں گے؟'' فرح کا لہجہ، اس کے اندرونی خلفشار کی ترجمانی کر رہا تھا۔

''میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔ گھر والوں کی گارنٹی میں نہیں لے سکتا۔ یقیناً وہ بھی میری پسند کو سراہیں گے؟ مگر تم اپنی بات کہو فرح؟''

''مجھے لگتا ہے آپ جلد بازی کا مظاہرہ کر رہے ہیں؟''

''ٹھیک ہے تم اچھی طرح سے سوچ لینا، پھر مجھے جواب دینا۔ میں نے حالات کی سختیوں، سیاہیوں کو قریب سے دیکھا اور برتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا مجھ پر جب میرے سگے میرے اپنے نہیں رہے تو پھر تم اس بھری دنیا میں اکیلے کیسے رہ پاؤ گی، جہاں تمہارے لیے صرف اجنبیوں کی بھیڑ ہے؟''

''آپ کہہ تو سچ رہے ہیں؟'' فرح نے آہستگی سے کہا۔

''میرا یہ فیصلہ نا انتہا پسندی پر مبنی ہے اور نا ہی جذبات پر، صرف اور صرف محبت اور خلوص پر مبنی ہے۔ زمانہ شناس میں بھی ہوں اور تم بھی۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہتر فیصلہ کرو گی۔'' فاضل کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ وہ دانستہ فرح کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ فرح کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو اُس کے دل پر گر رہے تھے۔

☆.....☆

کھانے کی ٹیبل پر سب ہی کے موڈ آف تھے۔ صولت بیگم قدرے نخوت سے پلیٹ اور چمچ سے کھیل رہی تھیں۔ سیکہ کو بھی زبردستی نیچے بلایا گیا تھا۔ رضا قدرے خاموشی سے کھانا کھانے میں مشغول تھا۔ جب کہ گوہر انتہائی دل گرفتگی کے ساتھ بیٹھی سب کو نوٹ کر رہی تھی۔

''کل میں نے گھر میں شیخ حنیف کو بلایا ہے اور میری خواہش ہے کہ گوہر تم اُن سے معافی مانگو۔'' صولت بیگم مضبوط لہجے میں بولیں۔

''خواہش کیوں امی، آپ اسے حکم دیں۔'' رضا نے ایک ناگوار سی نظر گوہر کے چہرے کی طرف دوڑائی اور پھر اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

''سیکہ تم بھی کل گھر پر رہو گی، شیخ صاحب میرے بزنس پارٹنر ہیں۔ اگر اسی طرح ہم اس واقعے کو فراموش کرتے چلے آئے تو Loss میں چلے جائیں گے۔'' وہ سر جھٹک کر ساڑھی کا پلو صحیح کرنے لگیں۔

اُف اتنی تذلیل؟ میں اِس واقعے کو جتنا بھلانے کے جتن کر رہی ہوں اس کی شدت اتنی ہی بڑھ رہی ہے۔ گوہر نے رحم طلب نظر رضا پر ڈالی مگر نا کام لوٹی۔

''مام میں نکلتی ہوں۔ ایک ضروری میٹنگ ہے؟'' سیکہ، گوہر سے نظریں چراتی ہوئی کھڑی ہو چکی تھی۔

''رک جاؤ سیکہ۔'' گوہر نے قدرے تیز لہجے میں اُسے روکا۔ سیکہ کے مڑتے قدم پل بھر میں ہی رک گئے مگر لفظوں کی ادائیگی نے گویا انکار کر دیا تھا اسی لیے وہ خاموشی سے کبھی گوہر، تو کبھی صولت بیگم کو دیکھ رہی تھی۔

''تم سچائی خود بتاؤ گی یا میں از سرِ نو ذکر رضا سے دہراؤں؟'' گوہر کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

''کیسی سچائی بھابی؟'' سیکہ کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

''یہی کہ تم نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت سارہ کو اُس شیخ حنیف کے سامنے پیش کیا تھا اور تمہارے اِس فعل میں امی بھی اتنی ہی شامل ہیں، جتنی تم.....'' گوہر کا اعتماد آہستہ آہستہ بحال ہوتا جا رہا تھا۔

''اوہ گاڈ! لڑکی تمہاری زبان نے تو قینچی کو بھی مات دے دی ہے۔ دیکھ لیا رضا، تمہاری بیوی، تمہاری ماں اور بہن پر الزام تراشی کر رہی ہے اور تم ہو کہ خاموش بیٹھے ہو؟'' صولت بیگم کا غصہ پھنکارنے لگا تھا۔

''گوہر اب تم ایک لفظ نہیں بولو گی۔'' رضا نے کاٹ دار لہجے میں گوہر کو مخاطب کیا۔

''رضا میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ ایک بار اپنی بہن سے پوچھیے تو سہی۔'' گوہر منمناتے ہوئے بولی۔

''گوہر مجھے تمہارا دماغ درست کرنے میں ایک منٹ لگے گا۔ مگر میں صرف رضا کی وجہ سے خاموش ہوں۔

تمہاری زبان حد سے زیادہ آزاد ہوگئی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اُسے اپنے قابو میں رکھو۔'' صولت بیگم نپے تلے جملے بول رہی تھیں۔ یقیناً رضا کی موجودگی کا اثر تھا ورنہ تو اُن کا دل چاہ رہا تھا اسے شوٹ ہی کر دیں۔

''امی آپ تو معاملات کی سمجھ بوجھ رکھتی ہیں لیکن کبھی سہیکہ کے بارے میں آپ نے سوچا۔ دولت کے حصول کی خاطر آپ نے اُس کو کس راہ پر ڈال دیا؟''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' رضا غصے سے گوہر کا بازو گھسیٹ کر بولا۔

''بھائی یہ ہر بار میرے ہی پیچھے کیوں پڑی رہتی ہے؟'' سہیکہ کو اس وقت اپنا دفاع کرنا سخت کوفت میں مبتلا کر چکا تھا۔

''میں کیا کہہ رہی ہوں، یہ آپ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔'' گوہر نے مشکوک نظروں سے باری باری سہیکہ اور صولت بیگم کو دیکھا۔

''واہ رضا واہ تمہارا بیوی کتنے زعم سے ہمیں برا کہہ رہی ہے اور تم ہو کہ کھڑے، کھڑے سُن رہے ہو۔ مُدل کلاس لڑکی، آخر وہی سوچے گی نا جو اُس کی کلاس کا خاصہ ہے۔ اور لگاؤ غربت کو گلے، دیکھا گلے کا ہار بننے کے بجائے آج پھانسی کا پھندا بن گئی ہے میرے بیٹے کے لیے۔'' صولت بیگم نے اُسے بہت اونچائی سے نیچے پھینکا تھا۔

''اُف۔'' انتہائی دل گرفتگی اور رنجیدگی کے گہرے احساس کے ساتھ گوہر نے رضا کو دیکھا۔ ''رضا آپ خاموشی سے سنتے رہیں گے؟ کچھ نہیں کہیں گے؟''

''گوہر امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آج پہلی بار مجھے تم پر، تمہاری حالت پر افسوس ہو رہا ہے۔ جانے کیوں اپنی احمقانہ باتوں اور اپنی ہی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر تم میری ماں کو غلط ثابت کرنے پر تلی ہو۔'' گوہر کی آنکھوں سے اچانک ہی لاوا ابلنے لگا۔ آج پہلی بار اُس کے رفیق نے اُس کا ساتھ چھوڑا تھا اور اُسے کتنی آسانی سے غلط قرار دے رہا تھا۔

''رضا صرف ایک بار، ایک بار آپ سارہ سے مل لیجیے۔'' گوہر نے اپنی صفائی دینے کی آخری کوشش کی۔

''رات سہیکہ میری بابت سارہ سے گروا چکی ہے، شی از فائن۔ اُسے جاب کی ضرورت تھی گوہر جو اُسے سہیکہ دلوا رہی تھی مگر تمہاری فطری تجسس کی عادت اور میری ماں اور بہن کو بار بار غلط ثابت کرنے کی کوشش نے اُس دن یہ ڈرامہ کھڑا کیا۔ کیا ملا تمہیں اِس سب سے گوہر۔'' رضا کے چہرے پر اذیت ناک کرب تھا۔

اوہ تو پوری منصوبہ بندی کے تحت کام ہو چکا ہے، اپنے جملوں کی کم مائیگی اور بے وقعتی کا اُسے شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ ''رضا میں جانتی ہوں ہزاروں دلیلوں کے باوجود میں آپ کے خدشات دور نہیں کر سکتی۔''

''اب بھی وقت ہے گوہر امی سے معافی مانگ لو۔'' رضا نے اُس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں مجھ سے یہ کہاں معافی مانگے گی۔ کل شیخ حنیف سے مانگ لے۔ بس اِس کے لیے یہی کافی ہے۔ ہم تو اس کے بھلے کی ہی بات کریں گے۔ کیوں سہیکہ؟'' صولت بیگم نے خاموش کھڑی سہیکہ کو ٹوکا۔

''یس مام! بھائی کو غلط فہمی ہوگئی تھی۔ اگر ان کی سارہ سے ملنے کی خواہش ہے تو کل ہم اُسے بھی بلوا لیتے ہیں۔'' سہیکہ مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولی۔

''کبھی کبھی لوگوں کی زبانوں کے کانٹے ہمارے حوصلے کو ڈھیر کر دیتے ہیں۔ رضا میں نے زندگی میں کبھی

غلط کا ساتھ نہیں دیا اور آج بھی نہیں دوں گی۔ بہتر ہوگا کہ اب کوئی مجھ سے اس بارے میں بات نہیں کرے۔''

گوہر بھیگے لہجے میں بولتے ہوئے کرسی سے کھڑی ہوگئی۔

''جب میری ماں کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں تو پھر گوہر میرے لیے بھی تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ مجھے اس بات پر فخر تھا کہ تم میری ماں کی دل سے عزت کرتی ہو مگر آج تم نے میرے فخر کو روند ڈالا۔'' رضا سخت ذہنی اذیت سے دوچار لہجے میں بول رہا تھا۔

''رضا آپ یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں امی کی کتنی عزت کرتی ہوں مگر رضا جو سچائی ہے میں اُسے.....''

''بس کرو گوہر! بہتر یہی ہے کہ اب تم مزید کچھ نہیں بولو گی۔'' رضا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے چپ کرانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے رضا جیسی آپ کی خوشی، میں اس بارے میں اب کوئی بات نہیں کروں گی۔'' گوہر نچلے ہونٹ کا گوشہ دانتوں میں دباتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ہاں رضا آپ اور یہاں پر موجود سبھی لوگ سن لیں کہ میں اُس خبیث شیخ حنیف سے معافی ہرگز نہیں مانگوں گی؟''

''اوہ گاڈ! کس قدر بدتمیز ہے یہ لڑکی۔ میرے بزنس کی بنیادوں کو ہلا کر کتنے زعم سے کہہ رہی ہے کہ معافی نہیں مانگے گی۔ جس عیش و عشرت، آرام و سکون میں یہ وقت گزار رہی ہے، یہ سب میری محنتوں کا نتیجہ ہے۔ یہی شیخ حنیف اور اس جیسے لوگ آج میری زبان کی تیزی کی وجہ سے بزنس پارٹنر بنے ہوئے ہیں۔ مگر اس لڑکی کے پاس تو زبان نہیں گویا سانپ کا ڈنک ہو۔'' صولت بیگم دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے کرسی پر ڈھ گئیں۔

''کیا ہوا امی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔'' سہیکہ فکر مندانہ انداز میں صولت بیگم کی جانب بڑھی۔

''نکل جاؤ گوہر اس گھر سے۔ اِس سے پہلے کہ میں غصے میں کوئی انتہائی قدم اٹھاؤں۔ خود ہی چلی جاؤ یہاں سے۔'' رضا شدید غصے کے عالم میں گوہر کو گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا تھا۔

''رضا یہ کیا بے وقوفی ہے۔ چھوڑیں مجھے آپ سمجھ نہیں رہے، یہ سب ان کی چال ہے۔'' وہ بولتی جا رہی تھی مگر رضا کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''گوہر بس اب بہت ہوا۔ میں ایک لفظ بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' رضا کی آنکھوں اور لہجے میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں جب کہ دور بیٹھی سہیکہ اور صولت بیگم کے چہرے پر خوشی کا رنگ نمایاں تھا۔

☆.....☆

''کیا کہتی ہو کزن، ہانیہ ناراض تو نہیں ہوئی ہوگی؟'' ریان علی نے بھاپ اڑاتی چائے کا کپ اپنے سامنے رکھتے ہوئے خوشبو کو دیکھا۔

''معلوم نہیں۔'' خوشبو کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

''عجیب سی لڑکی ہے۔ اپنی دنیا میں مگن رہنے والی، کوئی سوال کرو تو سوچوں کے سمندر میں کھوئی رہتی ہے۔ اُسے تو شاعرہ ہونا چاہیے تھا۔'' ریان نے خوشبو کی طرف مسکراہٹ اچھالتے ہوئے کہا۔

''واہ بھئی، ایک سنگر اور شاعر کی چاہت شاعرہ ہی ہونی چاہیے یقیناً۔'' خوشبو نے 'یقیناً' پر زور دیتے ہوئے

کہا اور زور سے ہنس دی۔ ”ویسے ریان بھائی اِس لڑکی کا کچھ پتا نہیں کب منہ پھلا کر بیٹھ جائے۔ وہ تو شکر ہے میں دو دن سے یونیورسٹی نہیں گئی، ورنہ ساری ناراضگی وہ مجھ پر نکال چکی ہوتی۔“ خوشبو منہ بناتے ہوئے بولی۔

”کیا تم دو دن سے یونیورسٹی نہیں گئی ہو اور یہ بات تم مجھے اب بتا رہی ہو؟“ ریان نے مصنوعی خفگی سے خوشبو کو گھورا۔

”لو بھلا اِس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟“

”اور ہانیہ نے تم سے کوئی فون پر بھی رابطہ نہیں کیا؟“

”ہاں، نہیں کیا۔ اچھا ہی ہے۔ وہ تو مجھے اتنی باتیں سنائے گی کہ بس، ویسے ہی اُس نے میرا نام دھوکہ گرل رکھ دیا ہے۔“ خوشبو نے نگاہیں پھیر کر چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔

”تو تم بھی تو فول ہو، اُسے ہر بار جھوٹ بول کر کیوں لاتی ہو۔ یار سچ بتا دیا کرو۔“ ریان علی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”ہاں تاکہ وہ وہیں میرا بھرتہ بنا دے۔ اُس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ میری بات کبھی مانے گی؟“ خوشبو تنک کر بولی۔

”مانے گی ایک دن ضرور مانے گی مگر ابھی اُس میں ہمت نہیں ہے اور یہ ہمت میں اُسے دلاؤں گا؟“ ریان نے اچانک ہی خوشبو کے چہرے سے نگاہیں ہٹا لیں۔

”لیکن بھائی جی اب میں بار بار تو اُسے بے وقوف بنانے سے رہی۔ اب اپنا راستہ خود تلاش کریں۔ بار بار میں اُس سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔“ خوشبو نے بڑی جرأت مندی سے کہا۔

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ شکریہ آپ کا جو آپ نے میرے اوپر یہ احسانِ عظیم فرمایا۔“ ریان ہلکے سے ابرو اُچکا کر بولا۔

”فارمیلٹی کی ضرورت نہیں، لیکن آئندہ کے لیے آپ کو محتاط کرنا میرا فرض تھا۔“ خوشبو لہجے میں خوش دلی سموتے ہوئے بولی۔

”اچھا چلو نا، اُس کا نمبر ملاؤ۔ بات کرو اُس سے، میرے تو میسج کے جواب وہ دیتی نہیں اور نہ ہی میرا فون اٹھاتی ہے۔ تم ذرا ٹرائی تو کرو۔“ ریان نے نارمل سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ مبادا وہ مروت برتنے پر مجبور ہو جائے۔

”اُف اچھا ٹھیک ہے؟“ ریان کو بے چین دیکھ کر خوشبو نرم پڑ گئی۔

”اوہ نو۔“ خوشبو نے موبائل کان سے ہٹاتے ہوئے ریان کو مسکین سی شکل بنا کر دیکھا۔

”کیا ہوا؟“

”نمبر بند ہے محترمہ کا۔“

”لو بھئی یہ ایک اور پریشانی، اب اندر ہی اندر کڑھتی رہے گی۔“ ریان سٹپٹایا سا گیا تھا۔

”چلو خوشبو سامانِ سفر باندھ لو۔ اب ہانیہ کے گھر جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ دل کی اداسی دور کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔“ خوشبو ریان کے انداز کو قطعی نظر انداز نہیں کر سکی۔ آخر آل اُسے اپنی دوست بھی تو جانِ عزیز تھی۔

☆.....☆

میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو۔

سارے راستے وہ یہی سنتے ہوئے آئی تھی اور کمرے میں آتے ہی خاموشی سے بازو آنکھوں پر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔

”گوہر خیریت تو ہے نا؟“ کشور بھابی نے آہستگی سے اُس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جی بھابی سب خیریت ہی ہے۔“ وہ ایک سانس بھر کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں رو رو کر لال ہو رہی تھی۔ وجود ایک دم ٹوٹا بکھرا سا لگ رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔“ کشور نے بے اختیار گوہر کو گلے سے لگا لیا۔ ایک ہمدرد، غمگسار کی طلب شدت سے محسوس تو ہو ہی رہی تھی کشور کے گلے لگتے ہی گوہر کا دل بھر آیا۔

”رضا نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟“ کشور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”آج گھر آنے سے پہلے تمہاری کوئی کال آئی اور نہ آنے کے بعد کسی سے ملی ہو۔ بس یوں ہی کمرے میں آ کر لیٹ گئی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟“ رضا کے ذکر پر اُس کے دل میں وہی مانوس سا درد اٹھا تھا اور پورے بدن میں سرایت کر گیا۔ جلتی آنکھوں کو اُس نے موند لیا۔

”کچھ نہیں بھابی۔ بس یونہی۔ آپ پریشان نہیں ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔“

”مگر میں کیسے مان لوں؟“ کشور نے اُس کے بال سہلاتے ہوئے اُسے خود سے قریب کیا۔

”بھابی رضا نے میرا دل توڑ دیا ہے۔“ وہ ایک جملہ کہہ کر سسک سسک کر رو پڑی۔

”کیا کہا ہے رضا نے؟“ کشور نے اُس کندھے سے پکڑا تو وہ پر کٹے مفلوج پرندے کی طرح کشور کے سینے سے آ لگی۔

”بھابی وہ مجھے غلط سمجھنے لگے ہیں۔ انہیں وہ سچائی نظر نہیں آ رہی جو میں انہیں دکھانا چاہ رہی ہوں۔“

”پاگل ہو تم، رضا کوئی بچہ نہیں ہے جسے سمجھایا جائے اور وہ سمجھ نہیں سکے۔ یقیناً تم دونوں کے درمیان کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“ کشور اُس کے نرم رخساروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

”لیکن بھابی آج رضا نے میرا مان توڑا ہے۔ مجھے بہت ہرٹ کیا ہے۔ مجھے اُن سے ایسی امید نہیں تھی۔“ وہ سسک رہی تھی جب کہ کشور پریشان سی اس کی غیر حالت کو دیکھ رہی تھیں۔

”اچھا ابھی خود کو سنبھالو۔ منہ دھو لو، پھر ہم یہ بات دوبارہ کریں گے۔ تمہاری ایسی حالت اگر ساسو ماں نے دیکھ لی تو وہ سخت پریشان ہو جائیں گی۔“ کشور اُسے پیار سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”سوری بھابی اتنی زیادہ اپ سیٹ ہو چکی ہوں کہ کچھ سوجھ ہی نہیں رہا۔“ گوہر نے نم لہجے میں کہا تھا۔

”چلو نا۔ پریشان نہیں ہوتے یوں۔ میں خود رضا کو فون کر کے بلاؤں گی۔ پھر ساری بات کلیئر کر لیں گے۔“

”نہیں بھابی وہ بہت غصے میں ہیں، نہیں آئیں گے؟“ گوہر بیڈ کی پشت سے لگ کر بیٹھ گئی۔

”اچھا بھئی تو ہم چلیں گے تمہارے گھر۔ وہیں جا کر بات کریں گے رضا سے۔ اب تو خوش؟“ کشور یکدم سر کو ہلکے سے جنبش دے کر ہنس پڑیں۔

”میں اب اُس گھر میں کیسے جا سکتی ہوں بھابی۔ رضا نے مجھے خود گھر سے نکال دیا ہے؟“ ایک ہی سانس میں کہتی اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ)

''کیا!! تمہیں رضا نے گھر سے نکال دیا ہے؟'' کشور کے چہرے پر تشویش اور فکر کے رنگ نمایاں تھے۔

''پتا نہیں کیوں ہم کسی کے دل میں رہنا ہی اپنی زندگی سمجھتے ہیں اور جب یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی کے اندر نہیں رہے تو جانے کیوں ہم مر جاتے ہیں۔''

''اوہ خدایا! گوہر تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ آخر کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ صاف، صاف کیوں نہیں بتا رہی ہو مجھے۔'' گوہر کی بات سے کشور کو شدید ترین دھچکا لگا تھا۔

''بھابی رضا جانتے ہیں اُس شخص کے بارے میں کہ اس کی رپوٹیشن کیسی ہے۔ اُس کا کیریکٹر کیا ہے مگر اُس کے باوجود، اُس گندے، خبیث شخص کے لیے انہوں نے مجھے گھر سے نکلنے کو کہا۔''

''معاف کرنا ڈیئر! مجھے تمہاری ساس بھی کچھ کم نہیں لگتیں۔ یقیناً رضا کے پیچھے انہی کا ہاتھ ہوگا۔ انہی کے کہنے سے رضا نے ایسا قدم اٹھایا ہوگا۔ ویسے تم کس شخص کے بارے میں بات کر رہی ہو؟'' کشور کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''رضا کی امی تو مجھے بالکل پسند نہیں کرتیں۔ ہمیشہ ہی میرے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتی رہتی ہیں۔ مگر بھابی رضا نے تو ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔ کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑا تھا مگر آج نہ جانے کیوں.....؟'' گوہر نظریں چراتی ہوئی کلائی میں پڑی چوڑیوں کو ٹٹولنے لگی۔

''مجھے بہت کچھ سمجھ آ رہا ہے۔ یقیناً اِس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی جائے گا لیکن پہلے تم فریش ہو کر آؤ۔ یہ افسردہ آنکھوں کی لالی دور کرو اور مسکراؤ۔ رضا کو یقیناً اپنی غلطی کا احساس ہوگا میری جان۔'' کشور نے اُسے ہمت دلاتے ہوئے کہا۔

''آئی ہوپ سو بھابی۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''گوہر اگر انسان اپنے دل پر، اپنے محسوسات پر حاوی ہو جانے کے قابل ہو جائے تو دنیا میں مسئلے ہی پیدا نہ ہوں۔''

''مگر کچھ مسئلے پہاڑ جیسے بڑے بن کر سامنے آ جاتے ہیں، جن کو سر کرنا مشکل ترین ہو جاتا ہے۔'' گوہر کی آواز میں عجیب شکستگی تھی۔

''ہوں جانتی ہوں، مگر کوشش ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ چلو بھئی بس اب بہت ہو گیا اٹھ جاؤ اب۔ میں تمہارے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' گوہر، کشور کی پیشانی کا بوسہ لیتی اٹھ گئیں۔

''تھینکس بھابی! آپ نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔'' زبردستی کی ہنسی گوہر کے لبوں کی تراش میں آ کر معدوم ہو چکی تھی۔

''اچھا پلیز! اس بات کا ذکر گھر میں بالکل بھی کسی سے نہیں کرنا۔ ساسو ماں تو پریشان ہوں گی ہی ساتھ ہی قدسیہ بھابی کی نیچر کا تو تمہیں علم ہی ہے؟'' گوہر، بھابی کے ملتجی لہجے کے آگے کچھ نہ بول سکی سوائے اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

☆.....☆

''جب سے یہ لڑکی اِس گھر میں آئی ہے، میں دماغی طور پر ماؤف رہنے لگی ہوں۔ سوکھیڑے اِس نے میرے اِرد گرد پھیلا کر رکھ دیے ہیں۔'' صولت بیگم ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھیں تپے ہوئے لہجے میں توس پر مکھن لگا رہی تھیں۔

''جانے بھابی میں اتنی اکڑ کیوں ہے۔ جب بولتی ہیں انگارے ہی برستے ہیں۔ اچھا ہی ہوا بھائی نے انہیں ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔'' سبیکہ نے منہ بناتے ہوئے صولت بیگم کو دیکھا۔

''لیکن مسئلہ ایسے تھوڑی حل ہوگا۔ یہ جو محبت کی شادی ہوتی ہے ناں، اس میں بیوی اور میاں کے لاکھ دل بُرے ہو جائیں لیکن ایک دن پھر ایک ہو جاتے ہیں اور رضا کی والہانہ محبت تو تم نے دیکھی ہی ہے؟'' صولت بیگم چائے کا سپ لیتے ہوئے اب سبیکہ کو دیکھ رہی تھیں۔

''میں کچھ نہیں جانتی امی، بس اب بہت ہوئی۔ ہمیں اس بھابی سے اب مکمل طور پر چھٹکارا حاصل کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''ہاں سوچ تو میں بھی یہی رہی ہوں۔ ان دونوں کی محبتوں پر ایسی کاری ضرب لگاؤں کہ دونوں محبت کے نام سے ہی گھبرانے لگیں۔'' صولت بیگم کے لبوں کی تراش میں بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

''اونہہ حقیر ذرے خود کو خدا سمجھنے لگیں تو انہیں ان کی اوقات یاد دلا دینی چاہیے۔'' سبیکہ کا لہجہ تیکھا تھا۔

''سبیکہ ڈارلنگ بے فکر رہو۔ تمہاری اِس ماں نے ہار ماننا کبھی سیکھی ہی نہیں۔ اس گوہر کا میں کچھ کرتی ہوں، فی الحال تو آج جو شیخ حنیف آ رہے ہیں، مجھے تو اُن کی فکر زیادہ لاحق ہو رہی ہے۔'' صولت بیگم کے چہرے پر ایک گہری سوچ نمایاں تھی۔

''ارے ماما اُس شیخ حنیف کے لیے بھی کیا پریشان ہونا۔ اُس کی بوریت دور کرنے کا سامان ڈھونڈ لیں بس۔ وہ خوش ہی خوش۔'' سبیکہ نے دلچسپی لیتے ہوئے صولت بیگم کو دیکھا۔

''سبیکہ آج تم کیوں نہیں کمپنی دیتیں شیخ حنیف کو، سچ ایک بڑی ضروری ڈیل رُکی ہوئی ہے۔ گوہر عین ٹائم پر اگر نہیں آ جاتی تو جانے میں کیا کیا منصوبہ بنا چکی ہوتی؟'' صولت بیگم کا احتجاجی لہجہ جوں ہی سبیکہ کی سماعت سے ٹکرایا وہ چیخ اٹھی۔

''ماما پلیز آپ کی سُوئی ہر بار یہیں آ کر کیوں رک جاتی ہے۔ مجھے اُس شیخ حنیف سے سخت نفرت ہے۔ عجیب گندی ذہنیت کا آدمی ہے، گھورتا تو ایسے ہے جیسے دنیا میں آنے کے بعد پہلی بار لڑکی کو دیکھ رہا ہو۔'' سبیکہ کے چہرے پر سخت کوفت کے آثار تھے۔ ''عورت خور کہیں کا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''خیریت، آپ لوگوں نے ناشتے پر مجھے بلانا ضروری نہیں سمجھا؟'' رضا تیزی سے ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے بولا تو دونوں ہی بوکھلا گئیں۔

''ارے نہیں میرے چاند۔ رات تم اتنے پریشان تھے تو میں نے سوچا کہ تم جانے کب سوئے ہو گے۔ اس لیے نہیں اٹھایا۔ تمہاری نیند پوری ہو جانے کے خیال نے مجھے باز رکھا۔'' صولت بیگم اب کچھ محتاط سی نظر آ رہی تھیں۔

''یہاں کوئی سنجیدہ بات ہو رہی تھی شاید؟'' رضا نے نیپکن اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے باری باری دونوں کو دیکھا۔

''آ..... ہاں، رضا ہم گوہر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کل تم نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ بیوی کی لگام اپنے ہاتھ میں ہی رکھنی چاہیے، ورنہ وہ بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگتی رہتی ہے۔'' صولت بیگم کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''اچھا.....'' رضا کے چہرے پر اطمینان ہنوز قائم تھا۔

''مجھے کل گوہر کا یوں چلے جانا اچھا نہیں لگا رضا مگر کیا کرتی، اُس کو کس حق سے روکتی۔ اس نے مجھے کبھی اپنی ساس سمجھا ہی نہیں اور نہ ہی کبھی میری بات مانی ہے۔'' صولت بیگم کے دل کے پھپھولے آج پھوٹے پڑ رہے تھے۔

''ماما آپ کے پاس بھائی سے کرنے کے لیے اور کوئی بات نہیں ہے؟'' سبیکہ نے ٹاپک چینج کرنے کی کوشش کی۔

''کیوں سبیکہ، گوہر کی ذات اتنی غیر اہم ہوگئی ہے کہ اُس کے بارے میں بات کرنا بھی اب ممنوع ہے؟'' یہ جملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ سبیکہ سمیت صولت بیگم بھی گھبرا گئیں۔

''نہیں تو بھائی میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ بے کار آپ کو گوہر بھابی کے ذکر سے تکلیف ہوگی۔''

''تمہیں کب سے میرا اتنا خیال آنے لگا ہے؟'' رضا چڑ کر بولا۔

''ارے میرے بچوں اس بحث کو ختم کرو، چلو سبیکہ بھائی کو چائے دو۔ وہ پہلے ہی الجھا ہوا ہے، اسے مزید مت الجھاؤ۔'' آنکھوں کے اشارے سے وہ سبیکہ کو رام کر کے اب رضا کی جانب متوجہ ہوئیں۔

''رضا میری جان پلیز فورگیٹ ایوری تھنگ۔ بس اپنے ناشتے پر دھیان دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رضا پر چند لمحے سکوت سا چھایا رہا پھر وہ خاموشی سے چائے پینے لگا۔

☆.....☆

''دادی تیار ہیں، جلدی سے آجاؤ، ویسے بھی یہاں تماش بینوں کی کمی نہیں ہے؟'' عماد اپنی فطرت سے مجبور تھا اس لیے بے لاگ بولے ہی چلا جا رہا تھا۔

''چلو بھئی لوڈو کی بساط پر رنگ برنگی گوٹیں سج چکی ہیں۔ اب کون کون کھیلے گا؟'' ماریہ نے بے چارگی سے عماد کو دیکھا تو اُسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

''ارے میری گڑیا! تم اور دادی تو کھیل رہے ہو؟''

''کیا مطلب میں نہیں کھیل رہا کیا؟'' جبران نے بالکل بچوں کی طرح منہ پھلایا۔

''ہیں تم بھی کھیلو گے، چلو چلو آجاؤ۔'' یہ ہری والی گوٹیں جبران کی ہیں۔'' عماد نے جبران کو بیٹھتا دیکھ کر ہری گوٹوں والے خانے کا رخ جبران کی طرف کیا۔

''ہری کیوں، مجھے تو نیلا رنگ پسند ہے؟'' جبران نے پھر منہ بسورا۔

''پاگل ہری، ہراتی ہے اور نیلی نچاتی ہے۔ ناچتے ہوئے تم اچھے نہیں لگو گے اس لیے ہار ہی جانا۔'' عماد نے کچھ اس شوخی سے کہا کہ ذکیہ بیگم بھی بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں۔

''یہ لو، اب دیکھتا ہوں کون کھیلتا ہے؟'' جبران نے ایک جھٹکے سے لوڈو پر ہاتھ مارا تو گوٹیں دور تک پھیل گئیں۔

''یہ کیا حرکت ہے جبران؟'' ذکیہ بیگم نے خشمگیں نظروں سے پوتے کو دیکھا تو خاموشی سے منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔

''چلیں بھئی اب گیم شروع بھی کریں۔'' ماریہ نے اب ساری توجہ عماد کی طرف مبذول کی۔

''پہلے نااہل لوگوں کو تو کمرے سے نکال دوں۔'' عماد نے جبران کی طرف جست لگائی۔

''اوہ خدایا!'' ذکیہ بیگم وحشت زدہ سی کھڑی ہوگئیں جب کہ ماریہ پریشان سی اُن سے لپٹ گئی۔

''خیریت تم لوگ لڑاکا بلوں کی طرح کیوں لڑ رہے ہو؟'' صالحہ اور حفصہ بیک وقت کمرے میں پہنچی تھیں۔ مگر مجال ہے جو دادی کی ڈانٹ اور صالحہ کی چیخ و پکار کا ان پر کوئی اثر ہوا۔

''عماد تم تو سمجھدار ہو، چھوڑو بڑا بھائی ہے۔'' ذکیہ بیگم نے عماد کو مخاطب کرنا چاہا جو پوری شان سے جبران کو چت لٹائے اُس پر بیٹھا ہوا تھا۔

''دیکھا بیٹا جیت محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے، تمہاری طرح نہیں کہ ہار کے خوف سے ہی پوری بساط الٹ دی۔''

''اب ہٹ بھی جاؤ۔'' جبران پوری طاقت سے چیخا۔

''یہ لو کیا یاد کرو گے بگ بی۔'' عماد تیزی سے پلٹا اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''دادی دیکھیے اِس نے زیادتی کی ہے اس وقت میرے ساتھ؟'' جبران نے شکایتی نظروں سے دادی کو دیکھا۔

''ہاں میرے بچے آؤ تم دادی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاؤ۔ اس کو تو میں دیکھتی ہوں۔'' ذکیہ بیگم کا لہجہ فرضی غصے کا غماز تھا۔

''چلو، دادی، ماریہ، حفصہ اور صالحہ کھیل رہے ہیں۔'' عماد نے اعلان کیا۔

''میں کیوں کھیلنے لگی، کمال ہے۔ زبردستی ہے کیا؟'' حفصہ نے منہ بسورا۔

''ارے یار کھیل لو نا، یہ تین کھیلیں گے تو کیا تم ان کا منہ دیکھو گی بیٹھ کر؟''

''میں کیوں منہ دیکھنے لگی میرے پاس اور بہت سارے کام ہیں۔ تم کیوں نہیں کھیل لیتے؟'' حفصہ عماد کے روبرو ہوئی۔

''باؤلی کمنٹری کون کرے گا؟''

''اوہ خود ستائش کہیں گے، میں ہانیہ بجو کو بھیجتی ہوں۔''

''نہیں تم کھیلو گی؟'' عماد نے آنکھیں دکھائیں۔

''دیکھا دادی، جسے کھیلنے کا شوق ہے اسے نہیں کھلا رہا ہے یہ؟'' جبران نے شکایت کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

''بھئی اس لڑائی کے چکر میں سارا ٹائم ضائع ہو رہا ہے۔ جبران بھائی آپ ہی آجائیں۔'' ماریہ نے بڑے پیار سے جبران کو دعوت دی۔

''چل یار تُو ہی آجا، تجھے ہرانے کا اپنا الگ ہی مزہ ہے۔'' عماد نے اپنی ہنسی پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا تجھے تو میں جیت کر دکھاؤں گا اب۔'' جبران آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

''اچھی زبردستی ہے؟'' حفصہ نے منہ بنا کر عماد کو دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔

''چلو چلو اب شروع کرو گیم۔'' عماد نے حفصہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی اب شروع کرو، موئی تم لوگوں کی لڑائی نے ہمارا دماغ بھی گھما دیا ہے۔'' ذکیہ بیگم نے چشمہ

ناک پر درست کیا اور پوری توجہ لوڈو کی بساط پر مرکوز کر دی۔

''یہ دیکھو ابھی میرا چھکا آنے والا ہے؟'' ماریہ نے کھٹ کھٹ کرنے کے بعد پانسہ پھینکا مگر دوسرے ہی پل مایوسی سے برا سا منہ بنا کر گول ڈبے میں پانسہ ڈال کر دادی کو تھما دیا۔ اُس کی اس حرکت پر ہلکی سی ہنسی سب کے چہروں پر رقص کرنے لگی۔

☆.....☆

''گوہر، میرے نزدیک عورت ایک قیمتی پرفیوم کی بوتل کی طرح ہوتی ہے اگر اس کا ڈھکن بند رہے تو اس کی قیمتی خوشبو محفوظ رہتی ہے اور اگر بے احتیاطی سے ڈھکن کھلا رہ جائے تو خوشبو اڑ جاتی ہے اور پھر وہ خالی بوتل کی طرح ہو جاتی ہے، بے رنگ، بے خوشبو بے قیمت۔'' کشور نے گم صم بیٹھی گوہر کو مخاطب کیا۔

''جی آپ درست کہہ رہی ہیں'' گوہر نے آنکھوں میں آئی نمی صاف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ جو صولت صاحبہ ہیں، یہ لاکھ تمہاری محبت کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کریں مگر ناکام ہی رہیں گی کیونکہ محبت تو ایک خودرو پودا ہے۔ لاکھ اسے کاٹتے رہو، اس کی جڑیں نکلتی رہتی ہیں۔ ہر بار کونپل پھوٹ نکلتی ہے۔'' کشور نے اِس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے تھپکا۔

''بھابی بات صرف امی کی نہیں ہے۔ مجھے پہلی بار رضا کے رویے نے دکھ دیا ہے۔ انہوں نے جس طرح مجھے ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکالا ہے، اِن کے اس رویے سے میں ٹوٹ گئی ہوں، بکھر کر رہ گئی ہوں۔'' اب وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''گوہر، یار کنٹرول یور سیلف، رضا کی کوئی مجبوری رہی ہوگی ورنہ وہ ایسا نہیں ہے۔''

''لیکن بھابی وہ اپنی ماں کی غلطیوں کی سزا مجھے کیوں دے رہا ہے اگر اُس دن میری جگہ آپ ہوتیں اور سارہ کی حالت دیکھتیں.....'' وہ سراسیمہ سی نگاہوں سے کشور کو دیکھتی اپنا جملہ ادھورا چھوڑ چکی تھی۔

''گوہر اتنا تو سوچو، تم اُس کی ماں کو برا بھلا کہہ رہی ہو اور ماں!! وہ تو ایسی ہستی ہے کہ لاکھ بری سہی لیکن کبھی کوئی اولاد اپنی ماں کے بارے میں برا نہیں سُن سکتی۔ گوہر تم رضا کی عزتِ نفس پر وار کر رہی تھیں، اُس نے جو کچھ کیا وہ اُسی کا ری ایکشن تھا ڈیئر۔'' کشور بھابی نے اُسے گلے سے لگایا تو وہ پھر سے بے اختیار ہو گئی۔

''یہ تم اتنی ہڑبونگ میں کیوں آئی ہو۔'' ذکیہ بیگم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی گوہر کو مخاطب کیا۔

''نہیں تو امی، میں نے تو بھابی کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔'' وہ کچھ الجھی سی کشور کا نام لے بیٹھی۔

''کیوں بہو۔ ہمیں کیوں نہیں خبر دی تم نے.....؟'' ذکیہ بیگم نے ترچھی نظروں سے کشور کو دیکھا۔

''ارے امی اس کا اپنا گھر ہے، ضروری تھوڑی ہے ہر بار بتا کر آئے۔ جب دل چاہے آ جایا کرے۔'' بے ساختہ کشور نے گوہر کو گلے سے لگا لیا۔

''کیا بات ہے بڑی محبتیں جتائی جا رہی ہیں؟'' ذکیہ بیگم کے چہرے پر اطمینان نمایاں تھا مگر نند بھابی کا ایسا پیار دیکھ کر وضاحت طلب کرنا بھی تو ضروری تھی۔

''گوہر ہے ہی اتنی پیاری۔'' کشور نے کمالِ مہارت سے گوہر کے آنسو صاف کیے اور اُسے نگاہوں سے تنبیہ کی کہ وہ نارمل ہو جائے۔

''اچھا گوہر رضا کہاں ہے؟ اور تمہاری ساس اور نند کے کیا احوال ہیں؟''

''جی امی سب ٹھیک ہیں۔ رضا کچھ جلدی میں تھے اس لیے گھر نہیں آ سکے۔ آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔'' وہ نظریں جھکائے، جھکائے جواب دے رہی تھی۔ چہرے پر پھیلی گھبراہٹ کو چھپانا اس وقت اُس کے لیے مشکل ترین امر تھا۔

''کوئی پریشانی ہے کیا؟'' گوہر کی حالت دیکھ کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گئیں تھی۔

''نہیں امی پریشانی کیسی، سب ٹھیک ہے۔'' وہ چہرے اور آنکھوں کے تاثرات کو مخفی رکھنے کے جتن کر رہی تھی مگر فرضی مسکراہٹ اُس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔

''کشور، کیا بات ہے۔ یہ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے؟'' ذکیہ بیگم نے کشور کو کڑی نظروں سے دیکھا۔

''ارے ساسو ماں آپ بے کار پریشان ہو رہی ہیں۔ ایسے ہی میڈم کا دل گھبرا رہا تھا تو یہاں دوڑی چلی آئیں۔ آخر کو امپورٹڈ لوگوں کے ساتھ، امپورٹڈ چیزوں کے ساتھ رہ رہی ہے۔ ملازموں کی بھیڑ ہے، مادی چیزوں سے گھبرا گئی ہوگی ہے نا؟'' کشور نے جانے کہاں کی بات کہاں سے جوڑی تھی۔

''ہاں بہو جو اپنائیت اپنی چیزوں میں ہے، جو خلوص پیار اپنے سگے رشتوں سے ملتا ہے، اُس کا یقیناً کوئی مول نہیں ہوتا۔''

ذکیہ بیگم اپنی رو میں کہتی جا رہی تھیں مگر دوسری طرف گوہر کے دل پر رکھے نادیدہ بوجھ میں اضافہ ہو چکا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بے آواز لڑھکتے چلے جا رہے تھے۔

''چپ ہو جاؤ گوہر، پلیز۔'' کشور کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے اور اب وہ آنکھیں دکھا رہی تھیں گوہر کو۔

''چلو بچی اپنا دل برا نہیں کرو، اپنائیت اور محبت کی اس گھر میں کمی نہیں۔ اٹھو اور کمرے سے نکلو۔ سب کے ساتھ بیٹھو، اپنے گھر میں بھی تو سارا وقت ایسے ہی گزارتی ہوگی۔'' یکدم ہی ذکیہ بیگم کے چہرے پر فکر کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

''جی امی بہتر۔'' گوہر جھٹ پٹ دوپٹے سے چہرہ رگڑتے ہوئے بولی۔

''اصل میں تمہاری ساس تکبر کا شکار ہیں اور یہ تکبر شخصیت کو برباد کر دیتا ہے۔ انسان اپنے علم، عمل، مرتبے، خاندان، اقتدار اور آسائشوں پر فخر کر کے خود کو دوسروں سے بلند سمجھے، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔'' ذکیہ بیگم کے لبوں سے ایک متاسفانہ سانس خارج ہوئی تھی۔

''لو بھئی اماں کا لیکچر شروع۔'' کشور نے قدرے بُرا سا منہ بنا کر گوہر کو دیکھا تو اُس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بیدار ہو گئی۔

''تو اور کیا، جس دن سے گوہر کو بیاہ کر لے گئی ہے اُس نے اس گھر میں قدم نہیں رکھا۔'' وہ دوپٹہ سر پر جماتے ہوئے بولیں۔

''ساسو ماں آپ بھی تو نہیں گئیں اُن کے گھر؟'' کشور نے اب مزے لینے کی ٹھان لی تھی اس لیے ان کے اور قریب کھسک آئی۔

''ارے چھوڑو، کون سا ہمارے جانے اور نہ جانے سے کسی پر کوئی فرق پڑنے والا ہے۔ گوہر آ جاتی ہے تو بس دل کو تسلی ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہماری بیٹی نے ایک اچھا ساتھی چنا ہے۔ بس ہم اس بات پر

شاد ہیں اور ہر نماز میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے رضا کے روپ میں ہمیں ایک اچھا داماد عطا کیا۔'' ذکیہ بیگم کچھ اطمینان بھرے انداز میں سر کو جنبش دیتی اب کھڑی ہو چکی تھیں۔ گوہر اور کشور بھی اپنے اپنے چہرے کے تاثرات چھپاتیں بے ارادہ کھڑی ہو گئیں۔

''ارے تم لوگ اپنی گپ شپ جاری رکھو۔ میں تو چلی نماز پڑھنے۔'' وہ مڑتے ہوئے بولیں۔

''جی سا سوماں۔'' کشور اُن کے کمرے سے نکلتے ہی ایک گہری سانس لے کر بستر پر ڈھ گئی جب کہ گوہر کے لبوں سے ایک ملول سے سانس خارج ہوئی تھی۔

☆......☆

''یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے کہ تم اپنا نمبر بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ تم تک رسائی کا راستہ صرف یہ موبائل نہیں، یہ جو ٹیڑھے میڑھے راستے ہیں نا، یہ بھی تمہارے در تک پہنچتے ہیں۔'' نہ سلام نہ دعا خوشبو گھر میں داخل ہوتے ہی اُسے سامنے دیکھ کر برس پڑی۔

''لگتا ہے آپ دونوں کی پرانی جان پہچان ہے۔'' عماد شوخی سے ہنسا۔

''عماد۔'' ہانیہ نے اُسے آنکھیں دکھائیں اور چہرے پر بےزاری لیے خوشبو کی جانب لپکی۔

''تم کبھی سدھر ہی نہیں سکتیں۔ آؤ ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' وہ خوشبو کا ہاتھ کھینچتی ہوئی اُسے ڈرائنگ روم تک لے آئی۔

''نمبر کیوں آف کیا ہوا ہے۔ صرف دو ہی دن تو میں یونیورسٹی سے غیر حاضر رہی۔ اُف اتنا بڑا احتجاج۔'' خوشبو سلگتی نظروں سے ہانیہ کو گھور رہی تھی۔

''میری بلا سے تم ایک مہینے غیر حاضر رہو۔ مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' ہانیہ ترخ کر بولی۔

''نیا انکشاف، سن کر خوشی ہوئی۔ تو نمبر کیوں آف کیا ہوا ہے؟''

''کیوں! یہ تم جانتی ہو۔'' ہانیہ کا لہجہ چٹختا ہوا تھا۔

''یار کم آن، اِسے تو بزدلی کہتے ہیں۔ ہمت ہے تو اُس کا سامنا کرو، یوں نظریں چرا کر بیٹھنا کہاں کی عقلمندی ہے؟'' خوشبو ترش لہجے میں بولی۔

''پلیز خوشبو، تم اور وہ ریان علی نہ جانے کون سی مٹی سے بنے ہوئے ہو۔ مت تنگ کرو مجھے۔ میں وہ زرد پتا ہوں جو اپنی شاخ سے جدا ہو چکا ہے۔ مت مجھے ہراساں کرو، ڈرتی ہوں کہ میں کہیں بکھر ہی نہ جاؤں۔'' ہانیہ کی نگاہوں میں مچل جانے والے شکوے خوشبو سے پوشیدہ نہیں تھے۔

''سوری ہانیہ۔'' خوشبو لب بھینچ کر دکھ اور رنج کے گہرے احساس کے ساتھ ہانیہ کا کرب آلود چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

''سمجھاؤ ریان علی کو کہ وہ میری تنہائی کی جھیل میں جو چھوٹے چھوٹے کنکر پھینک رہا ہے وہ مجھے صرف اور صرف اذیت میں مبتلا کر رہے ہیں۔ تم جانتی ہو، مجھے بھی اور میرے گھر کے ماحول کو بھی۔ میں خود کو اِس خول سے نکال کر جی نہیں سکتی۔ یہ میری مجبوری ہے۔'' ہانیہ کا سر جھکا ہوا تھا اور ایک دل گرفتگی نے اُسے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔

''اچھا میری جان!'' خوشبو دکھ سے مسکائی اور ہانیہ کی پلکوں پر اتر جانے والی نمی کو پونچھتی ہوئی ایک سانس

ر بولی۔

''ہانیہ محبت ہوش مندی کا نام ہے۔ تم دانستہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتیں۔ یہ تو بس روح میں اتر کر اپنی ں مضبوط کرتی ہے۔ تم جو خود کو ایک زرد پتا تصور کر رہی ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے ناں کہ تم کسی کے دل کی سرزمین ں نمو پا رہی ہو؟''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟'' ہانیہ نے چونک کر خوشبو کو دیکھا۔

''اپنے دل سے پوچھو۔ ریان علی کا ذکر کیا تمہیں چونکاتا نہیں ہے؟ تمہیں ایسے نہیں لگتا کہ تم بہت اہم ہو۔ یہ م نے اپنے اردگرد رشتوں کا جال بُنا ہوا ہے اور ساتھ ہی انا کا پہرہ بٹھایا ہوا ہے۔ کیا یہ تمہارے جذبوں کی قدر رتے ہیں؟''

''بس کرو خوشبو۔ بےتکا بولے چلی جا رہی ہو؟'' ہانیہ نے اُسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

''کہو نا ہانیہ، مجھے روکو نہیں۔ تم اتنی کم ظرف تو نہیں ہو جو ریان علی کی محبت کو پہچان نہیں سکو۔'' خوشبو ہانیہ کا رب آلود چہرہ دیکھتی ہوئی اُسے کھوج رہی تھی۔

''خوشبو بس کرو۔ تم جو کچھ کہہ رہی ہو یہ کتابی باتیں ہیں۔ زندگی کی اصلیت حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔''

''اور تم حقیقت سے نظریں چرا رہی ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ تم خود بھی ریان بھائی سے محبت کرنے لگی ہو مگر خود کو وکہ دے رہی ہو۔'' خوشبو نے شکوہ بھرے لہجے میں اپنی بات ہانیہ تک پہنچائی۔

''تم جو کہہ رہی ہو وہ غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اس محبت کے جنگل میں دانستہ کھونا نہیں چاہتی۔ یہ لے دکھ کے اور کچھ بھی نہیں دیتی۔'' ہانیہ گہری سانس بھر کر بولی۔

''اوہ آئی سی، اب میں سمجھ چکی ہوں۔ تمہارے خدشات کی نوعیت وہ نہیں جو ہم سمجھ رہے تھے۔'' خوشبو کا انک پینترا بدلنا ہانیہ کو الجھا گیا۔ ''اچھا نمبر تو اپنا آن کرو۔''

''تا کہ ریان علی مجھے پریشان کرتا رہے۔'' ہانیہ نے بےساختہ کہا۔

''سویٹ ہارٹ وہ پریشان نہیں کرتا بلکہ یہ تو اُس کی محبت کا اظہار ہے۔ خواہش ننھی ننھی کونپلوں کی طرح بھلا ں دل کی سرزمین سے نہیں پھوٹتی اور بھلا کون بےوقوف ہو گا جو اُن کی شعوری آبیاری کا منتظر نہیں ہو۔''

''پھر تقریر شروع۔ کون تمہیں لیکچر دے رہا ہے آج کل؟'' ہانیہ نے خوشبو کو روکا۔

''اپنی سوچوں سے اضطراب سمیٹو تا کہ دل کی بنجر زمین پر محبت کاشت کر سکو۔'' خوشبو نے ہانیہ کے سر پر ایک تا کی چپت لگاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا دماغ درست کرنے کے لیے میں کیا کر سکتی ہوں؟'' ہانیہ نے ساری باتوں کو یکسر نظر انداز کرتے ئے الٹا اُسی پہ سوال داغ دیا۔

''تم جانتی ہو؟'' خوشبو نے معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

''یار کیسی لڑکی ہو؟ بالکل بھی مہمان نواز نہیں ہو۔ کتنی دیر ہو گئی ہے مجھے آئے ہوئے، نا کوئی ٹھنڈا اور نہ ہی رم۔ تم لوگ مہمانوں سے کھانے کا نہیں پوچھتے؟'' خوشبو نے مسکین سی شکل بناتے ہوئے کہا۔

''بھوکی کہیں کی؟'' ہانیہ نے اسی کی ٹون میں جواب دیا۔

(باقی آئندہ ماہ)

وحشی

ارے سخی داتا کہیں کے اٗتو مجھ پر ترس کھاتا ہے، جس نے ساٹھ ستر سال دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اُگنے اور خوشوں کے پکنے کے انتظار میں کاٹ دیے ہیں۔ تُو ان ہاتھوں پر چھ پیسے رکھ رہا ہے، جنہوں نے اتنی مٹی کھودی ہے کہ اکٹھی ہو تو پہاڑ بن جائے اور تُو مجھ پر......

ذخیرۂ ادب سے منتخب کردہ، ایک سادہ لوح عورت کی یادگار کتھا

انتخابِ خاص، میں اِس ماہ جس مرحوم لکھاری، نقاد اور شاعر کی تحریر، آپ کے مطالعے کے لیے منتخب کی گئی ہے...... وہ 20 نومبر 1916ء کو خوشاب، ضلع شاہ پور، پنجاب، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ آج بھی اُن کا نام اور اعلیٰ و منفرد کام آپ کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ قلم اٹھایئے اور لکھ بھیجئے نام؟؟ اور پھر دوشیزہ گفٹ ہیمپر آپ کے دروازے پر، آپ کے لیے ہوگا!

نوٹ: دوشیزہ جولائی 2012ء کے انتخابِ خاص کی مصنفہ خدیجہ مستور ہیں...... قرعہ اندازی کے بعد دوشیزہ گفٹ ہیمپر کراچی کی نسیم بانو کو روانہ کیا جارہا ہے۔

''آگئی!'' ہجوم میں سے کوئی بولا اور سب لوگ یوں دو دو قدم آگے بڑھ گئے، جیسے دو دو قدم پیچھے کھڑے رہتے تو وہ کسی غار میں گر جاتے۔

''کتنے نمبر والی ہے؟'' ہجوم کے پیچھے سے ایک بڑھیا نے پوچھا۔

''پانچ نمبر ہے۔'' بڑھیا کے عقب سے ایک پنواڑی بولا۔

بڑھیا ہڑ بڑا کر ہجوم کو چیرتی ہوئی یوں آگے بڑھنے لگی کہ سب لوگ بس کے بجائے بڑھیا کو دیکھنے لگے۔

''عجیب وحشی عورت ہے۔'' ایک شخص نے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ ''لے کے جبڑا توڑ ڈالا۔''

''ابے پاگل ہوئی ہے کیا؟'' ایک اور نے فریاد کی۔

اتنے میں بس آگئی۔ کنڈیکٹر نے کھڑاک سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''پہلے عورتیں۔''

ہجوم کے وسط میں پہنچی ہوئی بڑھیا رک گئی اور ہجوم نے بڑی ناگواری سے دو حصوں میں بٹ کر اُسے راستہ دے دیا۔

بڑھیا نے سر سے چادر اُٹھا کر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر چادر کا ایک پلو مٹھی میں پکڑ لیا اور دو ردیہ ہجوم پر فاتحانہ نظر ڈال کر کنڈیکٹر سے کہنے لگی۔ ''تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کر جنا ہے لڑکے۔''

''چل آ بھی مائی۔'' کنڈیکٹر نے شرما کر کہا۔

''رستہ تو میں ویسے بھی بنا لیتی۔ آدھا تو بنا بھی لیا تھا۔ پر تو نے جو بات کہی ہے، وہ ہزار روپے کی ہے۔'' بڑھیا نے بس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے وہ دوسری سیڑھی کو ہاتھ سے جکڑ کر بیٹھ گئی، جیسے بہت بلندی پر پہنچ کر چکرا گئی ہے۔ کنڈیکٹر نے اُسے تھام لیا، ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور دروازے کے سامنے ہی ایک سیٹ پر بٹھا دیا۔ پھر سب لوگ بس میں بھر دیے گئے اور اس ریلے میں کنڈیکٹر بس کے پرلے سرے پر پہنچ گیا۔

بڑھیا نے ذرا سا اُٹھ کر سیٹ کو ہاتھ سے ایک دو بار دبایا اور آہستہ سے بولی: ''بڑی نرم ہے۔''

بس چلی تو اس نے دائیں طرف دیکھا۔ ایک گوری چٹی عورت، دودھیا رنگ کی صاف ستھری ساڑی پہنے، سنہری فریم کی عینک لگائے، سفید چمڑے کا پرس ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی اور کھڑکی سے باہر دیکھے جارہی تھی۔

بڑھیا نے بھی گردن کو ذرا سا کھینچ کر باہر دیکھا۔ ہر چیز پیچھے کی طرف بھاگی جارہی تھی۔ وہ آنکھیں مل کر سامنے دیکھنے لگی۔ پل بھر بعد اس نے گوری چٹی عورت کی طرف دوبارہ دیکھا۔ پھر اپنی انگشت شہادت اُس کے گھٹنے پر بجا دی۔ عورت نے بھنویں سکیڑ کر بڑھیا کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

''چکر آجائے گا باہر مت دیکھو۔''

گوری چٹی عورت مسکرائی اور بولی۔ ''مجھے چکر نہیں آتا، اس لیے میں تو دیکھوں گی۔'' عورت نے کہا۔

بڑھیا نے پوچھا۔ ''تو کیا تم باہر نہیں دیکھو گی تو تمہیں چکر آجائے گا؟''

عورت کی مسکراہٹ یکا یک غائب ہوگئی اور وہ باہر دیکھنے لگی۔

بڑھیا کو اگلی سیٹ پر ایک عورت کا صرف سر نظر آرہا تھا۔ اُس نے بالوں میں زرد رنگ کا ایک پھول سجا رکھا تھا۔ بڑھیا نے ذرا سا آگے جھک کر پھول کو

غور سے دیکھا، پھر انگلی سے اپنی ہم سائی کا گھٹنا بجا کر بڑی راز داری سے بولی۔ ''یہ پھول اصلی ہے کہ نقلی؟''

''نقلی ہے۔'' عورت بولی۔

''نقلی ہے تو سونے کا ہوگا۔'' بڑھیا نے رائے ظاہر کی۔

''رنگ تو سونے کا ہے۔'' عورت نے کہا۔

''مجھے تو اصلی لگتا ہے۔ کسی جھاڑی سے اتارا ہے؟'' بڑھیا بولی۔

''تو پھر اصلی ہوگا۔'' عورت نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑھیا نے ذرا سا حیران ہو کر گوری چٹی عورت کی طرف دیکھا اور پھر انگلی سے اُس کا گھٹنا بجا دیا۔

''کیا ہے؟'' عورت نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

بڑھیا بولی۔ ''عجب بات ہے باہر تم دیکھتی ہو اور چکر مجھے آجاتا ہے۔'' عورت ذرا سی مسکرائی۔

''سنو۔'' بڑھیا نے کہا۔

''کیا ہے؟'' عورت نے پھر سے بھنویں سکیڑ لیں۔

''لیڈی ہو؟'' بڑھیا نے سوال کیا۔

''کیا؟'' عورت نے جیسے برا مان کر پوچھا۔

''اسپتال کی لیڈی ہو؟'' بڑھیا نے وضاحت کی۔

''نہیں!'' عورت بولی۔

''تو پھر کیا ہو؟''

''کیا؟''

''کیا کرتی ہو؟''

''کچھ نہیں کرتی۔''

''کچھ تو ضرور کرتی ہوگی!'' بڑھیا نے دائیں بائیں سر ہلا کر کہا۔

''ٹکٹ لے لو مائی!'' بڑھیا نے اپنے سر کے اوپر سے کنڈیکٹر کی آواز سنی۔

''دے دو۔'' بڑھیا نے چادر کا پہلو مٹھی سے آزاد کردیا۔

''کہاں جاؤ گی؟'' کنڈیکٹر نے پوچھا۔

''گھر جاؤں گی بیٹا۔'' بڑھیا بڑے پیار سے بولی۔

''کنڈیکٹر زور سے ہنسا۔ گوری چٹی عورت بھی بڑھیا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

کنڈیکٹر نے جیسے تمام مسافروں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میں نے مائی سے پوچھا، کہاں جاؤ گی، بولی گھر جاؤں گی۔''

اب کے مسافروں نے بھی کنڈیکٹر کے قہقہے کا ساتھ دیا۔

کنڈیکٹر بہت محظوظ ہوا تھا۔ اس لیے بڑھیا کو بڑی نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''گھر تو سب لوگ جائیں گے مائی، یہ بتاؤ میں کہاں کا ٹکٹ کاٹوں؟''

''والٹن......'' وہ بولی۔ ''میرا گھر والٹن کے پار ایک گاؤں میں ہے۔''

مسکراتے ہوئے کنڈیکٹر نے ٹکٹ کاٹ کر بڑھیا کو دیا اور بولا۔ ''ساڑھے پانچ آنے دے دو۔''

''ساڑھے پانچ آنے؟'' بڑھیا نے چادر کے پلو کی گرہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ ''ساڑھے پانچ آنے کیسے؟ غوثا تو کہہ رہا تھا، صرف چار آنے لگتے ہیں۔ اُس نے تو مجھے صرف یہ گول مول چونی ہی دی ہے۔'' اُس نے چونی دو انگلیوں کی پوروں میں تھام کر کنڈیکٹر کی طرف بڑھا دی۔

کنڈیکٹر بولا۔ ''نہیں مائی! چار آنے نہیں، ساڑھے پانچ آنے لگتے ہیں۔''

بڑھیا کی آواز تیز ہوگئی۔ ''ساری دنیا کے چار آنے لگتے ہیں۔ میرے ساڑھے پانچ آنے لگ گئے، کیوں؟ ہڈیوں کا تو ڈھیر ہوں، میرا بوجھ ہی کیا،

لے یہ چار آنے۔''

''عجیب مصیبت ہے۔'' کنڈیکٹر کے تیور بدل گئے اور وہ مسافروں کو سامعین بنا کر تقریر کرنے لگا۔ ''میں تو کہتا ہوں۔ سرکار کو قانون پاس کرنا چاہیے کہ جو پرائمری پاس نہ ہو، بس میں سفر نہ کرے۔ اب اس مائی کو دیکھیے، میو اسپتال کے اسٹینڈ سے بس میں بیٹھی ہے۔ والٹن جا رہی ہے اور کہتی ہے والٹن بھی جاؤں گی اور ساڑھے پانچ آنے بھی نہیں دوں گی۔ اس لیے کہ کسی نے اسے چار آنے ہی دیے ہیں''

بڑھیا کسی بچے کی طرح بولی۔ ''کسی نے کیوں؟ اپنے غوثے نے دیے ہیں۔''

کنڈیکٹر نے سلسلہ ءتقریر جاری رکھتے ہوئے اور اب کے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے کہ غوثے نے اسے صرف چار آنے دیے ہیں۔ اب اسے کون سمجھائے کہ بس سرکار کی ہے۔ غوثے کی نہیں۔ غوثے کی ہوتی تو وہ تم سے چار آنے ہی لیتا۔''

''کیوں؟......وہ کیوں لیتا چار آنے؟'' بڑھیا بولی۔ ''وہ تو میرا بھتیجا لگتا ہے۔ بڑا کماؤ ہے۔ روز ریڑھے پر دودھ لاتا ہے۔ آج میں اُسی کے ریڑھے پر تو آئی تھی۔ چار آنے چھوڑ، چار پیسے بھی نہیں مانگے۔ اس کی مجال تھی جو مانگتا، گود میں کھلایا ہے اسے میں نے۔ اس کی سالی یہاں اسپتال میں بیمار پڑی ہے۔ میں نے کہا چلو اُسے دیکھ لوں۔ اسی کے ریڑھے پر واپس آجاؤں گی مگر آج لڑکی کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس لیے غوثا یہیں رہ گیا ہے اور مجھے یہ چونی دے کر کہا ہے کہ گھر چلی جاؤں۔ اب تم ساڑھے پانچ آنے مانگ رہے ہو، تو یوں کرو مجھے کسی چار آنے والی جگہ پر بٹھا دو۔ میں تو کسان عورت ہوں۔ نیچے بھی بیٹھ جاؤں گی۔ تم کہیں اس نرم نرم گدے کے تو ساڑھے پانچ آنے نہیں مانگ رہے؟''

''نہیں مائی!'' کنڈیکٹر نے تنگ آ کر کہا۔ ''سب سواریوں کے نیچے ایسے ہی گدے ہیں۔''

بڑھیا نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''تو پھر میں کیا کروں؟''

''ڈیڑھ آنا اور نکالو۔'' کنڈیکٹر بولا۔

''کہاں سے نکالوں؟'' وہ بولی۔ ''بتا جو رہی ہوں کہ میں گھر سے خالی ہاتھ آئی تھی۔ یہ چونی بھی غوثے نے دی ہے۔ کل اُسے لوٹا دوں گی۔''

کنڈیکٹر صاف طور سے اپنے غصے پر ضبط کر رہا تھا، بولا۔ ''مجھے تو آج ہی چاہیے مائی! میں تو ٹکٹ کاٹ چکا ہوں۔ جلدی کرو۔ اتنے بہت سے اسٹینڈ گزر چکے ہیں۔ اتنی بہت سی سواریاں جمع ہوگئی ہیں۔ سب کے ٹکٹ کاٹنے ہیں۔ کوئی چیکر آگیا تو جان آفت میں کردے گا۔ بھئی لوگو! خدا کے لیے اِس مائی کو سمجھاؤ! جانا والٹن ہے اور کرایہ ماڈل ٹاؤن کا بھی نہیں دے رہی ہے۔ پھر کہتی ہے چونی سے زیادہ ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔''

بڑھیا کے سامنے والی سیٹ پر بالوں میں پھول سجا کر بیٹھی ہوئی عورت نے پلٹ کر کہا۔ ''ایسیوں کی تلاشی لینی چاہیے۔ ان کی جیبیں اکیوں، دونیوں سے بھری ہوتی ہیں۔''

بڑھیا اُس کے سر کے اوپر چیخ اٹھی۔ ''کیا تُو میرے بیٹے کی گھر والی ہے کہ تجھے میری جیبوں کا مال بھی معلوم ہے؟ سر میں کوڑی کا پھول لگا لینے سے بھیجے میں عقل نہیں بھر جاتی بی بی رانی۔''

پھول والی عورت دانت کچکچا کر رہ گئی۔

گوری چٹی عورت نے بڑھیا کا بازو پکڑ کر اُسے سیٹ کی طرف کھینچا اور بڑھیا بیٹھ گئی۔

''عجیب وحشی عورت ہے۔'' کسی کی آواز آئی۔

''یہ کون بولا؟'' بڑھیا نے پلٹ کر بس کے آخری سرے تک نظریں دوڑائیں۔ ''ذرا ایک بار پھر بولے کہ میں اُس کی زبان یوں لمبی لمبی کھینچ کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں؟''

گوری چٹی عورت کو جھرجھری سی آ گئی اور وہ یوں سمٹ گئی جیسے بڑھیا نے سچ مچ لکتی ہوئی اور خون ٹپکاتی ہوئی زبان اُس کے اوپر سے گزار کر کھڑکی سے باہر اچھال دی ہو۔

''دیکھ مائی!'' کنڈیکٹر جو اُس دوران میں دوسرے مسافروں کے ٹکٹ کاٹنے لگا تھا۔ اس کے قریب آ کر سختی سے بولا۔ ''ساڑھے پانچ آنے دے گی یا نہیں؟''

''تُو تو تھانے داروں کی طرح بولنے لگا لڑکے! کہہ جو رہی ہوں کہ چونی یہ رہی، باقی رہے چھ پیسے تو وہ میں تجھے پہنچا دوں گی۔ کل والٹن میں آ کر بیٹھ جاؤں گی اور تُو آئے گا تو تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گی، کھرے کر لینا۔''

''لو اور سنو۔'' کنڈیکٹر نے سب مسافروں سے فریاد کی۔ پھر یکایک اُس کے تنے ہوئے تیور ڈھیلے پڑنے لگے اور وہ ایک سفید پوش بزرگ کے پاس جا کر جھک گیا۔

بڑھیا نے انگلی سے گوری چٹی عورت کا گھٹنا بجایا۔ جب عورت نے اس کی طرف دیکھا تو بڑھیا بولی۔ ''دیکھ رہی ہو؟''

عورت نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''لگتے تو مائی، ساڑھے پانچ ہی آنے ہیں۔ پھر یہ بس سرکاری ہے۔ یہ لڑکا سرکار کا نوکر ہے۔ ایک آنا بھی کسی سے کم لے تو یا اپنی جیب سے ڈالے گا یا نوکری چھوٹ جائے گی غریب کی!''

''ہئے ہئے بے چارہ!'' بڑھیا نے بڑے پیار سے کنڈیکٹر کی طرف دیکھا۔ ''میں نے تو عمر بھر اپنا رزق اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے۔ میں کیوں کسی کے رزق پر ڈاکا ڈالوں، چھ پیسوں کے پیچھے۔ مجھے کیا خبر تھی۔ وہ غوثا ہی دھوکا دے گیا۔ پر اُسے کیا پتا، وہ بے چارہ بھی تو ریڑھے پر لاہور آتا ہے، اب کیا کروں؟''

''یوں کرو۔'' گوری چٹی عورت نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں.....''

اتنے میں کنڈیکٹر آ گیا۔ بڑھیا بولی۔ ''بھئی لڑکے! مجھے تو خبر نہیں تھی کہ اس طرح.....''

کنڈیکٹر بولا۔ ''بس مائی! اب سارا حساب ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں تجھے والٹن ہی پر اتار دوں گا۔''

بڑھیا کھل گئی۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کر جنا ہے۔ پر یہ بتا لڑکے! کہ چونی ہی پر راضی ہو جانا تھا تو ساڑھے پانچ آنے کا جھگڑا کیوں چلایا؟''

''حساب تو مائی ساڑھے پانچ ہی آنے سے پورا ہوا ہے۔'' کنڈیکٹر بولا۔

''تو میں چھ پیسے کہاں سے لاؤں؟'' بڑھیا پھر سے اداس ہو گئی۔

''چھ پیسے مجھے مل گئے۔'' وہ بولا۔

''کہاں سے ملے؟'' بڑھیا نے پوچھا۔

''اُس چوہدری نے دیے ہیں۔'' کنڈیکٹر نے سفید پوش بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں دیے ہیں؟'' بڑھیا نے حیران ہو کر پوچھا۔

کنڈیکٹر بولا۔ ''ترس کھا کر دے دیے۔''

بڑھیا اٹھنے کی کوشش میں سیٹ پر گر پڑی۔ ''کس پر ترس کھایا؟'' وہ چلائی۔

''تم پر اور کس پر!'' کنڈیکٹر بولا۔

بڑھیا بھڑک کر اٹھی اور چیخ کر بولی۔ ''ذرا میں بھی تو دیکھوں اپنے ترس کھانے والے کو.....''

گوری چٹی عورت فوراً پرس بند کر کے بڑھیا کی طرف دیکھنے لگی۔

بڑھیا چھت سے لگے ڈنڈوں اور سیٹوں کی پشتوں کے سہارے سفید پوش بزرگ کی طرف

جانے لگی۔ ''یہ چھ پیسے کیا تیری جیب میں بہت کود رہے تھے کہ تُو نے ترس کھا کر میری طرف یوں پھینک دیے، جیسے کتے کی طرف ہڈی پھینکی جاتی ہے۔''

''لیجیے، یہ ہے بھلائی کا زمانہ۔'' کوئی بولا۔

سفید پوش بزرگ کا رنگ مٹی کا سا ہو گیا اور بڑھیا بولتی رہی۔ ''ارے سخی داتا کہیں کے! تُو مجھ پر ترس کھاتا ہے، جس نے ساٹھ ستر سال دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اُگنے اور خوشوں کے پکنے کے انتظار میں کاٹ دیے ہیں۔ تو ان ہاتھوں پر چھ پیسے رکھ رہا ہے، جنہوں نے اتنی مٹی کھودی ہے کہ اکٹھی ہو تو پہاڑ بن جائے اور تو مجھ پر ترس کھاتا ہے؟ کیا تیرے گھر میں تیری کوئی ماں بہن نہیں ہے ترس کھانے کے لیے؟ کوئی اندھا فقیر نہیں ملا تجھے رستے میں؟ شرم نہیں آتی تجھے ایک کسان عورت پر ترس کھاتے ہوئے؟''

پھر وہ کنڈیکٹر کی طرف پلٹی۔ ''یہ چھ پیسے جو اس نے مجھ پر تھوکے ہیں، اِسے واپس دے دے اور مجھے یہیں اتار دے۔ مجھے پیدل چلنا آتا ہے۔''

بڑھیا خاموش ہو گئی۔ بس میں صرف بس چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

بس ایک لمحے بعد اسٹینڈ پر رکی تو بڑھیا سیڑھیوں کی پروا کیے بغیر دروازے میں سے نکلی اور باہر سڑک پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر وہ اٹھی۔ کپڑے جھاڑے اور ناقابلِ یقین تیزی سے والٹن کی طرف جانے لگی۔

بس میں سے کسی کی آواز آئی۔ ''عجیب وحشی عورت ہے!''

.....☆☆.....

عید کا چاند اور میرا ساجن

عید کے چاند کی بات کریں کیا
وہ تو جھلملاتا ہے
دور سے اپنی چھب کھلا کے
بادل میں چھپ جاتا ہے
جیسے میرا پیارا ساجن
اپنی راہ دکھاتا ہے
اک لمحے میں میرے دل کو
پیار سے گدگداتا ہے
دوجے پل میں جانے پھر کیوں
مجھ سے روٹھ وہ جاتا ہے
ہے تو اچھا لیکن سکھیو
گھڑی میں تولہ ماشہ ہے

شگفتہ شفیق

علی زبیر

مُلا حیدر کان پوری

ملا حیدر کی تان کان پور سے شروع ہوتی اور کان پور ہی پر ٹوٹتی۔ دریاؤں کی بات چلتی تو سب سے اچھا گنگا...... اس لیے نہیں کہ کان پور گنگا کنارے آباد ہے، بلکہ اس لیے کہ گنگا کان پور کو سلامی دے کر گزرتا ہے۔ کسی نے ایک مرتبہ بتادیا کہ......

عید نمبر کے لیے بطورِ خاص، علی زبیر کی خوشہ چینی

انگریزی سے ہماری محبت مثالی ہے، انگریز باؤلے تھے جو ہمیں اردو سکھانے کی کوشش کرتے رہے، اگر اتنی کوشش وہ ہم سے انگریزی سیکھنے میں کرتے تو آج چین کی سرکاری زبان انگریزی قرار دلوا چکے ہوتے، انگریز کی ناکام کوششیں تو ملاحظہ فرمایئے، اس نے ہمیں وکیل بنایا اور ہم ہیں کہ ایڈوکیٹ بنے پھرتے ہیں، جاہل انگریز نے عدالت بنائی، پڑھے لکھوں نے کورٹ، انگریز کی بد منصفی کی انتہا دیکھو کہ برصغیر کے آئین میں قاضی کا عہدہ لکھ دیا، شکر خدا کہ ہمارے ہاں عقل مند دانش ور موجود تھے، آخر کو انگریز دشمن بھی تھے، قاضی کو جج کروا کر دم لیا، اور ایسا جج بنایا کہ ہمارے جج مفتی اسلام بن بیٹھے، یعنی کہ صاحب اردو بولنا ہی خود پر حرام قرار دے دیا اور اردو میں فیصلہ، توبہ توبہ کیجیے صاحب، کفر عظیم ٹھہر گیا۔ انصاف کے لیے اپنی گابھن بھینس بیچنے والا جیدا گجر سمجھا کہ جج صاحب شاید مونیکا لیونسکی اور بل کلنٹن کا فیصلہ سنا رہے ہیں، وہ تو جب زمین سے بے دخل کیا گیا تو عقدہ کھلا وہ اپنی بھینس تو کیا سب کچھ انگریزی کی بھینٹ چڑھا چکا ہے۔

خیر چھوڑیں بات ہم کرنا چاہ رہے تھے گولیمار کی جہاں ہم نے پنگھوڑے میں انگوٹھے چوسے تھے۔ انگریز نا ہنجار، کم پڑھے لکھے، بلکہ نرے جاہل نے جب ہندستان میں اپنے شوٹنگ ایریا بنائے تو سر سید پر رعب جھاڑنے کے لیے ان کا نام رکھا" گولی مار" مگر ہمارے والے کہاں بھرے میں آنے والے تھے۔ انگریز دشمنی بھی آخر کوئی چیز ہے خالہ جی کا باڑا تھوڑی ہے۔ رسالدار، کمان دار، حوالدار، کوتوال، جرنیل، سپاہی، بند باز، کمان دار میسرہ، کمان دار میمنہ اور نہ جانے کیا کیا الا بلا...... ایک ایک کرکے سب کچھ نیست و نابود کر کے چھوڑا۔ تو گولی مار کو کیسے بخشتے، مٹا کر دم لیا۔ جنرل، کمانڈر، میجر، فوجی، سینٹرل کمانڈر، لیفٹننٹ جیسے خوبصورت لفظ ہم نے ایجاد کر ہی لیے، چھاؤنی کیسا بکواس نام ہے، ذرا کینٹ کو دیکھو، اس کا ترنم، حسن و جمال دیکھو، کینٹ پڑھتے ہی ہر طرف سینٹ ہی سینٹ ہو جائے، لیکن گولی مار کے ساتھ تو انتہائی سختی کے ساتھ نمٹا گیا، جرنیل، حوالدار، چھاؤنی وغیرہ تو کہیں نہ کہیں کوئی جاہل لکھ بول ہی لیتا ہے، مگر گولی مار کو ایسی گولی ماری کہ لاشہ چھلنی چھلنی کردیا۔ ہماری پڑھی لکھی فوج میں شوٹنگ ہاؤس اور شوٹنگ ایریاز بکثرت مل جائیں گے، گولیمار کہیں نہ ملے گا، ہاں پرانے شہروں میں گولیمار کے علاقے ضرور مل جائیں گے جو انگریز کی، ہماری قومی زبان اور انگریزی دشمنی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ایسا ہی گولیمار یہاں کراچی میں بسا ہوا ہے، یہ علاقہ دریائے لسبیلہ کے کنارے کنارے آباد ہے، کراچی کے تمام بیت الخلا اس دریائے لسبیلہ کا سرچشمہ ہیں، اسی گولیمار میں ایک چھوٹی سی کچی بستی ہے جہانگیر آباد۔ میرے والد محترم حضرت علامہ مولانا مرزا محمد حافظ شریف بیگ مدظلہ العالی دامت برکاتہم العالیہ المعروف عاشق۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی رفیقِ حیات، عفت مآب زوجہ محترمہ مغلانی بیگم اسی جہانگیر آباد میں تولد ہوئی تھیں تو ہماری کیا مجال تھی جو ہم کسی اور علاقے محلے میں ہوش سنبھالتے، البتہ والد محترم مجال پہلے ہی کر چکے تھے، ایک راوی کا کہنا ہے کہ وہ بوند میں پیدا ہوئے دوسرے کا کہنا ہے کہ ہمارے دادا حضور کی دکان دہلی میں تھی اور گھر بوند میں، تقسیم کی ہراوڑی میں بال بچے دہلی لے آئے تھے، یہیں والد پیدا ہوئے، پہلے راوی میرے نانا ہیں جو ہمیں بوندیا کہتے ہیں دوسرے راوی ہمارے گھر سے ہیں، جو دہلوی کہلانے میں شان سمجھتے ہیں۔ ویسے نانا اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارے پڑدادا، سڑدادا دلی والے ہی تھے، تمھارے دادا بوند جا بسے تھے، سو تمھارے والد بوندیے ہیں۔ قصہ مختصر ہمارے نانا، ہمارے دادا، پڑدادا، سڑدادا کو دلی والا مانے لیتے ہیں، مگر والد محترم صاحب کو جس دن دلی والا مان لیا تو سمجھو قبر دیکھیں گے۔ نانا بام ڈولے کے ہیں، نانی بھیوانی کی، نانا اور دادا ماموں پھوپھی کے بیٹے۔۔ سارے کٹر مغل، سارے خون کے رشتے مگر علاقوں میں تقسیم، جیسے کہ انھی کے نام لکھی جاگیر ہیں، فلاں کی لڑکی نہ لینا بھوپالی ہیں، ناک کان کاٹ کر کھا جائیں گے، میاں جے پوریوں کے ساتھ زیادہ اٹھا بیٹھا نہ کرو۔ یہ ہمارے سسرالی ہیں۔ ان کے کرتوت ہمی جانیں، فرقا گڑھیوں کو تو نہ اٹھنے کا سلیقہ نہ بیٹھنے کا۔ سنا ہے بوا بادشاہ گریوں کے لڑکی بیاہ رہی ہیں، انھیں بتاؤ وہ پورب کے، ہم پچھم کے، ہمارا کیا تال میل......!

☆......☆

یہ بات تو ہمارے گھروں کی، اعزا و اقربا کی تھی، جہانگیر آباد میں کئی خانوادے آباد ہیں...... میٹھے کنویں کے اردگرد اکہتر سے پہلے بنگالی بسے ہوئے تھے۔ وہ مچھلیوں کے تعاقب میں بنگلا دیش چلے گئے تو کانپوری اور کچھ بجنوری وہاں جم گئے۔ میٹھے کنویں سے آگے بڑھو تو فیاض دودھ والے کے اردگرد ہمارے خانوادے تھے یعنی دلی کے دیہاتی، ذرا آگے للا کریانے والے کے اردگرد علی گڑھ اور بدایوں والے تھے۔ اس سے اور آگے بڑھو تو اپنے سعود عثمانی کے جدِ امجد کے نام پر آباد عثمانیہ کالونی شروع ہوجاتی ہے، قسم سے جھوٹ نہیں بول رہا کالونی پر باقاعدہ حضرت کے جدِ امجد کے ہاتھ سے افتتاحی تختی لگی ہوئی ہے۔۔

اس علاقے کا نام جہانگیر آباد کیسے پڑا، مرحوم ملا کباب والے کہا کرتے تھے کہ ان کے ابا حضور کا نام

جہانگیر تھا، کانپور سے یہاں پہلی کھولی وہی نے بنائی تھی، سنئے بھائی چھولے والے کہا کرتے تھے کہ ان کے دادا کے نام پر جہانگیر آباد تھا۔ جاوید ہسپتال کے مالک غنی دہلوی جب بھی بلدیہ کا ووٹ مانگنے آتے یہی کہتے کہ جہانگیر آباد وہی نے بسایا ہے اور جہانگیر بادشاہ کے نام پر یہ بستی چھوڑی ہے، عجیب عالم تھا۔

کبھی دلاور پنجابی کے چبوترے پر محفل جمتی، کبھی خالہ تبسم کی چوکھٹ پر، کبھی للاّ کی دکان کے سامنے مسجد کے گیٹ پر تو، کبھی پلیا کے آسن میں، قائداعظم، لیاقت علی خاں سے بات شروع ہوتی اور روس امریکا پر جا تھمتی۔ ایک سے بڑھ کر ایک افلاطون، سقراط بقراط ہوتا، سچ پوچھو تو وہ دھواں دھاری ہوتی کہ شیکسپئر سنتا تو کوئی کام کی بات لے ہی جاتا، بس اس کی موجودی شرط ہے۔

☆......☆

کالی مَیا کا ذکر رہ گیا۔ ساڑھے تین فٹ قد، اسی نوے سال عمر، دھاگوں سے باندھا ہوا موٹا چشمہ، میلا کچیلا گھاگرا، گلے میں سبز رنگ کا موٹا سا گنڈا۔ وہ گھر سے نکلتیں تو بچے چیل کوا بن کے جھپٹتے، وہ رن مچتا کہ حضرت علامہ اقبال کی ترغیب شاہین بھی شرما جاتی۔ ایک چھیڑ خانی پر پکی سو گالیوں سے نوازتیں۔ محاورتاً نہیں حقیقتاً سو گالیاں۔ باقاعدہ گنتی کرتی جاتیں اور گالیاں دیتی جاتیں،، ایک دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات اور پورے سو تک۔

جوں جوں گالیوں کی شماریات بڑھتی جاتیں، بہ لحاظ درجہ بندی گالیوں کا ٹیمپو بڑھتا جاتا۔

بیانوے میں ایم کیو ایم کے خلاف جب فوجی آپریشن شروع ہوا، پہلا دن تھا کرفیو کا، کالی مَیا گھر سے باہر نکلی، ایک بچہ بھی چھیڑ خانی کو نہیں آیا، سنا ہے کالی مَیا دوپہر تک بچوں کے انتظار میں دیواروں کو گالیاں بکتی رہی، اسی دن، رات کو مر گئی۔ اور کرفیو میں بڑی مشکل سے دفنائی گئی، ہمیں تو چار دن بعد جب کرفیو میں وقفہ آیا تب پتا چلا کہ کالی مَیا مر گئی۔

☆......☆

جہانگیر آباد اور عثمانیہ کالونی کے بیچ تیس چالیس گھر پشتونوں کے بھی ہیں۔ جہانگیر آباد کے ساتھ جہاں پشتونوں کی بستی ملتی ہے وہیں دریائے لسبیلا کے کنارے جہانگیر آباد کی ایک مشہور و معروف ہستی بمعہ اہل و عیال آباد تھی جس کا نام تھا" ملا حیدر کانپوری۔

زندگی میں ایسی پراسرار اور عجیب و غریب شخصیت نہیں دیکھی۔ اگر ہالی ووڈ کا نامی گرامی ڈائریکٹر انھیں دیکھ لیتا تو قسم سے "ایلینز" جیسی ناہنجار بے ہنگم مخلوق کبھی تشکیل نہیں دیتا۔ تین فٹ ایک بالش قد، چمکتا ہوا سرخ سنہرا رنگ، دھاری دار دھوتی اور جانگیا نما بنیان کا سدا بہار لباس، اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی مگر کنچے کی طرح گول، اور انگارے کی طرح دہکتی آنکھیں، سر مبارک پر دور دور تک بال کا نام و نشان نہیں، مشہور تھا کہ روزانہ کی بنیاد پر صبح صادق سے بھی قبل چندیا پر استرا نوازی کرتے ہیں۔ جس کے بارے میں ان کی قدیمی بیوی سے پوچھا جاتا تو پہلوٹھی کے رستم کی قسم کھاتیں اور کہتیں،، پچاس سال پیچھے ڈولی چڑھے، اور وہ بھی یہاں نہیں ہوا، کانپور میں ڈولی چڑھے تھے، تب سے آج تک ناصر کے ابا (ملا حیدر) کی چندریا پہ ایک بال نہیں دیکھا، کہے دیتے ہیں جس دن دیکھ لیا اس دن طلاق ہوئی۔ طلقوا کے ڈر سے...... یہ تو تھی چندریا مگر۔ فرنچ کٹ داڑھی کی ایجاد بھی ملا حیدر کی ہے۔ عمرو عیار جیسی باہر نکلی تھوڑی پر بالوں کا معمولی سا گچھا، بالکل ایسے جیسے سرخ گائے کی کھال کا ٹکڑا تھوڑی پر چیپ دیا گیا ہو۔ سب سے دلچسپ ان کی توند تھی، اتنی سڈول اور واضح کہ چلتے تو لڑھکتی گیند کا شائبہ ہوتا۔ نابالغوں کے علاوہ کوئی اس گینز بک ریکارڈ ہولڈر مردانی توند کا تصور کرنا چاہے تو تصور کر لے، بالکل ایسی جیسی ایک سوکھی سڑی منحنی سی عورت، مگر حاملہ۔

ملا حیدر بس نام کے ملا تھے، مسجد، مندر، گرجا وغیرہ سے انھیں دور دور علاقہ نہیں تھا۔ مہینوں بعد کبھی محلے سے باہر نکلتے تو سرخ پمپی والے لش پش جوتے، موتیے رنگ کی بوسکی کا کرتا پاجامہ...... ایسے جچتے یہ کرتا اور چست پاجامہ،، سبحان اللہ سبحان اللہ، بالکل اسی منظر سے وارنر برادرز نے آئیڈیا چرا کر "ڈونلڈ ڈک" کا کارٹون ایجاد کیا تھا۔ رائیلٹی چور کہیں کے...... شوخ سرخ رنگ کی نئی نکور واسکٹ، چندریا پر بھی سرخ رنگ کی نہرو کیپ...... ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا سرخ رنگ کا دستی بیگ، نظر زمین پر گڑی ہوتی اور قدم گنتے ہوئے سیدھا محلے سے باہر نکلتے چلے جاتے...... ایسا نہیں تھا کہ یہ سب کچھ آناً فاناً نمودار ہو جاتا۔ جس دن ملا حیدر نے محلے سے باہر جانا ہوتا اس دن صبح صادق ہی سے محلے بھر کو خبر ہو جاتی کہ آج ٹھیک نو بجے ملا حیدر روانہ ہوں گے۔ سورج بعد میں نکلتا ملا حیدر کی گھن گرج سے ان کا گھر پہلے روشن ہو جاتا۔ کبھی استری میں کوئلے رکھوا رہے ہیں، تو کبھی جوتوں کی چمک کم ہونے پر ناصر کو بے نقط سنا رہے ہیں، بے نقط کا محاورہ بھی ملا حیدر ہی سے سمجھ آیا۔ کبھی نقطے والی گالی دیتے ہی نہیں تھے، بے نقط کلمات کا ایک انبوہ کثیر ہے جو یہاں درج کیا تو مشکل ہو جائے گی۔ ہاں وہ ہندی سے اتنی رعایت ضرور لیتے تھے کہ جتنی اردوئے معلّیٰ عرشِ مقیم کی تشکیل کے دوران مغل لشکریوں نے لی تھی یعنی ک ٹ ڑ ڈ کو بے نقط ہی گردانتے تھے، اسی پر اکتفا کیجیے۔ مزید زبان نہ کھلوایئے۔

عجیب منظر ہوا کرتا تھا، قلو پطرہ بھی کیا اپنے محل سے نکلتی ہوگی۔ عورتیں بالکنیوں سے لٹک جاتیں، بچے دروازے پر کھڑے ہو جاتے، اور مرد بھی جھینپتے جھانپتے دروازے کی درزوں سے جھانکتے، ملا حیدر کی روانگی کا شاندار نظارہ کوئی بھی مس کرنے کو تیار نہ تھا اور ملا حیدر...... اگر کوئی یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ جھینپ کر نظریں جھکائے گزرتے تھے تو پھر سمجھتا رہے، ہر کسی کی اپنی اپنی سمجھ دانی ہے، مگر ملا حیدر تو صاحب اس سوچ سے گزرتے تھے کہ مجھ ایسا حسین جمیل خوبرو، صاحبِ جمال، فیشن ایبل، میچنگ ایبل شخص اب نظر اٹھا کر اس ناہنجار محلے کے کس کس کالے کلوٹے یا کلوٹن کو دیکھے۔ ان کا لیول تو جیا پرادہ ہیما مالنی کے برابر ہوتا تھا، ہاں اگر کچھ احسان کریں اور کم پر اتر آئیں تو زیادہ سے زیادہ انجمن پر نظر عنایت ڈال سکتے تھے، اس سے نیچے آنے کو وہ ہرگز تیار نہیں تھے۔

ملا حیدر پائے حقارت سے اہلِ محلّہ کو ٹھکراتے ہوئے جانے کو تو چلے جاتے مگر پیچھے صفِ زعفران بچھا جاتے۔ عورتیں ہنس ہنس کے ادھ موئی ہو جاتیں، مرد چبوتروں پر جمع ہو جاتے، نقالی کر کر کے قہقہے لگاتے، پھر وہی ہوتا جو ہمیشہ ہوتا تھا، رستم یا سہراب میں سے ملا حیدر کا کوئی صاحبزادہ چھری نکال لاتا، اور نقالی کرنے والوں کو وہ للکارتا کہ بس...... یہ ٹھیک ہے کہ وہ رستم اور سہراب تھے، مگر ایرانیوں کی طرح پاگل نہیں تھے، چھری بس دور ہی دور سے لہراتے، کبھی نزدیک نہ آتے تھے۔

☆......☆

شام سے پہلے ہی ملا حیدر لوٹ آتے، جاتے تو وہ خیر بس ہی میں تھے مگر لوٹتے ہمیشہ ٹیکسی میں، ٹیکسی والا بارہا کہتا کہ خوچہ ام جاوید اسپتال سے آگے نہیں جائے گی۔'' مگر ملا حیدر زبردستی اس کی ٹیکسی گلی کے نکڑ تک ٹھونس ٹھانس کر لے ہی آتے، آخر پچاس روپے کی ٹیکسی لی ہے، سب کو پتا چلنا چاہیے، اور ٹیکسی

بھی خالی پیلی نہیں کپڑے لتے، اشیائے خورد ونوش سے لدی ہوئی۔ ایک لفافہ برنس روڈ کے پکوڑوں سموسوں سے بھرا ہوتا تو دوسرے میں دس کلو خالص بناسپتی کے چاول، ایک میں دس کلو بیل کا گوشت ایک میں گھی، مرچ، مسالے وغیرہ، رام سوامی کی بندہ مارکیٹ کا ایک لفافہ چوڑی جھمکوں سے بھرا ہوا، کبھی کبھی ایک آدھی زندہ کالی مرغی بھی برآمد ہو جاتی۔ ملا حیدر کی واپسی ساون کی پہلی پھوار ثابت ہوتی، انتظار میں چرمرچرمرا دھ موا ہوا پورا محلہ سرسبز گھاس کی طرح لہلہا اٹھتا۔ سب کو معلوم تھا کہ اب" نورانی نور، ہر بلا دور۔ جیے شاہ جبل میں شاہ" کے نام کی دیگ چڑھے گی۔ ملا حیدر لکڑی کا تخت نکال بیٹھیں گے اور محلے کے سارے سقراط، بقراط، افلاطون، ارشمیدس، بوعلی سینا، شیکسپیر، لینن، ہٹلر، نپولین بوناپارٹ، امیتابھ بچن، متھن چکروتی، رجنی کانت سمیت دیگر معززین آج وہیں چوکڑی جمائیں گے۔ تب تک نیاز کی دیگ کا ایک ایک دانہ چک کر پیٹ میں محفوظ نہ کرلیا جائے وہاں سے ہلنا گناہ، جس کا کفارہ مفت کی پلاؤ سے محرومی۔ مگر آج کے دن کا تو ملا حیدر مہینے بھر انتظار کیا کرتے، آج کہاں کسی کی سقراطی، بقراطی چلتی۔۔ آج تو جو بہترین سامع ہونے کا ثبوت دے گا، وہی پلاؤ کھائے گا...... ملا حیدر کی تان کان پور سے شروع ہوتی اور کان پور ہی پر ٹوٹتی۔ دریاؤں کی بات چلتی تو سب سے اچھا گنگا...... اس لیے نہیں کہ کان پور گنگا کنارے آباد ہے، بلکہ اس لیے کہ گنگا کان پور کو سلامی دے کر گزرتا ہے۔ کسی نے ایک مرتبہ بتا دیا کہ نیو کراچی کے دور دراز کنارے پر کان پور سوئیٹس کے نام سے ایک دکان کھلی ہے، وہ دن تھا کہ مرتے دم تک اسی دکان کا دم بھرتے رہے، محلے والوں کو یقین تھا کہ ملا حیدر اتنی دور کان پور سوئیٹس کبھی نہ گئے ہوں گے، مگر جہاں کسی کے نیاز بٹتی فوراً لڑھکتے ہوئے پہنچ جاتے۔

''اماں کانپور سوئٹس سے منگاتے تو نیاز بانٹنے نہ پڑتی،، لوگ ہاتھوں سے چھین جھپٹ کے لے جاتے۔''

بقول ملا حیدر۔ دنیا کے عظیم بہادر کان پور ہی میں تھے۔ ایک دن کسی نے کہہ دیا کہ آج طے ہوا کہ رستم سہراب چونکہ ایرانی تھے اس لیے کوئی بہادر نہ تھے۔

بس جوش حیدری سے ابل پڑے اور جھٹ بولے۔

''ابے سالے...... ہمارے پوت رستم سہراب، ایرانی رستم سہراب تھوڑا ہیں۔ یہ دوسرے رستم سہراب ہیں جو کان پور میں بھی گزرے ہیں۔''

ان رستم سہرابوں کے گزرنے کا زمانہ پوچھا جاتا تو آغاز نوروز سے بھی قبل کا زمانہ بتاتے۔

انگریزوں کو دیس نکالا دینے کا ذکر چھڑتا تو پلاؤ کی دیگ سے پھڑکتی ہوئی خوشبو سامعین سے منوا لیتی کہ کان پور نہ ہوتا تو انگریز ہندستان کو آزادی دے ہی نہیں سکتے تھے۔

ایک دن تو حد ہی کر دی۔ اڑ گئے کہ حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کانپور کے گھنٹا گھر میں پیدا ہوئے تھے، قصہ سنایا کہ جناح پونجا کو خواب میں بشارت ہوئی کہ اگر نامور فرزند کا والد ہونا چاہتے ہو تو زوجہ کو فوراً کان پور لے جاؤ، چنانچہ قائد اعظم بھی صرف پیدا ہونے کی غرض سے کان پور لائے گئے تھے۔

دروغ بہ گردن راوی کہ ہٹلر نے بھی اپنی ٹوپی میں کان پور کی خاک سی رکھی تھی۔ جس دن سے وہ ٹوپی ہٹلر نے گنوائی اسی دن سے خود ہٹلر لاپتا ہے۔ اب یہ صرف ملا حیدر ہی جانتے تھے کہ روپوش ہونے

کے بعد ہٹلر سیدھا کان پور خاک لینے آیا تھا، مگر واپس ہی نہیں گیا۔ کانپوری ہو کر مرا......!

☆......☆

ملا حیدر کے کاروبار کے بارے میں الف لیلہ کے ہزار قصے مشہور تھے۔ بہت سوں کا خیال تھا کہ ملا حیدر کے قبضے میں جنات ہیں، کسی کا کہنا تھا کہ وہ بنگال سے کالا جادو سیکھے ہوئے ہیں اور یہی کام دھندا ہے، کسی نے انھیں بردہ فروش قرار دیا ہوا تھا، کوئی انھیں اسمگلر سمجھتا تھا، ان کاروبار سے کسی کو اچھی توقع ہرگز نہ تھی۔ محلے والے ایسے کہ کسی کو موت کا قطرہ نہ دیں اور ملا حیدر سے ہر مہینے ایک پوری سالم دیگ ہڑپ کر جائیں۔'' ننّے بھائی چھولے والے روزانہ صبح چھولے بیچنے نکلتے شام کو لوٹتے، نیاز ٹینٹ والا شادیوں کے سیزن میں تو کئی کئی دن گھر نہ آتا،، کلیم عرف کلمو اگھڑی کی فیکٹری میں دس گھنٹے کی ڈیوٹی دیتا۔ محلے کے سارے مرد محنت مشقت کر کے دو وقت کی روٹی کماتے مگر ملا حیدر سارا دن گھر میں پڑے وی سی آر لگائے رہتے۔ چھ لڑکے، تین لڑکیاں،، جنھیں خوب اچھا کھلا رہے پہنا رہے تھے۔ مہینے میں پورے محلے کی گوشت سے بھری ہوئی پلاؤ کی ایک دعوت۔ اکثر بیٹھکوں میں چائے، چنے، ملیدہ انھی کے گھر سے آتا۔

محلے والوں کے کسی کام تو وہ نہ آتے مگر کسی کا کوٹ کچہری پولیس سے واسطہ پڑ جاتا تو پھر تو دمادم مست قلندر...... ملا حیدر سینہ ٹھونک کر عدالتوں تھانوں کا بھگتان بھگتے اور رات چبوترے پر بیٹھ کر ججوں اور ٹلوں کی وہ پھبتیاں اڑاتے کہ کیا انگریزوں نے مسلمان عہدوں کی اڑائیں ہوں گی۔ ذرا ذرا سی بات پر چھری نکال لاتے اور پھر تھوڑی دیر میں چائے کی کیتلی بھر کر صلح کرنے بھی خود ہی پہنچ جاتے۔ عجیب آدمی تھے ملا حیدر کانپوری۔

☆......☆

پھر ایک دن ملا حیدر اچانک مر گئے۔ صبح صادق تک ان کی استرانوازی کی گواہی موجود تھی۔ ایک دم صحیح سلامت تھے، اچانک ہی دھڑ سے تھرکتے ہوئے گرے اور مر گئے۔

محلے میں غدر مچ گیا،، دور دور سے دنیا آ گئی۔ پرانا جہانگیر آباد، گولیمار، جھنجی گراؤنڈ، لالوکھیت، بسم اللہ ہوٹل، بڑا بورڈ، پاک کالونی ہر جگہ سے خلقت چلی آئی، اتنا بڑا جنازہ اٹھا کہ لوگوں نے اسے شاہ فیصل کے بعد دوسرا بڑا جنازہ قرار دے دیا، رستم سہراب، منا، ناصر، اعجاز اور منی عابدہ روئے تو بہت دھاڑیں مار مار کر مگر انھوں نے ہر جنازہ دار کو بوٹیوں بھری پلاؤ کھلا کر ہی بھیجا۔

☆......☆

ملا حیدر مر گئے۔ بیٹھکیں، چوپالیں، چبوترے آہستہ آہستہ پھیکے پڑنے لگے۔ لوگوں کا موضوع اب بھی ملا حیدر کا پراسرار کاروبار ہی تھا، لوگوں کو توقع تھی کہ جلد ہی ملا حیدر کے ناجائز کاروبار کا بھانڈا پھوٹ جائے گا، مگر جب تک ہم اس محلے میں رہے تب تک تو یہ راز نہ کھلا تھا۔ پھر ہمارے باوا نے ہمارے دادا کی کھوئی ہوئی جاہ حشمت جو انھوں نے ہجرت کے غلط فیصلے کی وجہ سے برباد کر دی تھی کے کچھ بقدر کما لیا تو ہم وہاں سے نکل آئے۔

برسوں گزر گئے۔ کم سے کم بائیس تئیس برس تو گزر ہی گئے۔ پچھلے دنوں بچپن کا ایک دوست، محلے دار لنگوٹیا مل گیا۔ اس نے بتایا کہ محلّہ تو تب ہی سے اجڑ گیا، سب ہی وہاں سے پکے علاقوں میں آباد ہو گئے، لیکن اب تک ملا حیدر کی پراسرار ناجائز آمدنی کا سراغ نہیں مل سکا۔ اور وہاں موجود بچے کھچے محلے دار ابھی تک ملا حیدر کی ناجائز آمدنی سے کھائی ہوئی پلاؤ کو یاد کر کے توبہ توبہ کرتے پھرتے ہیں۔

......☆☆......

دریچے

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے ہم نے مختلف بستی والوں میں سے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ سب بھی انسان ہی تھے اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، ورنہ دیکھ لیتے ان قوموں کا کیسا (بُرا) انجام ہوا جوان سے پہلے گزر چکی ہیں۔ بے شک آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر ہے جنہوں نے (پیغمبروں کی بات مان کر) تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے۔
(سورہ یوسف: 109)

شعبان سے رمضان تک

''شعبان المعظم'' اسلامی سال کا آٹھواں قمری مہینہ ہے۔ یہ رحمت، مغفرت اور جہنم سے نجات کے بابرکت مہینے ''رمضان المبارک'' کا دیباچہ، سن ہجری کا اہم مرحلہ اور نہایت عظمت اور فضیلت کا حامل ہے۔ خاتم الانبیاء سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''شعبان شھری'' (دیلمی) شعبان میرا مہینہ ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ماہِ رجب کے آغاز پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے تھے۔

اللھم بارک لنا فی رجب وشعبان وبلغنا رمضان۔
(ابن عساکر) ''اے اللہ! رجب اور شعبان کے مہینے میں ہمارے لیے برکت پیدا فرما اور (خیر و عافیت کے ساتھ) ہمیں رمضان تک پہنچا۔''
(بحوالہ: ڈاکٹر انیس فریحہ / اسماء الاشہر فی العربیۃ و معانیھا ص 70)

خوشنودی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: ''اے مالک! جب تُو خوش ہوتا ہے تو کیا کام کرتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جب میں خوش ہوتا ہوں تو بارش برساتا ہوں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ عرض کیا۔
''جب تو اور زیادہ خوش ہوتا ہے تو......؟''

فرمایا: ''تو میں بیٹیاں پیدا کرتا ہوں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر عرض کیا:
''اے مالک دو جہاں! تو جب سب سے زیادہ خوش ہو تو کیا کرتا ہے؟''

فرمایا: ''پھر میں مہمان بھیجتا ہوں۔''
(مرسلہ: روبی علی۔ جہلم)

کام سے پہلے انجام

حکایت ہے کہ ایک ہرن ایک دفعہ پیاسا ہوا تو

پانی کے ایک چشمے کے پاس آیا تاکہ اس چشمے سے پانی پیے، پانی گہرائی میں تھا۔ وہ ہرن اس چشمے میں اُتر گیا اور خوب پانی پیا۔ پھر جب اس نے چشمے سے نکلنے کا ارادہ کیا تو نکلنے پر قادر نہ ہو سکا۔ اس کو ایک لومڑی نے دیکھا تو کہا اے میرے بھائی! تُو نے اپنے کام میں غلطی کی ہے کیونکہ تم نے چشمے میں اُترنے سے پہلے ہی اپنے نکلنے کو نہیں سوچا۔ انسان کو چاہیے کہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس کا انجام سوچ لے۔
(مفید الطالبین الباب الثانی فی الحکایات صفحہ 22)

دعویٰ

ایک کنیز آدھی رات کو کھڑی دعا کر رہی تھی۔
''اے اللہ! اس محبت کے صدقے جو تجھ کو مجھ سے ہے۔ میری دعا قبول کرلے اور میرے گناہ معاف کردے۔''

مالک کی آنکھ کھل گئی۔ کہنے لگا۔ ''تو کیسے یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ اللہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''اگر اللہ مجھ سے محبت نہ کرتا تو مجھے رات کو نماز پڑھنے کی توفیق نہ دیتا اور میں بھی تیری طرح سو رہی ہوتی۔''
مرسلہ: راشدہ اعجاز۔ کراچی

اُمید

دھوپ کی دھول کو جب
جھاڑ کر مزدور پرندے
آشیانوں کی طرف لوٹ کے آجاتے ہیں
اور پلکوں کی طرح شام اُترتی ہے زمیں پر
رات آتی ہے
بجھا دیتی ہے سب رنگوں کے چہرے
اپنے دروازے پر اک لو لگا دیتا ہوں بیٹا
تم اگر آؤ، تو یہ دروازہ نہ بھولو

شاعر: گلزار

محبت اور جنگ

دو محبت کرنے والوں کے درمیان معمولی نوعیت کی نوک جھونک بھی ہو جاتی ہے لیکن اک ذرا سی بات پر عمر بھر کی محبت کو بھلا دینا دانشمندی نہیں۔ غیروں کی باتوں میں آکر اپنوں کو خون نہیں رلایا جاتا۔

وہ وعدے، جو ساتھ جینے، ساتھ مرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ نبھانے چاہئیں۔ ایک پل کی لڑائی میں ساری عمر کے رشتے نہیں توڑنے چاہئیں۔ ایک دوسرے کی ساری خطائیں معاف کردینی چاہئیں۔ آپس میں پیار کبھی نہیں بھولنا چاہیے کیونکہ یہ محبت کے جھگڑے تو آپس میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔
مرسلہ: فلک خان۔ کراچی

ملک ملک کی کہاوتیں

☆ احسان مندی کا مخلصانہ اظہار دل جیت لیتا ہے۔ (فرانسیسی کہاوت)

☆ ہر قابل شخص کے پیچھے کئی قابل اشخاص ہوتے ہیں۔ (چینی کہاوت)

☆ نیند آدھی غذا کا کام کرتی ہے۔ (سوڈانی کہاوت)

☆ بارش ٹوٹی جھونپڑی پر زیادہ برستی ہے۔ (جاپانی کہاوت)

☆ جس کے پاس محبت ہے، اس کی امیدیں زندہ ہیں اور جس کی امیدیں زندہ ہیں، اس کے پاس سب کچھ ہے۔ (عربی کہاوت)

☆ سفید بال عمر کی نشاندہی کرتے ہیں، عقل کی نہیں۔ (یونانی کہاوت)

☆ انسان بننے کے لیے انسانوں والے کپڑے پہننا بھی ضروری ہے۔ (لاطینی کہاوت)
مرسلہ: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

عورت

عورت کی وفا اس کے خلوص میں، حیا اس کی نگاہوں میں، ادا اس کے بھول پن میں، حسن اس کی سادگی میں اور عظمت اس کے کردار میں ہے۔

عورت کا غصہ اس کی زبان میں، قابلیت اس کی سیرت میں، چاہت اس کے انداز میں، صبر اس کی خاموشی میں اور معراج اس کی ممتا میں ہے۔

مرسلہ: راحیلہ ذاکر۔ چتوکی

ایک سے بڑھ کر ایک

دو مصور اپنے فن کی تعریف کر رہے تھے اور دونوں خود کو ایک دوسرے سے زیادہ ماہر ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

ایک مصور بولا۔ ''میں نے انگور کا ایک گچھا بنایا، جو اس قدر اصلی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بلبل آ کر اسے چونچ مارنے لگی۔''

دوسرے مصور نے کہا: ''وہ بلبل میں نے ہی بنائی تھی جو اُڑ کر اس گچھے تک پہنچ گئی تھی۔''

مرسلہ: عمرانہ وفا۔ اٹک

حد سے تجاوز

لاہور میں ملک برکت علی ایڈووکیٹ کی طرف سے ایک ٹی پارٹی دی گئی، جس میں قائداعظمؒ کے سامنے وہ کیک رکھا گیا، جو ہندوستان کے نقشے کے مطابق بنایا گیا تھا اور اس میں پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں کا رنگ سبز تھا۔ جب بابائے قوم نے کیک کاٹا تو بڑی احتیاط سے سبز حصہ الگ کر دیا۔

کسی نے کہا: ''جناب! ذرا سا اور کاٹ لیجیے۔''

جواب ملا: ''میں تجاوز پسند نہیں کرتا۔ نہ کسی کا حق غصب کرو، نہ اپنا حق چھوڑو۔''

مرسلہ: مینا وزیر۔ گھوٹکی

انکشاف

نہ وعدہ ہے کوئی تم سے، کوئی رشتہ نبھانے کا
نہ کوئی اور ہی دل میں، تہیہ یا ارادہ ہے!
کئی دن سے مگر دل میں
عجب الجھن سی رہتی ہے!
نہ تم اس داستاں کے سرسری کردار ہو کوئی
نہ قصہ اتنا سادہ ہے!
تعلق جو میں سمجھا تھا، کہیں اس سے زیادہ ہے

شاعر: امجد اسلام امجد

پام جمیرہ

پام جمیرہ، دبئی کے ساحل کے قریب مصنوعی جزیرہ ہے۔ یہ دبئی کے ساحل کے قریب پائے جانے والے تین مصنوعی جزیروں میں سب سے پہلا اور سب سے چھوٹا ہے۔ اب یہ جزیرہ متحدہ عرب امارات کی شناخت بنتا جا رہا ہے، جسے انسان نے کئی برسوں کی محنت سے تیار کیا ہے۔ یہ کھجور کے درخت کی شکل کا ہے اور خلا میں موجود بین الاقوامی مصنوعی سیارے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس پر موجود ہر گھر ساحل سمندر پر ہے۔ ساتھ ہی پام جمیرہ پر کئی لگژری ہوٹلز، میگا ریزورٹس بھی واقع ہیں۔ اس جزیرے کی بنیاد 2001ء میں رکھی گئی تھی اور اس کے کناروں کی لمبائی دبئی کے ساحل کی لمبائی سے دُگنی ہے۔

مراد خان۔ کراچی

آنسو

آنسو مسکراہٹ سے زیادہ خاص ہوتے ہیں، پتا ہے کیوں؟ کیونکہ مسکراہٹ تو سب کے لیے ہوتی ہے مگر آنسو صرف ان کے لیے ہوتے ہیں جنہیں ہم کھونا نہیں چاہتے۔

مرسلہ: طاہر معین۔ صادق آباد

دھیان نہ دو

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں میں غور و فکر نہیں کرنا چاہیے۔

غربت و تنگدستی...... اس میں غور و فکر کرنے سے غم، تشویش، حرص اور پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

خود پر دوسروں کی زیادتی...... اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو اس کی جانب مطلق دھیان نہ دو، ورنہ تمہارا دل سخت اور کینہ پرور ہو جائے گا اور اس سے بالکل فائدہ نہ ہوگا۔

طویل عمری...... دنیا میں زیادہ دن رہنے کی خواہش ہرگز نہ کرو ورنہ مال جمع کرنے کی آرزو پیدا ہوگی۔ عمر برباد ہوگی اور تم عمل خیر میں ٹال مٹول کرنے لگو گے۔

مرسلہ: کرن شہزادی۔ راولپنڈی

اینگری کلچر

ہمارے ہاں وہ کلچر، جس پر سب اگیری کرتے ہیں۔ اگیری کلچر ہی ہے اس کے علاوہ سب اینگری کلچر ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کالج اس لیے بنائے گئے ہیں کہ طلبہ کو جہالت کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرنا پڑے، ایسے ہی اینگری کلچر کی نمائش کے لیے فلمیں بنائی جاتی ہیں۔

ہمارے ہاں فلموں میں ہیرو سے لے کر اس کا گھوڑا تک غصے میں ہوتا ہے۔ ہر کردار کو غصہ ہی آتا ہے۔ یہاں تک کہ فلم دیکھنے کے بعد بندے کو بھی یہی آتا ہے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی تصنیف ''قلابازیاں'' سے اقتباس

مرسلہ: زمر انعام۔ لالہ موسیٰ

یک نہ شُد......!

نوجوان نے اپنا سفری بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے بے پناہ جذباتی لہجے میں باپ سے کہا: ''میں زندگی اپنی مرضی کے مطابق، مہم جوئی کے انداز میں گزارنا چاہتا ہوں لہٰذا عیش و عشرت کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ ایک اچھی جاب اور خوب صورت بیوی کی تلاش میں جا رہا ہوں...... مجھے روکنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔''

''کون کم بخت تمہیں روکنے کی کوشش کر رہا ہے......؟'' باپ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں تو خود تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔''

مرسلہ: زرقا۔ منڈی بہاؤالدین

ڈاکٹر محبوب الحق

22 فروری 1934ء کو ریاست جموں میں پیدا ہوئے تھے۔ لاہور گورنمنٹ کالج سے گریجویشن کے بعد انہوں نے کنگز کالج، لندن سے معاشیات میں ڈگری لی اور پھر اسی مضمون میں امریکا کی ایل یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ 1972ء سے 1982ء تک وہ عالمی بینک میں پالیسی پلاننگ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ضیاء الحق دور میں 1982ء سے 1988ء تک پاکستان کے وزیر خزانہ کے عہدے پر فائز رہے۔ 1985ء میں انہیں اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے ایڈمنسٹریٹر کا خصوصی مشیر مقرر کیا گیا، جہاں انہوں نے پہلی انسانی ترقیاتی رپورٹ کی تیاری کے لیے بین الاقوامی اسکالرز پر مشتمل ایک ٹیم کی قیادت کی۔ 1996ء میں ڈاکٹر محبوب الحق نے اسلام آباد میں ہیومن ڈیولپمنٹ سینٹر قائم کیا۔ انہوں نے اپنی باقی ماندہ زندگی جنوبی ایشیا کے مختلف ملکوں کے درمیان سماجی اور اقتصادی شعبوں میں ترقی و تعاون کے لیے وقف کر دی۔ ڈاکٹر محبوب الحق 16 جولائی 1998ء کو نیویارک میں انتقال کر گئے۔

مرسلہ: شاہین خان۔ پشاور

......☆☆......

نئے لہجے نئی آوازیں

داسی کی عید

میرے دل میں بنا کے پیار کا مندر
میرے دیوتا.....!!
کہاں کھو گئے ہو
دیکھو.....سال گزرا
پھر سے آ گئی چاند رات
آج بھی میری سُونی ہتھیلی
مہندی تیرے نام کی چاہے
آج بھی میری سُونی کلائی
چُوڑی تیرے نام کی چاہے
میرا بننا، سنورنا.....سب کچھ بجنا
بس اِک تیرا دیدار چاہے
عید کے دن تم آ جاؤ
اور
اپنی داسی کی عید کرا جاؤ

شازلی سعید مغل۔ کراچی

یہ التجا ہے رب سے.....

یہ دعا ہے، یہ التجا ہے میری رب سے
تجھے وہ کچھ ملے جو انوکھا ہو، اچھا ہو سب سے
تیرے پلک جھپکنے سے پہلے تجھے وہ مل جائے
جو خواہش ، جو دعا نکلے تیرے لب سے
مانا کہ مجبوری ہے، سانس لیتا ہوں مگر یقین کر
چین پایا نہیں اک پل بھی بچھڑا ہے تو جب سے
وہ راہِ الفت جہاں سے تُو گزرا تھا اک دن
تکتا رہتا ہوں اُس راہ کو روز روز تب سے
گر بس میں ہو اتنی راحت لکھ دوں تیرے مقدر میں
کبھی بے بسی سے سرد آہ نہ نکلے تیرے قلب سے
جب گماں ہوا قبولیت کی گھڑی کا، ہاتھ اٹھا دیے دو صفی
تجھے چاہتے ہیں، ہم تو بڑھ کر ہر اک طلب سے

احمد دو صفی۔ کوئٹہ

عید اور دُکھ

عید آ گئی
مہندی والے ہاتھ
جن پہ میرا نام لکھا جانا تھا
کہیں کھو گئے ہیں
دل بہت اداس ہے
عید کا چاند
اور!! تیرا چہرہ
ساتھ ساتھ میں دیکھتا تھا
سجنی!! تُو کہاں کھو گئی ہے
یا تُو کسی اور کی ہو گئی ہے
تیرا ساجن
شہرِ دل کے لُٹ جانے پر
روزِ عید بھی
تجھے ہی ڈھونڈ رہا ہے

شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

خاموش گفتگو

آؤ!
خاموش گفتگو کریں
سہانی ڈھلتی شام ہو
ہلکی ہلکی رم جھم ہو
تمہارا ساتھ ہو
دور تک جاتی شاہراہ پر
ہاتھوں میں ہاتھ تھامے
آنکھوں ہی آنکھوں میں
پیار کی باتیں ہوں
یونہی بس
چلتے چلے جا رہے ہوں
پیار کے انوکھے احساس میں
سمتوں کا نہ کوئی تعین ہو
میں ہوں، تم ہو
نہ کوئی اور بات ہو
خاموش گفتگو ہو!

فرحت جمال۔ کراچی

من موہنے خواب

سنو سہیلی!
ان سے بچ کے رہو کہ
یہ کچی عمر کے خواب بڑے ظالم ہوتے ہیں
کبھی ہنساتے ہیں، کبھی رلاتے ہیں
رنگین نظاروں سے بھرپور ہوتے ہیں
کچھ سمٹے سمٹے سے، کچھ بکھرے بکھرے سے
بڑے سہانے ہوتے ہیں
بالکل برسات کے موسم کی طرح
مگر جب ٹوٹتے ہیں
تو اپنی میٹھی تلوار سے
بڑا گہرا زخم لگاتے ہیں

سویرا فلک۔ کراچی

غزل

حسن گلیوں میں عقیدت کی چلا آتا ہے
دیپ ہاتھوں پہ گلابوں کے رکھا آتا ہے
وہ شفق پر رکھے سورج ہیں کہ آنکھیں ہیں تری
دھوپ آتی ہے تو نقشہ سا کھنچا آتا ہے
تیری نظروں کو ترستے ہیں مرے منظر بھی
اشک بہتا ہے تو حسرت سے بھرا آتا ہے
خلوتیں تیرے تصور سے یوں روپہلی ہیں
پھول کی پتیوں پر سبزہ اُگا آتا ہے
صنعتِ درد کسی لحظ مگر ماند نہ ہو!
دلِ خلوت زدہ، الفت کو لکھا آتا ہے
رفعتِ نازِ در حسن کی پابندی اشک
مشرقِ الفتِ ہجراں کو بھی کیا آتا ہے؟

احمد علی کیف۔ بہاولنگر

کھویا ہوا چاند!!

چاند رات میں
چاند اور بادل
آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں
بالکل ایسے ہی
جیسے تُو.....
چاند رات کو مجھے کہیں نظر نہیں آتی
چاند تو آخر دکھ جاتا ہے
لیکن تیری تلاش میں
مجھے!!!
ہمیشہ کی طرح
خود ہی ہارنا پڑتا ہے

فلک خان۔ کراچی

یہ ہوئی نا بات

سوال آپ کے..... جواب زین العابدین کے!

اس ماہ روبینہ شاہین، کراچی کا سوال انعام کا حقدار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر 'دوشیزہ گفٹ ہیمپر' روانہ کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

مراد خان.....کراچی

☆ اگر کسی دن سورج طلوع نہ ہوتو کیا ہوگا؟

اگلے ایک ہفتے تک کی بریکنگ نیوز یہی چلے گی۔

ذین ظہور.....چھانگا مانگا

☆ ملک الموت اور ڈاکٹر میں کیا فرق ہے؟

سوچنا پڑے گا۔

خالدہ بانو.....پتوکی

☆ اگر موبائل ایجاد نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

موبائل سے پہلے کیا تھا.....؟؟

روبینہ شاہین.....کراچی

☆ سیاستدان اور سائنس دان میں کیا فرق ہے؟

دونوں ہی کچھ تباہ کرنے کا سوچتے ہیں۔

فصاحت خانم.....گھوٹکی

☆ کیا آپ نے کبھی چاند کی سیر کی ہے؟

آج کل ہم چاند ہی پر رہ رہے ہیں۔ نہ پانی ہے، نہ گیس اور نہ ہی بجلی ہاہاہا۔

ایم سعید انور سعید.....لاہور

☆ پریوں کا دیس کہاں ہے؟

کیبل والے سے پوچھنا پڑے گا۔

کرن شہزادی.....راولپنڈی

☆ لڑکیاں لمبے ناخن کیوں رکھتی ہیں؟

چڑیلوں کا یہی ہتھیار ہے۔

زلیخا کمال.....جھنگ

☆ میک اپ نہ ہوتا تو عورت کیا ہوتی؟

خبردار.....مضرِ صحت سوالات سے پرہیز کیا جائے۔

مسرت شاہ.....میلسی

☆ بیوی اور گھر والی میں کیا فرق ہے؟

ایسے سوال پوچھ کر اماں سے مار پڑواتی ہے کیا۔

شہرین بتول.....سکھر

☆ ٹیلر (درزی) ہمیشہ عید کے کپڑوں میں ہی گڑبڑ کیوں کرتا ہے؟

اگر درزی گڑبڑ نہ کرتے تو دیپک پروانی اور ٹیپو وغیرہ کیسے منظرِ عام پر آتے۔

شامین اختر.....بھورہن

☆ بزرگ اور بچے آئس کریم کیوں پسند کرتے

ہیں؟

Colgate کی وجہ سے۔

کمال شاہد.....کالا گوجراں

☆ آج کل ہر کوئی اپنی تصویر خود کیوں کھینچتا ہے؟

آپ کے غم کا علاج میرے پاس نہیں۔

صاعقہ انعم.....کوٹ لکھپت

☆ B.A کا مطلب؟

بیچلر ان بے شرم عوام۔

عرشیہ یوسف.....ڈسکہ

☆ انار کی.....کے کہتے ہیں؟

نامکمل جملہ۔ پورا جملہ بھیجا کریں۔ جیسے انار کی چاٹ.....انار کی کلی وغیرہ وغیرہ۔

فراز علی.....دادو

☆ لڑکیاں کیا چیز شوق سے بناتی ہیں؟

بے وقوف۔

سلمان عمرانی.....سجاول

☆ عید پر آپ کیا پہنیں گے؟

نئی ٹوپی۔

شہزاد بہادر.....صادق آباد

☆ نوکری زیادہ ضروری ہے یا چھوکری؟

بھائی! اب تو چھوکری ہی نوکری لاتی ہے۔

زاہد بشیر.....چھم جوڑیاں

☆ Maximum کا ک ٹیل سے کیا مراد ہے؟

دو بڑی Flops آف 2012ء۔

ثانیہ بلوچ.....لیاری

☆ چاند رات کو سب سے اہم چیز کیا ہوتی ہے؟

صرف چاند.....اور کیا!!

آیان فخر.....کوٹ ڈیجی خان

☆ برداشت کی حد کہاں ختم ہوتی ہے؟

نیوٹن کو پڑھنا پڑے گا اب۔

ناہید عظمیٰ .... بھولاری

☆ سر منڈاتے ہی اولے کیوں پڑتے ہیں؟

کبھی کبھی پوری برف کی سِل بھی پڑ جاتی ہے سر پر۔

فاطمہ کلثوم .... دھابے جی

☆ اگر چاند رات کو بارش ہو جائے تو......؟

عید پھر بھی اگلے دن ہی ہو گی۔

فریدہ بیگم .... سمن آباد

☆ آج کل لوگوں پر کون سا رنگ زیادہ حاوی ہے؟

عید کا رنگ۔

زرمینہ علی .... والٹن

☆ شہلا کہتی ہے کہ محبت خود بخود ہو جاتی ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

یہ شہلا کہتی ہے......ہم نہیں!!

مانیا فہیم .... خانیوال

☆ رات کو مجھے ڈر کیوں لگتا ہے؟

رات کو آیۃ الکرسی پڑھ کر سو جایا کرو بی بی۔ ڈر کو آپ سے ڈر لگنے لگے گا۔

رانی بلوچ .... کراچی

☆ ریشم کے کپڑے، آج کل لڑکیاں کیوں نہیں پہنتیں بھیا؟

''ریشم'' کے کپڑے اس لائق تھے کہ لڑکیاں پہن سکیں۔

حیات بونیری .... پشاور

☆ وینا ملک کی اگلی انڈین فلم کون سی ہو گی؟

اگلے فوٹو سیشن سے پتا چلے گا۔

وقاص شہزاد .... ملتان

☆ زین بھائی! یہ لوریا کیا ہوتا ہے؟

Love والی ہر چیز سے فی الحال دور ہی رہو مُنّے میاں۔

صبور خان .... اسلام آباد

☆ سنگ دلی کی انتہا کیا ہے بھیا؟

وینا ملک کی ''دال میں کچھ کالا'' کا ہمارے سینماؤں پر نہ چلنا بیٹا جی۔

علی حاکم .... گوجرانوالہ

☆ زمانے کے دیکھے ہیں رنگ ہزار......

علی بھائی ذرا سوچ کر بولیں سر راہ عمر کا ذکر۔

فریحہ نسیم .... مرید کے

☆ آپ کو کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟

نشہ!!! میں شریف آدمی ہوں بہن جی!

......☆☆......

یہ تو ہی نہ بات کے لیے میرا سوال یہ ہے

کوپن برائے ستمبر 2012ء

____

____

نام: ____________________

پتا: ____________________

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟؟؟

مختار بانو طاہرہ

اگر آپ کی تاریخ پیدائش 24 جولائی تا 23 اگست ہے تو آپ کا برج اسد (LEO) ہے۔ اس برج کا نشان: شیر، عنصر: آگ، حاکم سیارہ: سورج، خوش بختی کے عدد: 1,4,11، موافق رنگ: دھانی، نارنجی، سنہرا، سعد پتھر: ہیرا، لعل ہے۔

اسد افراد کی خوبیاں اور خامیاں

برج اسد سے تعلق رکھنے والوں کو وہ لمحہ ہمیشہ گراں گزرتا ہے، جب ان پر شبہ کیا جائے یا ان کی بات پر یقین نہ کیا جائے۔ سب سے زیادہ تاؤ انہیں اس وقت آتا ہے جب دوسرے ان کی رائے یا نظریے کو یکسر غلط سمجھیں۔ اسد لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی رائے غلط بھی ہوسکتی ہے مگر اس قسم کا چیلنج انہیں ہمیشہ اپنے دام میں لے لیتا ہے۔ وہ اپنی رائے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ان کا غصہ بہت مختصر المیعاد ہوتا ہے اور وہ کچھ دیر بعد اپنی خامی یا غلطی کو محسوس کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ معذرت طلب کر لیتے ہیں، اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں اور فریق مخالف عموماً ان کی قدر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اسد لوگ عموماً اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ بے پناہ عیار ہیں اور دنیا بھر کے سازشیوں اور منصوبہ سازوں کو شکست دے سکتے ہیں۔ یہ محض گمان ہوتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو کبھی شکست نہیں دے سکتے، کیونکہ وہ خود ایک کھلی کتاب کی طرح ہوتے ہیں۔ باکردار اور سیدھے سادے۔ ان کی فطرت میں بدخواہی، سازش اور عیاری کا عنصر شامل نہیں ہوتا۔ وہ پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے بجائے دوبدو مقابلہ پسند کرتے ہیں۔ اپنے حریف کو برابر کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ بے عزتی کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

جذبات: اسد افراد کی سب سے بڑی خامی اور سب سے بڑی خوبی ہیں۔ وہ ناانصافی ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ دھاندلی برداشت نہیں کر سکتے۔ انسان کا وقار ان کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

مصالحت وہ اس وقت کرتے ہیں جب جنگ کا پانسہ ان کے حق میں پلٹ چکا ہو اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ مغلوب و شکست خوردہ حریف کو وہ سب کچھ بخش دیتے ہیں، جو انہیں جنگ جیتنے کی صورت میں مل سکتا تھا۔ یہ اسد لوگوں کا خاص انداز ہے۔

انسانوں اور ان کے کرداروں کے بارے میں اسد لوگوں کے اندازے بالعموم خاصے غلط ثابت

ہوتے ہیں۔ ان کی تعریف میں چند جملے ادا کر کے ان کا دل جیتا جا سکتا ہے۔ خوشامد کے چند الفاظ ان کا رویہ تبدیل کر سکتے ہیں۔ بے جا تعریف کو بھی وہ پوری خوش دلی سے قبول کر لیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ان ساری باتوں پر یقین بھی کر لیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ایسی کوششوں کو بے ضرر سمجھ کر درگزر کر دیتے ہیں۔ ان کا مزاج شاہانہ ہوتا ہے اور شہنشاہ کو خوش کرنے کی کوششیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔

دوست بنانا ان کے لیے کبھی مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ لوگ ان کی طرف خود مائل ہوتے ہیں۔ برج اسد سے تعلق رکھنے والوں کا مقبول نہ ہونا، ناقابل یقین سی بات لگتی ہے۔ وہ پُرخلوص اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ لوگ ان کے اعتماد اور حاکمانہ انداز سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس انداز کو پسند کرتے ہیں۔ انہیں دوستی نبھانا بھی آتا ہے۔ اس شعبے میں وہ سادہ مزاج اور کھرے ہوتے ہیں۔

اسد خواتین

اسد خواتین کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں۔

1۔ وہ بے حد حساس ہوتی ہیں۔ بچپن سے ہی وہ اپنی ذات کو بہترین سمجھنے لگتی ہیں۔

2۔ انتہائی رومانی مزاج کی مالک ہوتی ہیں اور ایڈونچرز میں انتہائی دلچسپی رکھتی ہیں۔

3۔ وہ ہر طرح سے دوسروں پر حاوی رہنا چاہتی ہیں۔ دوسروں کے دل و دماغ پر حکمرانی کرنے کی زبردست خواہش ان میں پائی جاتی ہے۔

4۔ آئیڈیل شریک حیات کی تلاش میں وہ بعض اوقات سماجی حدود کو توڑنے سے بھی نہیں ہچکچاتیں۔

5۔ وہ زبردست تخلیقی قوتوں کی مالک ہوتی ہیں، چنانچہ ان کے اظہار کے لیے بے چین رہتی ہیں۔

6۔ ان میں حس مزاح بھی خوب ہوتی ہے۔

7۔ انٹرٹینمنٹ اور اداکاری کے شعبے میں ان کی دلچسپی بہت زیادہ ہوتی ہیں۔

اسد خواتین کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ "اپنے منہ میاں مٹھو" بنی رہتی ہیں۔ حسن، سیرت، تعلیم، فیشن، عادات و اطوار..... غرض ہر میدان میں خود کو سب سے بہتر سمجھتی ہیں۔ اپنے سامنے وہ کسی اور کی تعریف کبھی پسند نہیں کرتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسد عورت اپنے اس انداز فکر کی بدولت اپنے بہت سے دوستوں اور محبت کرنے والوں سے کٹ کر رہ جاتی ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ دوسروں کی اچھائیوں اور خوب صورتی کو بھی تسلیم کرے۔ اپنے آپ کو اتنا بلند ہرگز نہ کرے کہ بعد میں دھڑام سے زمین پر آ گرے۔ وہ دنیا کی ہر اچھی اور خوب صورت چیز کو اپنی ملکیت نہ سمجھے۔ اسد عورت کی خود پسندی کی یہ عادت اس کی مجموعی زندگی کے لیے کسی بھی طرح بہتر ثابت نہیں ہوسکتی۔

ماہرین علم نجوم کے مطابق اسد عورت کی سب سے بڑی مشکل یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے تو بڑی بڑی امیدیں اور توقعات وابستہ کر لیتی ہے مگر خود دوسروں کو کچھ نہیں دیتی۔ کبھی بھی دوسروں کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش نہیں کرتی۔ وہ اپنے ساتھی یا رفیق حیات کے رویے کے بارے میں آئیڈیل قسم کے خیالات رکھتی ہے۔

اسد عورت بلاشبہ نسوانیت کا ایک خوب صورت نمونہ ہوتی ہے۔ اس کے اندر رومانس اور محبت کے جذبات بھرے ہوتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ اپنی جھوٹی انا سے چھٹکارا پائے اور یہ سمجھنا چھوڑ دے کہ وہ دنیا کی سب سے خوب صورت اور نادر شے ہے، تب ہی وہ جذباتی، ذہنی اور روحانی

پریشانیوں سے نجات پاکر مطمئن زندگی بسر کرسکتی ہے۔

تمام ایسے برج جن کا بنیادی عنصر آگ ہے۔ اپنے اندر تندی و تیزی کی خاصیت رکھتے ہیں۔ ایسے برجوں کے حامل افراد بے حد جذباتی ہوتے ہیں۔ برج اسد کا بنیادی عنصر بھی آگ ہے لیکن اس برج سے تعلق رکھنے والے لوگ جذباتی تو ہوتے ہیں، تاہم اس سے بھی زیادہ ان میں محبت کی گرمی ہوتی ہے۔ محبت میں پیش آنے والے نشیب و فراز سے اسد خواتین بہت کچھ سیکھتی ہیں اور اپنی زندگی کو محبت کے مضبوط دھاگے کی لڑی میں پروئے رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔

اسد عورت کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی خواہش کا اظہار زور و شور سے نہیں کر سکتی، خصوصاً اپنے شریک حیات یا اپنے دوست سے وہ اپنی ضرورتوں کی بابت بات کرتے ہوئے ہچکچاتی ہے۔ براہِ راست اپنی کسی خواہش کا اظہار کرنا اس کے لیے انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ دراصل وہ چاہتی ہے کہ اس کا دوست یا شریک سفر خود اس کی ضروریات کا انداز کرے، اسے اس کی پسند یا ناپسندیدگی کا علم ہونا چاہیے۔ وہ اپنی خواہش کا اظہار کرنا یا اپنی ضرورت بیان کرنا توہینِ ذات سمجھتی ہے۔

اسد خواتین اور فضول خرچی

برج اسد سے تعلق رکھنے والے یوں تو سب ہی لوگ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں لیکن اسد خواتین میں قدرتی طور پر یہ صلاحیتیں کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان کی جانب سے ایسی کوئی کوشش نہیں ہوتی جس سے یہ پتا چل سکے کہ انہیں رہنمائی اور قیادت کرنے کی خواہش ہے۔ اسد خواتین نہایت خاموشی سے مصروفِ عمل رہتی ہیں۔ ان کا انداز ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ بے ساختہ ان کے مداح بنتے چلے جاتے ہیں اور ان کی پیروی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اسد عورت روپے پیسے کے معاملے میں بہت لاپروا ہوتی ہے۔ اس کی فضول خرچی کی عادت سے قریبی لوگ اکثر پریشان رہتے ہیں۔ وہ پیسہ یوں خرچ کرتی ہے جیسے یہ کوئی معمولی چیز ہو، جو محنت مشقت سے نہ کمائی جاتی ہو بلکہ درختوں سے جھڑتی ہو۔

اسد خواتین کے لیے ماہرین علم نجوم کا مشورہ ہے کہ وہ کبھی کسی کنجوس شخص سے شادی نہ کریں۔ ایسا مرد جو آپ کی چھوٹی چھوٹی لاپروائیوں کو نظر انداز کردے، اپنی چیک بک کو بغیر کسی حیل و حجت کے آپ کے حوالے کردے اور گھر کی صفائی وغیرہ میں ذاتی دلچسپی رکھتا ہو، وہی آپ کے لیے آئیڈیل ساتھی یا شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے آپ اپنے برج سے مناسبت رکھنے والے مرد کا انتخاب کیجیے۔

اسد عورت کی اپنے حلقہ احباب میں مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خواہ کسی عمر کی ہو، اپنے اندر چھپے ہوئے شرارتی بچپن کو زندہ رکھتی ہے یعنی وہ اپنے بچپن کی عادتوں کو ہمیشہ قائم رکھتی ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی جب وہ اپنے محبوب لوگوں کے درمیان ہوتی ہے تو بالکل بچوں کا سا انداز و لہجہ اپنا کر اپنی باتیں منواتی ہے۔ شرارت اس کے سراپے سے پھوٹنے لگتی ہے اور وہ ایک شریر بچے کی طرح سب کی توجہ حاصل کرلیتی ہے۔ دراصل اسد عورت روحانی اعتبار سے ہمیشہ بچہ ہی رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں روحانیت نہیں رہتی بلکہ اسے یوں سمجھیے کہ اس کی روح ایک معصوم اور پاک

بچے کی طرح ہوتی ہے۔ وہ روحانی اعتبار سے انتہائی پوتر اور پاک ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ گھر میں اور گھر سے باہر..... جہاں کہیں بچوں کو دیکھتی ہے، کشاں کشاں ان کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے اور پل بھر میں ان میں گھل مل کر کھیلنے لگتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ ہر قسم کے پروٹوکول کو فراموش کردیتی ہے۔ اس کی رفاقت میں خواہ کتنے ہی معزز و محترم لوگ کیوں نہ ہوں، وہ کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر بے قابو ہو جاتی ہے اور پلک جھپکنے میں اپنے جوتے اتار کر ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی ان میں شامل ہو جاتی ہے۔ اسد خواتین میں اپنے بچپن کو سلامت رکھنے کی صلاحیت کو ایک صحت مند قوت اور مثبت خصوصیت کہا جاسکتا ہے۔

اسد افراد کی لاشعوری جبلتیں

''تخلیق'' اور ''اقتدار'' اسد افراد کی شدید ترین خواہشات ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کے بیشتر مقاصد اور افعال اسی لاشعوری جبلت کے باعث ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ حکمرانی کرنے کے جذبے کے پس پشت سماجی مقبولیت حاصل کرنے کی قوت محرکہ بھی کارفرما ہوتی ہے کیونکہ اسد افراد زندگی کے اسٹیج پر رونما ہونے والے تمام مناظر پر حاوی آنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یعنی وہ حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ افراد مختلف انداز سے مختلف طور طریقے اپناتے ہیں۔ مثلاً کبھی تو دوستی، محبت اور لگاوٹ کا جال پھیلا کر مقبولیت عام اور شہرت دوام کی مسند پر بیٹھنا چاہتے ہیں تو کبھی یہ لوگ اپنی گمبھیر شخصیت اور اپنی ذات کے اظہار کے ذریعے مقبولیت پاتے ہیں۔ ہر چند کہ اسد افراد زندگی کے ہر مرحلے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر اس سنگت میں بھی ان کا مقام قطعاً نمایاں ہوتا ہے۔

عام طور پر مثبت اسد افراد کے اردگرد رہنے والے لوگ اگر ان کی خواہشات کے مطابق عمل پیرا ہوں تو خوش و خرم زندگی گزار سکتے ہیں۔ اسد افراد کی مثال بالکل سورج کی سی ہے۔ سورج روشنی اور حرارت کا منبع ہے اور اس کا فیض ہر خاص و عام کے لیے یکساں ہے۔ برج اسد کے افراد کا نشان بھی سورج ہی ہے، اس لیے اس برج سے تعلق رکھنے والے افراد گرم جوشی کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں اور اس سے دوسرے لوگوں کو بھی مستفید کرتے ہیں۔

اسد افراد کی تخلیق و تعمیر کی خواہش کا تعلق بنیادی طور پر سورج سے ہے جو کہ اس برج کا حاکم سیارہ بھی ہے۔ سورج نہ صرف زندگی پرور سیارہ ہے بلکہ حرارت اور روشنی کا منبع بھی ہے۔ اسد افراد قدرتی طور پر ''تخلیق'' کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ یہ تخلیقات جسمانی و ذہنی، ہر دو نوعیت کی ہو سکتی ہیں۔ ذہنی تخلیقات کے ضمن میں فنونِ لطیفہ، ادب و سائنس، مصوری، موسیقی وغیرہ شامل ہیں جب کہ جسمانی نوعیت کی تخلیقات میں بچوں کی بہترین پرورش و نگہداشت شامل ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھی جاسکتی ہے کہ ایک صاحب اولاد اسد فرد اپنے بچے کی پرورش کے معاملات میں حد درجہ ذمہ دارانہ اور محتاط رویہ اپناتا ہے جب کہ دوسرے افراد بچوں کی پرورش پر ایسی غیر معمولی توجہ نہیں دیتے۔ اسد افراد کی حتی الامکان یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو وہ سب کچھ مہیا کردیں جو وہ کرسکتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ صرف مادی اشیاء کی فراہمی تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ تعلیم و تربیت اور بچوں کی شخصیت کو نکھارنے کے حوالے سے بھی اسد والدین کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی بہتر سے بہتر ماحول میں پرورش

کریں۔ وہ اسد افراد جن میں آرٹسٹک خصوصیات پائی جاتی ہیں، وہ اپنی ان صلاحیتوں کو مزید اجاگر کرنے کے لیے سخت محنت کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تخلیقات کو دنیا کے روبرو پیش کردیتے ہیں۔ اگر کبھی برج اسد کے لوگوں کا زندگی کے کسی بھی میدان میں دوسرے برج کے لوگوں سے مقابلے کا کوئی پہلو نکل آئے تو اسد افراد ان مقابلوں میں بڑے پُراعتماد رہتے ہیں کیونکہ وہ یہ فرض کرلیتے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کریں گے وہی سب سے اچھا ہوگا۔ ان سے بہتر کوئی کر ہی نہیں سکتا، اسی لیے اسد افراد تجارتی معاملات میں دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ ان کی سوجھ بوجھ تعمیری اور مفید ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں حالات کا تجزیہ کرنے اور کسی بھی معاملے میں قیاس آرائی کرنے کی خصوصی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ جو بھی پیشن گوئی کرتے ہیں وہ عموماً درست ثابت ہوتی ہے۔

اسد افراد خواہ سو رہے ہوں یا جاگ رہے ہوں، ان کی لاشعوری جبلتیں ہر وقت سرگرم عمل رہتی ہیں اور ان کے خوابوں میں سے بیشتر خواب بھی ان کی نیم شعوری خواہشات کی عکاسی کرتے ہیں۔

عدم تحفظ پر مبنی خواب

انسان خواہ کتنا ہی مکمل، کتنا ہی پُراعتماد کیوں نہ ہو، کبھی نہ کبھی وہ عدم تحفظ کا شکار ہو ہی جاتا ہے اور جب وہ عدم تحفظ کا شکار ہوتا ہے تو اس کے خواب بھی اسی حالت کی عکاسی کرنے لگتے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو عدم تحفظ کے خواب دیکھنے سے بچ سکا ہو۔

عدم تحفظ کے خواب عموماً کسی چیز کے کھونے، ٹوٹنے یا اچانک چھن جانے پر مبنی ہوا کرتے ہیں۔ کھونے، ٹوٹنے اور چھیننے کا یہ عمل عموماً مادی اشیاء کے حوالے سے ہوتا ہے۔ مثلاً پرس، کپڑے، گھڑی، بریف کیس یا کوئی بھی ایسی چیز جو دسترس میں ہو۔ خواب میں گم ہونے والی یہ چیزیں اس وقت تک گم ہی رہتی ہیں، جب تک خواب دیکھنے والا فرد نیند سے بیدار نہیں ہوجاتا، اسی لیے نیند سے بیدار ہونے کے بعد فرد کے ذہن پر ایک طرح کی بے چینی، پریشانی اور افسردگی طاری رہتی ہے۔

عدم تحفظ پر مبنی خواب اسد افراد کے جاگتے لمحوں کے مسائل سے پیدا ہونے والے اس خوف کی نشاندہی کرتے ہیں جو ان کے نیم شعور میں پناہ گزیں ہوتا ہے۔ جاگتے لمحوں کا یہ خوف کسی بھی نوعیت کا ہوسکتا ہے۔ کاروباری معاملات میں آپ کی کوئی لغزش، کوئی غلط فیصلہ..... جس کی بظاہر تو پردہ پوشی ہوگئی ہے مگر آپ کے ذہن میں یہ خوف طاری ہو کہ کسی بھی لمحے راز فاش ہوسکتا ہے۔ یہ ڈر اور خوف ہی ہے جو آپ کو افسردگی کے خواب دکھاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں عدم تحفظ پر مبنی خوابوں کے نظر آنے کی وجہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ اسد افراد کی حقیقی زندگی کے وہ لمحات جب کسی قسم کے خوف و ہراس کے سائے ان کے ذہن پر لہراتے رہتے ہیں، تب وہ عدم تحفظ پر مبنی خواب دیکھنے پر مائل ہوتے ہیں۔ عدم تحفظ کے خوابوں میں اسد افراد روپے پیسے اور مادی اشیاء کی گمشدگی علامتی طور پر اس لیے دیکھا کرتے ہیں کہ بیشتر افراد مادی اشیاء پر اپنی دسترس ہی کو تحفظ کا ضامن ٹھہراتے ہیں۔ لہٰذا جب ان اشیاء کو گم ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو عدم تحفظ کا احساس خود بخود ان پر غالب آجاتا ہے اور وہ افسردہ، غمگین و پژمردہ ہوکر رہ جاتے ہیں۔

☆☆

کچن کارنر

شہزاد گیلانی

قارئین! اس ماہ ہم کچن کارنر میں آپ کے لیے رمضان اور عید کے حوالے سے ڈشز لائے ہیں اس امید کے ساتھ کہ یہ ڈشز بھی آپ کے لیے کچن کارنر کا اعزاز برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

قیمہ بھرا پراٹھا

اجزاء

قیمہ	:	آدھا کلو
ثابت گرم مسالہ	:	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	:	دس عدد
لہسن	:	آٹھ یا دس عدد
ادرک	:	تھوڑی سی ثابت
نمک	:	حسب ذائقہ

ترکیب: قیمہ، ثابت گرم مسالہ، نمک، ثابت لال مرچ، لہسن اور ادرک ڈال کر اُبال لیں اور پیس کر ایک طرف رکھ دیں۔

پراٹھے کے لیے:

سفید آٹا	:	آدھا کلو
نمک	:	حسب ذائقہ
تیل یا گھی	:	حسب ضرورت
نیم گرم پانی	:	حسب ضرورت

ترکیب: آٹے میں نمک اور تیل ڈال کر مکس کریں اور اسے گوندھ کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ مناسب سائز کے پیڑے بنالیں۔ اس کے بعد پراٹھا بیلیں اور توے پر گھی لگا کر پراٹھا فرائی کرلیں اور اچھی طرح سینک لیں۔ دہی کے ساتھ گرم گرم سرو کریں اور سحری کا لطف دوبالا کریں۔ آپ چاہیں تو دو روٹیاں بیل کر درمیان میں فلنگ رکھ کر بھی یہ پراٹھا بنا سکتی ہیں۔

چکن پکوڑے

اجزاء

چکن (بغیر ہڈی کا)	:	آدھا کلو
بریڈ کرمبز	:	حسب ضرورت
پیاز	:	ایک عدد (لچھوں میں کاٹ لیں)
انڈے	:	دو عدد
کٹی ہوئی لال مرچ	:	ایک چائے کا چمچ
کالی مرچ پاؤڈر	:	ڈیڑھ چائے کا چمچ
دہی	:	آدھا کپ
گھی یا تیل	:	حسب ضرورت
نمک	:	حسب ذائقہ

ترکیب: گوشت میں نمک، کالی مرچ اور کٹی لال مرچ کو دہی میں ڈال کر مکس کریں۔ آدھا گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ انڈے پھینٹ لیں۔ کڑاہی میں تیل یا گھی گرم کریں۔ گوشت کے ٹکڑوں میں سے ایک ایک کو پہلے انڈے میں پھر بریڈ کرمبز میں لپیٹ کر تل لیں۔ گولڈن ہوجائیں تو ایک ڈش میں نکال لیں۔ ٹماٹو کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

کھجور رولز

اجزاء

کھجوریں	:	دو سو گرام (گٹھلیاں نکال کر باریک کاٹ لیں۔)

سادہ کیک : ڈیڑھ سو گرام (خوب مسلا ہوا)
کشمش : پچاس گرام
تل : سو گرام
دار چینی : آدھا چائے کا چمچ (پسی ہوئی)
کوکو پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ
گھی : حسب ضرورت
بٹر پیپر : ایک عدد

ترکیب: کھجوریں، سادہ کیک، کشمش، سادہ بسکٹ، دار چینی، کوکو پاؤڈر، گھی کو ملا کر آٹے جیسا گوندھ لیں۔ اس کو پھر ایک رول جیسا بنا لیں۔ ایک ٹرے میں تل پھیلا کر رول کو ان پر گھمائیں تاکہ تل اس کے ہر طرف لگ جائیں۔ اس کے بعد کھجور رول کو بٹر پیپر میں لپیٹ کر فریز رمیں رکھ دیں۔ جب یہ رول ٹھنڈا ہو کر سخت ہو جائے تو بٹر پیپر سے نکال کر اس کے آدھا آدھا انچ کے ٹکڑے کر لیں اور افطار کے وقت پیش کریں۔

مینگو میٹ اسٹکس

اجزاء

انڈر کٹ بیف یا چکن : تین سو یا چار سو گرام (پتلے لمبے پسندے)
آم کی چٹنی : 1/3 کپ (کیری کو نمک ملا کر پیس لیں)
سویا ساس : ایک چائے کا چمچ
لہسن : دو جوے (چوپڈ)
پیاز : ایک بڑی (چوکور بڑے ٹکڑے)
چلی ساس : ایک کھانے کا چمچ
تازہ لال یا ہری مرچ : دو عدد (باریک کاٹ لیں)
لال مرچ پاؤڈر : آدھا چھوٹا چمچ
ادرک : آدھا انچ کا ٹکڑا (چوپڈ)
زردے کا رنگ : چٹکی بھر
گاجر : گارنش کے لیے
نمک : حسب ذائقہ

ترکیب: گوشت اور پیاز کے پارچے لکڑی کی اسٹک پر پروئیں۔ ایک گوشت کا ٹکڑا ایک پیاز کا ٹکڑا لگائیں۔ آم کی چٹنی میں لہسن، ادرک، سویا ساس، زردے کا رنگ، لال مرچ اور تھوڑا نمک ملا لیں اور باربی کیو ڈش میں اسکیس رکھیں یا پھر نان اسٹک فرائی پین میں تھوڑا تیل ڈال کر رکھیں۔ سائیڈ پلٹتے رہیں۔ برش سے آم کی چٹنی لگاتے جائیں۔ پک جائیں تو ایک ڈش میں نکال کر کوئلے کا دھواں دے دیں۔ گاجر سے گارنش کریں اور اُبلے چاول کے ساتھ پیش کریں۔

انجیر کا میٹھا

اجزاء

خشک انجیر : ایک پاؤ
کھجور : ایک پاؤ
خشک دودھ : آدھا کپ
بادام، پستے : حسب ضرورت (باریک کاٹ لیں)
چینی : ایک کھانے کا چمچ
زیتون کا تیل : حسب ضرورت

ترکیب: انجیر کو دھو کر صاف پانی میں تین سے چار گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ اس کے بعد اسی پانی میں دس منٹ تک اُبال کر ٹھنڈا کر لیں۔ اب تھوڑے سے پانی سے انجیر کی پیوری بنا لیں اور ٹھنڈا کر لیں۔ اس کے بعد کھجور کے بیج نکال کر باریک کاٹ لیں۔ اب پیوری میں خشک دودھ اور چوپڈ کھجور ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ چینی بھی ملا لیں۔ اب تھوڑا سا زیتون کا تیل گرم کریں۔ پھر اس میں انجیر والا آمیزہ ڈال کر بھونیں۔ جب تیل الگ ہو جائے تو اس میں پستے بادام شامل کر دیں۔ اب ایک تھال میں نکال کر چاندی کے ورق سے سجا کر پیش کریں۔

کھیر کھجور

اجزاء

کھجور : ایک کلو

کھویا : آدھا کلو
بادام، پستہ : پون کپ (ہر ایک)
دودھ : ایک لیٹر
کیوڑہ : چند قطرے

ترکیب: کھجوروں کی گٹھلیاں نکال کر انہیں دھو کر خشک کر لیں۔ ایک پین میں دودھ اُبال لیں پھر اس میں کھجوریں ڈال کر پکنے رکھ دیں۔ آنچ دھیمی رکھیں۔ جب کھجوریں گل جائیں تو اس میں کھویا ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ کھیر گاڑھی ہو جائے تو چمچ چلا کر اُسے آنچ پر سے ہٹا لیں۔ سرونگ ڈش میں ڈال کر پستہ، بادام، کیوڑے سے گارنش کریں۔ (میوہ جات باریک کتر کر ڈالیں تو زیادہ لذت دیتے ہیں۔)

اودھ کی بریانی

اجزاء

مٹن : ایک کلو
چاول : آدھا کلو
پیاز : دو عدد (سلائس کر لیں)
لہسن ادرک پیسٹ : دو کھانے کے چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ
نمک : ایک کھانے کا چمچ
دہی : ایک کپ
کریم : دو کھانے کے چمچ
گرم مسالہ : ایک کھانے کا چمچ
جائفل، جاوتری، الائچی پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچ
بادام اور کاجو کا پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ
ہلدی پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ

ترکیب: ایک پین میں تیل گرم کر کے پیاز فرائی کر کے نکال لیں۔ پھر اس میں لہسن، ادرک، سرخ مرچ، ہلدی ڈال کر فرائی کریں، پھر اس میں گوشت شامل کر کے بھونیں۔ دو منٹ بعد بادام، کاجو کا پیسٹ اور دہی شامل کر کے خوب بھونیں پھر پانی شامل کر کے پکنے رکھ دیں اور گوشت گلنے دیں۔ گوشت گل جائے تو بوٹیاں نکال لیں اور بقیہ مسالے میں کریم شامل کر کے پکائیں۔ اس میں اُبلے ہوئے چاول، لیمن جوس کے ساتھ شامل کریں۔ گرم مسالہ ڈالیں اور مکس کریں۔ ایک علیحدہ بڑی دیگچی میں تیل لگا کر پہلے چاول کی تہہ لگائیں۔ پھر گوشت کی پھر چاول کی اور پھر گوشت کی تہہ لگائیں۔ تمام چاول اور گوشت کو تہہ در تہہ لگا کر اوپر سے کیوڑہ چھڑک کر دم پر رکھیں اور گرم گرم سرو کریں۔

خوشبودار قورمہ

اجزاء

گوشت : آدھا کلو
زعفران : ایک چھوٹا چمچ
گرم مسالہ : ایک بڑا چمچ
لہسن : چھ جوے
پیاز : آدھا کلو
ہلدی : پون چمچ
بادام کی گریاں : سات عدد
دہی : دو کلو
ادرک : دس گرام
نمک : حسب ضرورت
سرخ مرچ : حسب ضرورت

ترکیب: لہسن، پیاز اور ادرک چھیل کر باریک کاٹ لیں۔ گوشت کی حسب منشا بوٹیاں بنا کر دھو لیں اور ایک برتن میں ڈال کر ساتھ ہی لہسن، ادرک، پیاز، ہلدی، خشک دھنیا، نمک، سرخ مرچ اور دو کپ پانی ڈال دیں۔ اس برتن کو چولہے پر رکھ دیں اور ہلکی آنچ پر دس منٹ تک پکانے کے بعد زعفران تھوڑے سے پانی میں گھول کر اور بادام کی گریاں چھلکا اُتار کر ڈال دیں۔ دس منٹ تک مزید چولہے پر رکھیں پھر پسا ہوا گرم مسالہ چھڑکیں اور دم لگا کر چولہے سے

نیچے اتار لیں۔ خوشبودار قورمہ تیار ہے۔

ایرانی کوفتے

اجزاء

قیمہ بغیر چربی کا	: آدھا کلو
گھی	: ایک پاؤ
کشمش	: آدھا چھٹانک
بادام	: آدھا چھٹانک
کیوڑہ	: چار بڑے چمچ
زعفران	: دو ماشے
سبز الائچی	: پانچ عدد
پستہ	: آدھا چھٹانک
پیاز	: آدھا پاؤ
دال چنا	: ایک چھٹانک
گرم مسالہ	: ایک تولہ
نمک، مرچ	: حسبِ ذائقہ

ترکیب: قیمہ اور سب مسالے، چنے کی دال کے ساتھ پتیلی میں مع پانی ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں تاکہ دال گل جائے۔ پانی خشک ہونے پر سب چیزوں کو سل پر باریک پیس لیں۔ بادام پستہ پانی میں بھگو کر باریک کاٹ لیں۔ کشمش کو گھی میں تل لیں۔ پیاز کے لچھے کاٹ کر گھی میں تل لیں۔ یہ سب چیزیں ملا کر کوفتوں کے اندر بھر لیں۔ ان کو ڈبل روٹی کا چورا اور انڈا لگا کر تل لیں۔ باقی سامان کا شوربہ تیار کر لیں اور اس میں تلے ہوئے کوفتے رکھ کر پیش کریں۔

مرغ تنجن

اجزاء

مرغ کا گوشت	: ڈیڑھ کلو
چاول	: ایک کلو
گھی	: ڈیڑھ پاؤ
لیموں	: تین عدد بڑے
چینی	: ڈھائی پاؤ
لہسن	: ایک گٹھی
سوکھا دھنیا	: ڈیڑھ چائے کا چمچ
زعفران	: آدھا چائے کا چمچ
سبز الائچی	: دس عدد
کیوڑہ	: پانچ کھانے کے چمچے
بادام	: آدھا پاؤ
کشمش	: آدھا پاؤ
پیاز	: دو عدد
سونف، گرم مسالہ	: ڈیڑھ کھانے کا چمچ
نمک	: حسبِ ذائقہ

ترکیب: مرغ کے ٹکڑے کر لیں اور ان میں نمک ڈال کر پانی ڈال دیجیے۔ ایک ململ کا ٹکڑا لے کر اس میں پیاز کے چار ٹکڑے کر لیں۔ لہسن چھیل کر اور سب گرم مسالا، دھنیا اور سونف سب ثابت ڈال کر باندھ دیجیے۔ اب یہ پوٹلی بھی اسی پانی میں ڈال دیں اور مرغ کی یخنی تیار کریں جب دو یا ڈھائی کپ پانی رہ جائے تو اتار لیں۔ ایک دیگچی میں گھی لیں اس میں سبز الائچیاں چھیل کر ڈال دیجیے جب کڑکڑا جائے تو اس میں مرغ کے ٹکڑے ڈال کر بھونیں۔ چینی کا شیرہ ایک کپ پانی میں تیار کریں۔ جب پکنے لگے تو اس پر چاول (دو کنی اُبلے ہوئے) ڈال دیں۔ ساتھ ہی لیموں کا رس، کشمش اور بادام ڈال دیجیے۔ جب چاول اتنے گل جائیں کہ دم دیا جائے یعنی پانی خشک ہو جائے تب اس پر زعفران اور کیوڑہ چھڑک دیجیے۔ اگر چاول کچے محسوس ہوں تو تھوڑا سا دودھ ڈال دیجیے اور دم لگا دیں تقریباً آدھا گھنٹے بعد مرغ تنجن تیار ہوگا۔ ڈش میں نکال لیں اور چاندی کے ورق لگا کر پیش کریں۔

......☆☆......

بیوٹی گائیڈ

شائستہ انور

عید کی خوشیاں آپ کو جہاں روحانی مسرت سے دوچار کرتی ہیں وہیں خواتین چاہتی ہیں کہ عید کے دن سب سے خوب صورت دکھائی دیں۔ خوبصورتی میں فاؤنڈیشن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جلد کے حساب سے فاؤنڈیشن کا انتخاب یقیناً آپ کے حسن میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ اس ماہ کے بیوٹی گائیڈ میں ہم آپ کو صحیح فاؤنڈیشن کے انتخاب میں مدد دیں گے۔ بیوٹی گائیڈ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

فاؤنڈیشن منتخب کرتے وقت صرف اس بات کو اہمیت دیں کہ میک اپ میں اس کی آمیزش سے آپ بالکل وہی رنگت حاصل کر سکیں جس کی آپ تمنائی ہیں کیونکہ اس کا غلط انتخاب آپ کو اصل عمر سے دس سال بڑا دکھا سکتا ہے۔ میک اَپ میں بیس کس طرح اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس کا اندازہ ماضی کے مشہور زمانہ آئی میک اَپ خصوصاً آئی لائنز لگانے کے منفرد انداز سے آپ بخوبی کر سکتی ہیں۔ ذرا غور کیجیے کے یہی آئی لائنز 1940ء کی دہائی کی اداکاراؤں کے میٹ فاؤنڈیشن پر الگ تاثر جگاتا تھا اور دورِ حاضر کی نرم و ملائم جلد کی مالک انجلینا جولی کی آنکھوں کو بالکل الگ انداز بخشتا ہے اور اس کا موازنہ اگر جینیفر لوپز کی جلد سے کر لیں تو باآسانی یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ رنگت اور میک اَپ کا بہترین امتزاج شخصیت کا انداز بدل دیتا ہے۔ بے شک اسکرین بیوٹی بڑھانے میں ٹیکنالوجی کا سہارا بھی لیا جاتا ہے لیکن حقیقتاً میک اَپ میں استعمال ہونے والی جدید تکنیک انہیں عام لوگوں سے ممتاز بنانے کا باعث ہے۔

جلد کا تعین کرنے کے بعد مرحلہ آتا ہے فاؤنڈیشن کا۔ من پسند نتائج کے لیے ذیل میں بتائے گئے فاؤنڈیشن کے مختلف ٹیکسچر کو آزمائیں۔ اس کی آمیزش سے نہ صرف اپنا میک اپ بہترین بنا سکیں گی بلکہ چہرے پر وہ تاثر بھی حاصل کر سکیں گی جس کی آپ خواہشمند ہیں۔

فاؤنڈیشن کے ٹیکسچر

☆ اوسطاً تاثر کے لیے Sheer یا شبنمی ہلکا ٹیکسچر استعمال کریں یعنی یہ ہلکا رنگ ہوتا ہے، اس سے ہلکی اور کم نمایاں کوریج حاصل کی جا سکتی ہے۔

☆ نرم و ملائم تاثر کے لیے Soft Dewy یا کریمی ٹیکسچر عمدہ رہتا ہے۔ اس کی ہلکی اور درمیانی کوریج سے چہرے پر نرم و ملائم احساس اجاگر کیا جا سکتا ہے۔

☆ چمکدار تاثر کے لیے Velvety یا Luminous ٹیکسچر استعمال کریں۔ زائد چمک والی کریمی فاؤنڈیشن سے کریمی اور اضافی چمک کا تاثر مل جاتا ہے۔

☆ Velvety فنش ٹیکسچر اسی جلد پر لگائیں جس پر کچھ نہ لگا ہو۔ اس کے ساتھ ہلکے نیم شفاف فاؤنڈیشن پاؤڈر کے امتزاج سے جلد پر مخملی تاثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔

☆ بھرپور تاثر یا چہرے کی مکمل کوریج یعنی ہیوی

کوریج اور چہرے کے داغ دھبے چھپانے کے لیے بہترین ہے۔ نیز یہ میٹ فنش کا تاثر بھی دے سکتی ہے۔ اس بات کا دھیان رکھیں کہ چہرے پر فاؤنڈیشن کی آمیزش کسی حد تک آپ کی شکل بدل دیتی ہے۔ اس لیے میک اپ میں ہمیشہ اسی تاثر کو اپنائیں جو آپ کے چہرے پر جچتا ہو۔

پاؤڈر

فاؤنڈیشن کے ضمن میں یاد رکھیں کہ میک اپ کو دیر پا رکھنے کے لیے کبھی بیس پر پاؤڈر نہ لگائیں۔ اگر جلد کو مکمل تاثر کے ساتھ کم چمکدار دکھانا چاہتی ہیں تو پھر اسے لگالیں ورنہ بیس پر اس کے استعمال سے گریز کریں۔ مثال کے طور پر بغیر پاؤڈر والی فاؤنڈیشن تین گھنٹے تک اپنی تہہ چہرے پر جمائے رکھ سکتی ہے اور اس کے بعد یہ ہلکا سا خراب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یقین جانیے کہ آپ کے اس "دیرپا" رہنے والے میک اپ کا کسی پر اچھا اثر نہیں پڑے گا بلکہ سب یہی سوچیں گے کہ میک اپ کے باوجود آپ کی جلد پھولی ہوئی اور بے تاثر کیوں نظر آرہی ہے؟ اس لیے پاؤڈر تھوڑی دیر تک تو فاؤنڈیشن کی تہہ چہرے پر جمائے رکھ سکتا ہے لیکن زائد گھنٹوں تک نہیں (یعنی اس سے صرف ایک سے دو گھنٹے مزید کام لیا جاسکتا ہے)۔ دوسری اہم بات یہ کہ میک اپ کی تازگی برقرار رکھنے کے لیے پاؤڈر کریم کنسیلر اور لیکوئڈ فاؤنڈیشن کا دوبارہ استعمال نہیں کیا جاسکتا بلکہ صرف اور صرف زائد مقدار میں پاؤڈر لگایا جاسکتا ہے۔ ہمارے خیال سے جو فاؤنڈیشن تین دن یا زائد گھنٹوں تک چہرے پر جمے رہنے کا دعویٰ کرتی ہیں تو یہ جلد پر ایسا ناگوار جھریوں دار اور پھولا ہوا تاثر بیدار کر دیتی ہیں جو آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔

اینٹی شائن پرائمر

یہ جلد پر موجود زائد چکنائی کو فی الفور ختم کر کے چمک کا احساس کم کر دیتا ہے۔ اسے صرف روغنی یا چکنی جلد بشمول ٹی زون کے حصے پر فاؤنڈیشن برش یا اسفنج سے لگایا جاسکتا ہے۔

منرل فاؤنڈیشن

یہ حساس جلد کے لیے بہترین ہیں کیونکہ ان میں سے اکثر میں سن اسکرین پایا جاتا ہے لیکن اکثر خواتین اس کے بارے میں کنفیوژن کا شکار رہتی ہیں۔ یہ بھی عام فاؤنڈیشن جیسی ہوتی ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ اسے خاص برش کی مدد سے چہرے پر لگایا جاتا ہے۔ عموماً جو خواتین منرل فاؤنڈیشن کو پسند کرتی ہیں وہ اسے لگانے سے قبل آئل موئسچرائزر کا استعمال زیادہ کر لیتی ہیں۔ چنانچہ کچھ لمحوں بعد منرل فاؤنڈیشن ان کی جلد پر گوند کی طرح چپک جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منرل فاؤنڈیشن موئسچرائز ہوئی چکنی جلد کی دشمن ہوتی ہے اس لیے اس پر چپک جاتی ہے۔

لیمو مینائزر

یہ میک اپ کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ یہ تین شیڈز میں دستیاب ہیں جو زردی مائل، گوری، گندمی اور سیاہ جلد کے لیے موزوں ہیں۔ یہ چہرے پر شاندار قدرتی چمک بکھیر دیتا ہے۔ اسے لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ فاؤنڈیشن لگانے سے پہلے اس کے کچھ قطرے اپنی فاؤنڈیشن میں شامل کر لیں اور پھر اس کا جادو دیکھیں۔

ہائی لائٹر

ہائی لائٹر کا بنیادی مقصد چہرے کے مخصوص حصوں کی خوب صورتی میں اضافہ کرنا ہوتا ہے اور میک اپ میں اس کا استعمال آپ کے قدرتی حسن کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ اگر چہرے پر داغ دھبے زیادہ ہوں تو بجائے پورے چہرے کو ہائی لائٹ کرنے کے صرف مخصوص نقوش کو ہائی لائٹ کریں۔

.....☆☆.....